پہلا پتھر

بلونت سنگھ

[redacted]

30.00

اسی مصنّف کے قلم سے

شہر ادلیس

تار و پود

پہلا پتھر

بلونت سنگھ

مکتبۂ جدید

لاہور

کاغذ بذریعہ نیوز پیپر کنٹرولر کراچی
پرمٹ نمبر ۴/۱۳ مورخہ ۲۶ اگست ۵۳ء

پہلی بار : دسمبر ۵۳ء

ناشر:۔ رشید احمد چودھری مکتبہ جدید لاہور
پرنٹر:۔ سویرا آرٹ پریس لاہور،

ترتیب

بازگشت

۴؍جون ۱۹۲۳ء کی شام کو طوفان میل تپتی ہوئی پٹریوں پر اندھادھند گجرات کی جانب چلی جارہی تھی۔

منیر احمد انٹرکلاس کے ڈبے میں خاموش اور بے حس بیٹھا تھا۔ گرد، کوئلے کے ذروں اور لو سے بچنے کے لئے اس نے سامنے کی کھڑکی کا موٹا شیشہ اوپر کو چڑھادیا تھا۔ شیشے میں سے پیلا آسمان، پھیلے ہوئے کھیت اور درختوں کے جھنڈ گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ڈبے میں بہت کم لوگ تھے۔ کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ بیشتر دھوتی کے پلو یا کسی اخبار سے پنکھا جھلتے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ ان کی کن پٹیوں اور ٹھوڑیوں پر پسینے کی بوندیں جھلک رہی تھیں۔

منیر احمد ایک منحنی سا پستہ قامت شخص تھا۔ اس کے چہرے کی بناوٹ

چھوہارے کی مانند تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمک سے خالی۔ ہاتھ چوہے کے پنجوں کی طرح بالکل ہلکے پھلکے، انگلیاں پتلی پتلی، ہاتھوں کے پیچھے کی رگیں ابھری ہوئیں۔ وہ صورت سے ایک سادہ لوح اور کمزور طبیعت شخص نظر آتا تھا۔ چہرے سے کسی قسم کے شدید جذبات کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ زندگی میں جو کچھ اسے پیش آچکا تھا۔ وہ اس سے اب ایک قسم کا سمجھوتہ کر چکا تھا۔

۱۹۱۲ء میں ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد اس نے لاہور میں پریکٹس شروع کر دی تھی۔ لیکن اس میں اسے ذرہ برابر بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس پیشہ میں انسان کی شخصیت اور اس کی چرب زبانی ہی سے لوگ زیادہ تر متاثر ہوتے ہیں لیکن منیر احمد نہ صرف اپنے فن میں کچھ کچا تھا۔ بلکہ اس کی زبان پر بھی تالہ پڑا ہوا تھا۔ مریض کو دیکھ کر وہ گھبرا جاتا تھا اور مریض اس کی گھبراہٹ دیکھ کر پریشان ہو جاتا تھا۔ . . . . وہ مریض کی کلائی ہاتھ میں لے کر اس قدر احمقانہ انداز سے آنکھیں جھپکاتا کہ مریض کو پورا یقین ہو جاتا کہ ڈاکٹر کو مرض کا پتہ نہیں چلا۔ اس کی شخصیت تو کچھ بھی نہیں تھی۔ یہ بھی کس قدر عجیب بات ہے کہ لوگ موٹے تازے ڈاکٹر کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ وہ واقعی قابل ہے اور اگر کہیں منیر احمد جیسے شخص کو دیکھ پائیں تو بس یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر تو خود ہی زندہ درگور ہے۔ ہمارا علاج کیا کرے گا۔

گاؤں میں اس کے بوڑھے والدین رہتے تھے۔ جنہوں نے عمر بھر کی کمائی اس کی تعلیم پر صرف کر دی تھی اور وہ اس پر خوش تھے۔ اگرچہ نقد روپیہ بیٹے کی تعلیم پر خرچ کر چکے تھے۔ لیکن ان کی کچھ آبائی زمین بھی تھی۔ ایک رہٹ تھا۔ کچی اینٹوں کا

ایک مکان تھا۔ پھر ان کا لڑکا ڈاکٹر بن کر روپیہ بھی کما رہا تھا۔ ہر چند منیر احمد کی پریکٹس سو روپیہ ماہوار سے کبھی تجاوز نہیں کرتی تھی اور لاہور جیسے شہر میں اتنی کم پریکٹس کچھ بڑی حوصلہ افزا نہیں تھی۔ لیکن اس کے والدین کو کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ ہر مہینے ایک دفعہ کیلئے اپنے گاؤں چلا جاتا اور ساٹھ ستر روپیہ نقد اپنے باپ کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ اس کی ماں اس دن پھولی نہ سماتی۔ ہنس ہنس کر پڑوسنوں سے باتیں کرتی۔ اس کا باپ اپنا روپیہ لوہے کی ایک الماری میں رکھا کرتا تھا۔ منیر چاہتا تھا کہ کل رقم بنک میں جمع رہے۔ لیکن چونکہ اس کا باپ پرانے خیال کا آدمی تھا۔ اس لئے وہ اپنے باپ کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ گاؤں والے اس بات سے بالکل بے خبر تھے۔ کہ منیر احمد ساٹھ روپیہ ماہوار گھر والوں کو لا کر دیتا ہے۔ کیونکہ جب کبھی منیر احمد گاؤں میں آتا تو کوٹ پتلون پہنے اور ٹائی لگائے ہوتا۔ ان دنوں ہیٹ اور انگریزی کپڑے بھی کبھار ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ اس لئے کھیتوں میں کام کرنے والے ناواقف لوگ اسے کوئی بڑا افسر سمجھ کر سلام بھی کر دیا کرتے تھے۔

منیر احمد کے اخراجات بہت کم تھے۔ آٹا، گھی، شکر اور ستو وغیرہ تو وہ گھر ہی سے لے جاتا تھا۔ دیگر اخراجات کی میزان چالیس روپے ماہوار سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ البتہ کوٹ اور پتلون وہ ضرور پہنتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ انگریزی کپڑے پہننا بھی ترک کر دے۔ تو لوگ اسے بالکل ٹٹ پونجیا ہی سمجھنے لگیں گے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہو گئی۔ ۱۹۱۵ء میں وہ دوستوں کے کہنے سننے سے فوج میں ملازم ہو گیا۔ ڈاکٹری پاس نوجوانوں کی فوج میں اشد ضرورت تھی اور پھر منیر احمد کا تین سالہ عملی تجربہ بھی اس کی قابلیت کا ایک بیّن ثبوت تھا۔ فوج میں نوکر

ہونے کے بعد جب وہ وردی پہن کر گاؤں میں پہنچا تو اس کا باپ بھونچکا سا رہ گیا
اس نے سمجھا کہ بیٹا کوتوال بن گیا ہے۔ منیر احمد نے ہر ممکن طریقہ سے باپ کو اپنا
رینک RANK سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن باپ نے اس کی باتوں کی طرف
کچھ دھیان ہی نہیں کیا۔ اسے یقین تھا کہ چونکہ اس کے بیٹے کے اختیارات اب بہت
وسیع ہو گئے ہیں۔ اس لئے گاؤں کے لوگ ان سے دب کر رہیں گے۔

وہ فروری میں بھرتی ہوا اور مئی میں اسے سمندر پار جانے کا حکم ملا۔ اس کی
ماں تو رو رو کر ہلکان ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس کے چلے جانے کے بعد جلدی مر گئی
اس کی شادی کو بھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۵ء کے اخیر میں اسے باپ کی ایک
چٹھی فرانس میں ملی کہ اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی اور اس کی بیوی
جانبر نہ ہو سکی . . . .

صوبیدار میجر منیر احمد چپ چاپ بیٹھا، کھڑکی کے شیشے میں سے چکر کھاتے ہوئے
کھیتوں اور بجلی کے کھمبوں پر بیٹھے ہوئے گدھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شام ہو چکی
تھی۔ وہ وزیر آباد سے آگے نکل آئے تھے۔ معاً اس کے ابرو ہلنے لگے۔ اب
گاڑی ایسے مقامات کے قریب سے ہو کر گزر رہی تھی۔ جن سے وہ بخوبی واقف
تھا۔ وہ ان بل کھاتی ہوئی نہروں پہ نہانے کے لئے جایا کرتا تھا۔ کسی پیر صاحب
کا ٹوٹا پھوٹا مقبرہ بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے قریب ایک مسجد بھی تھی۔
گاڑی منڈی ڈھنگراں کے اسٹیشن پہ رکے بغیر ہی آگے بڑھ گئی۔ اس
چھوٹے سے اسٹیشن سے ان کا گاؤں ایک میل کے فاصلہ پہ تھا۔ پہلے جب وہ

لاہور سے آیا کرتا تھا تو پسنجر ٹرین اُسے اسی اسٹیشن پر اتار دیتی تھی۔ اُس وقت بھی ببول کے درختوں میں سے مکانات کا مدھم سا خاکہ نظر آرہا تھا۔ اسٹیشن سے نصف میل کے فاصلے پر ان کا اپنا رہٹ تھا۔ اپنے رہٹ پر نگاہ پڑتے ہی وہ بے چین سا ہو گیا وہ دور ہی سے ان مقامات کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے رہٹ سے اس قدر اچھی طرح واقف تھا کہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسے معلوم ہو گیا کہ کون سا درخت کٹ چکا ہے۔ کونسی دیوار گرا دی گئی ہے اور کونسی نئی دیوار تعمیر کر دی گئی ہے۔ اس طرف گنے پیلنے کا بیلن تھا۔ زمین میں گڑے ہوئے بیلن کے قریب ایک طرف کو بڑھتی ہوئی چھوٹی سی دیوار تھی۔ اسی دیوار کے قریب اس نے پہلی مرتبہ اپنی ہونے والی بیوی کا مُنہ چوما تھا۔

جب وہ لاہور میں پریکٹس کرتا تھا تو ایک مرتبہ گاؤں میں ایک عزیزہ کی شادی کے موقعہ پر اسے زیادہ دنوں کے لیے دکان بند کر کے گاؤں جانا پڑا اور جب وہ گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ان کے ہاں ایک خوبصورت جوان لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ اسے پہچان نہ سکا۔

اس کی ماں کہنے لگی "ارے بیٹا! تو ڈاکٹر ہو گیا ہے اور پھر اسے نہیں پہچانتا"

منیر احمد کو بعض اوقات ماں کی باتیں بڑی بے تکی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ اس کی ماں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ وہ باتیں بناتی ہی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ لڑکی ہنسنے لگی۔ منیر پہلے ہی کھسیانہ ہو رہا تھا اور پھر اس کی ماں . . . . اس نے لڑکی کی طرف دیکھا تو اس کی ہنسی بند ہو گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہونٹ خوب اچھی طرح بھینچ لئے

شاید لڑکی پر اس کی ڈانٹ کا رعب جم گیا تھا۔

وہ اس کے حقیقی پھوپھا کی لڑکی بگیماں تھی۔

بگیماں تند آور اور مضبوط ہاتھ پاؤں کی لڑکی تھی۔ اس کا جسم اچھی صحت کی وجہ سے ذرا بھاری ضرور تھا۔ لیکن بیڈول اور ڈھیلا ڈھالا نہ تھا۔ اپنے گھر کا سارا کام کاج وہی کرتی تھی۔ آٹا پیسنا، چرخہ کاتنا، روئی دھنکنا، گائے بھینس کے لئے سانی کرنا، کھیتوں پر جائیوں کے لئے کھانا لے جانا، رہٹ سے پانی کی تین تین گاگریں ایک ساتھ بھر کر لانا اور اس پر بھی غذا اور کھلی ہوا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ شہر کی زرد رو نازک بدن، پچکی سینہ سپاٹ لڑکیوں کے برعکس رعب بھرے ہوئے جسم کی گلرخ اور تنومند لڑکی تھی۔ ... کم از کم منیر احمد کو وہ بہت پسند تھی۔ لیکن ایسی لڑکی سے محبت کا سوال [illegible] پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔

پہلے دن بگیماں ہی نے اسے کھانا کھلایا۔ وہ چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا کھاتا رہا۔ پھر بگیماں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اور وہ خفت مٹانے کے لئے ادھر ادھر دیکھتا تھا۔

جب وہ اکیلا ہوتا اور پاس والے گھر سے لڑکیوں کے ڈھولک بجانے اور گیت گانے کی آوازیں سنائی دیتیں تو بگیماں نہ معلوم کہاں سے آن ٹپکتی۔ گھر میں اس طرح گھومتی جیسے کوئی چیز ڈھونڈ رہی ہو۔ کبھی کھونٹی سے نئی رنگی ہوئی چادر یا اتار کر سر پر ڈال لیتی۔ کبھی لکڑی کی چوکی پر بیٹھ کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پاؤں دھونے لگتی۔ کبھی کبھی چپہ بھر روٹی نمکین چھاچھ کے ساتھ کھا لیتی۔ غرض کسی نہ کسی بہانے سے گھر میں ضرور آتی اور کسی نہ کسی حیلے سے اس سے بات بھی ضرور کرتی۔

ایک روز رات کے وقت جب آنگن میں دیا جل رہا تھا۔ سب لوگ کھانا وانا کھا کر بیاہ والے گھر جانے کو تیار تھے۔ منیر احمد جھک کر جوتا پہن رہا تھا کہ اس کی پیٹھ پر ایک کنکر آن لگا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو بگیاں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

اسی طرح سے بے تکلفی ہو گئی۔ ایک دوسرے پہ کنکر پھینکے جانے لگے۔

ایک دن شام کے وقت وہ اپنے رہٹ پر گیا۔ اس کا باپ بیاہ والوں کے کام میں پھنسا ہوا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ رہٹ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ تہمد باندھے سیاہ سوٹ پہنے رہٹ کی گدی پر بیٹھا تھا اور دل ہی دل میں اپنے اس عشق پر غور کر رہا تھا۔ آخر بگیاں کی ان شرارتوں اور ہنسی مذاق کی تہہ میں کیا راز تھا۔ شاید یہ سب معصوم شرارتیں ہوں۔ بیچاری سیدھے سادے مزاج کی ہنس مکھ لڑکی ہے۔ یونہی دل بہلاوے کے لئے چہل کرنے لگتی ہو گی۔ وہ کس قدر مضبوط قد آور اور حسین لڑکی تھی۔ اس کے مقابلے میں وہ پست قامت دبلا پتلا اور بدصورت نہ سہی تو خوبصورت تو ہرگز نہیں ہے۔ اس نے سنا تھا کہ گاؤں کی لڑکیاں سیدھے سادے مزاج کی ہوتی ہیں۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ پہ ریجھ جاتی ہیں۔ ممکن ہے بگیاں کو اس سے محبت ہو گئی ہو ...... اس کا دل دھڑکنے لگا ...... بگیاں کے جسم کے لمس کا تصور ہی کس قدر سرور آفریں تھا۔ جب کبھی وہ اس سے چھو جاتا تو اس کے جسم میں سر سے پیروں تک سنسناہٹ پھیل جاتی ---- بگیاں کا جسم شراب کے ایک لبریز پیمانے کی طرح چھلکا جاتا تھا۔

اتنے میں اسے ایک کنکر آن لگا۔

اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اس نے گھوم کر دیکھا کوئی بھی صورت نظر نہ آئی۔ اس نے مسکرا کر مُنہ پھیر لیا۔ وہ حیران تھا کہ بیگماں اتنی دور کیسے چلی آئی.... معاً دوبارہ کنکر لگا۔ اس نے فوراً سر گھما کر دیکھا اور کچی دیوار کی آڑ میں اسے چوڑیوں والی کلائی کی جھلک دکھائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ اتنے میں ادھر سے تیسرا کنکر مارنے کے لئے ہاتھ اٹھا... بیگماں نے نشانہ باندھنے کے لئے جھانک کر دیکھا اور ایک دم سامنے دیکھ کر اس نے مسرت کی ایک چیخ ماری اور بھاگ کر دور جا کھڑی ہوئی۔ رہٹ کے اردگرد وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھر رہے۔ بیگماں چیخ چیخ کر ہنس رہی تھی۔ طویلے کی ایک دیوار ذرا آگے کو بڑھی ہوئی تھی۔ بیگماں منیر کو چکر دے کر اس دیوار کے پیچھے چھپ گئی۔ منیر دبے پاؤں بڑھا تو بیگماں اس کی جانب سے بے خبر دیوار کی دوسری طرف تاک لگائے کھڑی تھی۔ اس کی چندری کندھوں پر گری ہوئی تھی۔ پیٹھ دیوار سے لگی تھی اور دونوں ہاتھ دیوار پر ٹکے ہوئے تھے۔ گھنے بالوں کے ساتھ بندھا ہوا لمبا پراندہ پنڈلیوں کے اوپر جھول رہا تھا۔ اس کا دم پھولا ہوا تھا۔ چھاتیاں نیچے اوپر ہو رہی تھیں.... منیر چپکے سے قدم ناپتا ہوا پہنچا اور ایک دم اس نے اپنے دونوں ہاتھ بیگماں کے دونوں طرف دیوار پر ٹیک دیئے اور اسے گھیرے میں لے لیا.... وہ چونک کر چیخی اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس وقت وہ کس قدر خوش تھی۔ رہٹ کے اس خاموش گوشے میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بیگماں.... اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ گال تمتائے ہوئے تھے۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نہ معلوم اس وقت منیر احمد نے اس کی طرف کن نظروں سے دیکھا کہ اس کی شوخی شرم میں تبدیل ہو گئی اور وہ

آنکھیں جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ صرف پیپل کے گھنے درخت کی کھوکھ میں طوطے پھڑپھڑا رہے تھے۔

شدتِ جذبات سے منیر احمد کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں "بیگماں!"... اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔

بیگماں نے آہستہ سے اوڑھنی کو سنوار کر سر ڈھانپتے ہوئے ایک اچٹتی سی نگاہ منیر پر ڈالی۔ تو اس کے رخسار شفق زدہ ہو گئے۔ وہ زمین کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"مجھے جانے دیجئے"

منیر احمد اپنی دونوں ہتھیلیاں دیوار پر ٹکائے کھڑا تھا۔ بیگماں نے حرکت کی۔ لیکن منیر کی پتلی پتلی باہیں اسے گھیرے میں لئے ہوئے تھیں۔ وہ ان کی طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے یہ لوہے کے حلقے ہوں جنہیں ہٹا دینا اس کی طاقت سے باہر تھا۔

منیر نے بڑی نرمی سے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور بڑی مینا بی سے اس کا رخسار چوما...... بیگماں زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے اپنا منہ چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے رخسار خون کی حدت سے اور بھی گرم ہو گئے۔ منیر نے چند ٹوٹے پھوٹے کلمے کہے اور بار بار اس کے ہونٹ چومنے لگا۔ بیگماں نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا... کتنی زندگی تھی اس جسم میں۔ کس قدر انوکھا سرور تھا...... وہ اسی طرح ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر نہ معلوم کتنی دیر تک کھڑے رہے.....

انجن سیٹیاں دیتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کے رہٹ کا وہ منظر آنکھوں سے

ہوتا جا رہا تھا۔ ... محبت کے اس آغاز کا انجام بھی اچھا ہوا۔ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ ابھی وہ آٹھ ماہ کے قریب ہی ایک ساتھ رہ چکے تھے کہ اسے ہندوستان سے باہر جانا پڑا۔ اسے ایک ٹانگ جنگ کے دیوتا کی بھینٹ کرنی پڑی۔ ... اس کے چلے جانے کے بعد اسے اپنی بیوی کی ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھا تھا۔ وہ اس کے بغیر بہت اداس رہتی ہے۔ خواب میں اسی کی صورت دیکھتی ہے ... لڑکی پیدا ہوئی تو اس کی بیوی مرگئی۔ جب اسے اس بات کی اطلاع ملی تو وہ رو پڑا اور اس پر اس کا اس قدر شدید اثر پڑا کہ اس کے اعصاب کمزور ہو گئے اور وہ زندگی سے اس قدر بیزار ہو گیا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی واپس آنے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ اس نے باپ کو لکھ دیا کہ اپنی پوتی کا خیال رکھے۔ دو سال پہلے جب وہ قاہرہ میں تھا تو معلوم ہوا کہ اس کا باپ بھی فوت ہو گیا ہے ... اس کے بعد عزیزوں کے پے در پے خطوط آنے لگے کہ اس کا چچا اس کی زمین کی ساری آمدنی بٹور رہا ہے۔ اس کی بچی کی پرورش بھی بے پروائی سے ہو رہی ہے۔

آخر کار اس نے وطن کا رخ کیا۔

اس کی زندگی میں یکبارگی مسرت چھپر پھاڑ کر داخل ہوئی تھی۔ کیا وہ خواب میں بھی خیال کر سکتا تھا کہ وہ اس قدر خوبصورت اور محبت کرنے والی بیوی کا شوہر بنے گا۔ وہ اس سرور اور لذت کو جو اسے اپنی بیوی سے حاصل ہوئی تھی، مرتے دم تک نہیں بھلا سکتا تھا۔ یہ اس کی خوش بختی کی دلیل ہی تو تھی کہ ایسی سرور انگیز اور البیلی بیوی اسے حاصل ہوئی۔ لیکن ابھی اس نے جام لبوں سے لگایا ہی تھا کہ ہاتھ سے چھوٹ کر ریزہ ریزہ

ہوگیا۔ اب اس کی زندگی اس قدر بے کیف بلکہ تلخ ہوگئی تھی کہ اگر اسے اپنی ننھی بچی
کا خیال نہ ہوتا تو وہ کبھی کا خودکشی کر لیتا۔۔۔۔ باقی زندگی اب وہ اس بے پایاں حسرت
اور سراپا ناز کی یاد ہی میں بسر کر سکتا تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی ہو چکا تھا۔ پہلے
اس کا خیال تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ لیکن اب اسے کوئی خوبصورت لڑکی پسند
نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے شکست قبول کر لی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی اسی طرح بسر کرنے
پر مطمئن تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آبائی زمین بیچ کر وہ دنیا سے الگ تھلگ کسی پرسکون گوشہ
میں پڑ رہے۔ زندگی کی گہما گہمی سے اسے کچھ بھی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔

ڈبے میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ گاڑی گجرات کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ شہر کے نواح
میں اسے وہ سب مکانات اور درخت اور چھوٹی موٹی دکانیں یاد تھیں۔ ایک عرصہ
دراز کے بعد وہ واپس آ رہا تھا۔ ہر چیز پہلے ہی کی طرح تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کی
اپنی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو چکا تھا۔ ایک سرے سے نقشہ ہی بدل چکا
تھا۔

گاڑی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلیٹ فارم پر رک گئی۔ باہر کے لوگوں نے
اندر کی طرف ہلہ بول دیا اور گاڑی کے اندر کے لوگ باہر کی طرف لپکے۔ خیر اس کے
ڈبے میں افراتفری نہیں پیدا ہوئی تھی۔ باہر سے دو قلی آ گئے۔ اسے وردی پوش را
دیکھ کر اس کا سامان اٹھا لیا اور وہ لنگڑاتے ہوئے بیساکھیاں دبائے باہر نکلا اور تکلیف
کے ساتھ جب پھاٹک سے باہر آیا تو اس نے گاؤں کو جانے والے کسی تانگے
کے لئے نگاہ ادھر ادھر دوڑائی۔ ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ تانگہ ابھی تک
نہیں گیا، بازار سے آنے ہی والا ہے۔

منیر احمد نے سامان ایک دکان پر رکھا اور دکاندار سے کہہ دیا کہ جب ٹانگہ آئے تو اس کا سامان اس میں رکھوا دے۔ پھر وہ بازار کی طرف چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ تھوڑی دیر سیر ہی کر لے۔ شہر اسٹیشن سے کافی فاصلے پر تھا۔ راستے میں ہر شے سے وہ مانوس تھا۔ بازار میں وہی پرانی دکانیں اور چہل پہل تھی۔ جا بجا کمہاروں کی دکانیں، خوبصورت صراحیاں، گھڑے، پیالے، ہانڈیاں، کوزے، کونڈے .... ہر چیز جانی پہچانی ہوئی تھی۔ وہی اجڈ لوگ، وہی غلیظ بازار، ہر طرف گرد و غبار، لمبے لمبے پٹوں والے جوان۔ وہ تانگے سے اتر کر دونوں تھیلوں کے سہارے بازار کے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے خشک ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ پیدا ہوئی جب اس نے چنوں کا خوانچہ دیکھا تو اس کا صبر ہاتھ سے جاتا رہا۔ مسالے میں لت پت چنوں سے لبریز پرات، بیچ بیچ میں ہری مرچیں، پیاز کے قتلے کٹے ہوئے۔ اس نے دو پیسے کے چنے لئے اور ان پر لیموں نچوڑ کر پتے کے چمچے سے انہیں کھانے لگا۔

اس کے بعد وہ ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اسے کپڑوں کے چند ٹکڑے پسند آئے تو اس نے اپنی بچی کے لئے خرید لئے۔ چچا کے بچوں کے لئے ریوڑیاں اور چھوہارے لئے اور پھر تانگہ پر سوار ہو کر جب اسٹیشن پر پہنچا تو ان کے گاؤں کا تانگہ جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

کھیتوں کے بیچ میں سے ہو کر تانگہ ناہموار کچی سڑک پر ہچکولے کھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ منیر احمد اپنے خیالات میں غلطاں تھا۔ دل پر اداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اسی طرح سوچتے سوچتے اُسے اپنی بچی کا خیال آیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے ذہن میں اُس کا کیسا تصور باندھے۔ شاید لڑکی اپنی ماں کی طرح خوبصورت ہو یا خود اُس کی طرح کمزور، بے ڈول اور معمولی صورت والی۔ راستے میں دوسری سواریوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ سواریاں اگلے گاؤں کی تھیں اور تانگہ والا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ جو اس سے واقف نہیں تھا۔

آخر تانگہ ان کے چھوٹے سے گاؤں تک جا ہی پہنچا۔ اس نے تانگہ والے کو پیسے دیئے تو گاؤں کے باہر موچیوں کے لڑکے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ چند بڑے بوڑھے بھی ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ چاروں کے لڑکوں میں سے ایک نے اس کا سامان اٹھایا اور وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ نابرہ کے عظیم الشان اور بارونق قہوہ خانوں کے بعد یہ تنگ گلیاں کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں۔

اپنی گلی میں پہنچ کر اس نے اپنے مکان کے دروازے پر نگاہ ڈالی۔۔۔۔۔۔ بند تھا۔ غالباً جب سے اس کا باپ مرا تھا۔ تبھی سے بند پڑا تھا۔ دروازے کے آگے کچھ ٹوٹے پھوٹے ٹھیکریاں اور سوکھے ہوئے پتے گرے پڑے تھے۔

ساتھ والا مکان اس کے چچا کا تھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر آواز دی۔ اس کا چچا حقہ اٹھائے ہوئے باہر آیا۔ پہلے چند لمحوں تک تو اس نے اسے پہچانا ہی نہیں۔ ایک تو تفکرات کی وجہ سے منیر کی صورت بدل گئی تھی، دوسرے اب وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنے چچا کو پہچان لیا تھا۔ اس کا چچا قد آور سرخی مائل سیاہ رنگ کا ایک گرانڈیل شخص تھا۔ اس نے کہا "چچا! میں منیر احمد ہوں۔ پہچانا نہیں کیا؟"

چچا کے ہاتھ سے حقہ چھوٹ گیا۔ دونوں بغلگیر ہو گئے۔ چچا اس کا ہمدرد اور خیر خواہ تھا۔ لیکن اس کی چچی بڑی زمانہ ساز عورت تھی۔ وہ بھی آواز سن کر آ گئی اور دعائیں دے دے کر وہی حسب معمول ادھر ادھر کی باتیں بنانے لگی۔ پھر وہ گڑ کا شربت بنانے کے لئے اندر چلی گئی۔ منیر زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکا۔ اس نے فوراً اپنی بچی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چچا نے کہا کہ بچے باہر کھیلنے گئے ہوئے ہیں، دیکھتا ہوں شاید وہ گھر ہی میں ہو۔

تھوڑی دیر بعد چچا کی آواز آنے لگی۔ "چلو بیٹیا! تمہارے ابا آئے ہیں"۔

وہ آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔ دروازے میں ایک میلی کچیلی، دبلی پتلی، بکھرے ہوئے بالوں والی زرد رو خوبصورت بچی کھڑی تھی۔ منیر احمد نے ایک لمحہ کے لئے سکوت کیا۔ وہ اس کی بچی تھی ـــــ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ بھنویں نہایت حسین خم کھائے ہوئے، گالوں کی ہڈیاں کمزوری کی وجہ سے کچھ ابھر آئی تھیں۔ بچی اسے دیکھ کر خوش نہیں ہوئی، بلکہ وہ اداس، بے حرکت اور چپ چاپ کھڑی رہی۔

منیر احمد جیسا کھیاں ٹیکتا ہوا آگے بڑھا۔ چچا نے لڑکی کو اٹھا کر اس کے بازوؤں میں دے دیا۔ منیر احمد نے اپنی بیٹی کو گلے لگا کر ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ چچا شربت لینے کے لئے اندر چلا گیا اور وہ اسے اسی طرح گلے سے لپٹائے کھڑا رہا۔

"میری بچی . . . میری بچی!"

اس کے جسم کی تکان دور ہو گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دم کر کے اس کے تمام دکھ جسم سے باہر کھینچ لئے ہوں۔ خوشی اور اطمینان کی لہر اسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے ناخنوں تک محسوس ہوئی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بچی کی طرف دیکھا۔ بچی کی

آنکھوں میں مسکراہٹ کھیل رہی تھی . . . . ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر میں اسے پیار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ معلوم گھر والوں کا اس کے ساتھ کیسا سلوک تھا۔ بچی کی آنکھوں کے تلے گڑھوں کی گہرائیوں میں ایک ایسی اداسی تھی جسے بھانپ کر منیر احمد کا دل بھر آیا۔

اس کے دل میں چچا کے خلاف ایک شکایت تھی لیکن وہ اسے زبان پر نہ لایا۔

چچا نے شربت کا لوٹا اور گلاس ایک اسٹول پر رکھ دیا . . . . اتنے میں گلی کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ وہ لوگ جو پہلے اس کے بے تکلف دوست تھے اسے جھک جھک کر سلام کرنے لگے۔ ان میں سے بہتوں نے اسے پہچانا ہی نہیں۔ وہ اسے پولیس کا کوئی افسر سمجھ بیٹھے۔ اِدھر اُدھر کے بچے بھی جمع ہو گئے اور جب انہوں نے آشاں کو ایک باوردی آدمی کی گود میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو وہ بہت مرعوب ہوئے اور ننھی بچی کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا کہ اب وہ اپنے باپ کی گود میں ہے۔

جب منیر احمد کو شربت کا گلاس دیا گیا تو اس نے پہلے بچی کے منہ سے لگا دیا۔ بچی نے اس کے گلے میں حمائل کردہ بازوؤں کی گرفت کو اور بھی تنگ کرتے ہوئے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔ اس کا منشا تھا کہ پہلے اس کا باپ شربت پی لے۔ وہ ایک ذہین بچی تھی۔ منیر نے پچکار کر کہا "نہیں بیٹا پیو . . . . شاباش، شاباش . . . ."

تھوڑی دیر کے بعد چچا کے بچے بھی آ گئے۔ منیر نے ریوڑیوں اور لڈوؤں کی ٹوکری ان کے حوالے کر دی۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے اپنے گھر کی چابیاں طلب کیں اور اپنی بچی کو گود میں اٹھائے ہوئے گھر کی طرف گیا۔ باہر کا تالا کھولا اور ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور دو قدم بڑھ کر ٹھٹکا اور پھر ایک منظر بجلی کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے کوند گیا ـــــ جب اسے ہندستانی

سے باہر جانے کا حکم ملا تو چونکہ مہلت بہت کم ملی تھی۔ اس لئے وہ بھاگم بھاگ گھر والوں سے ملنے کے لئے ایک ہی دن کے لئے آیا تھا۔ سارا دن ضروری سامان باندھنے میں لگے رہے۔ پھر گئی رات تک آپس میں باتیں ہوتی رہیں۔ اس کی ماں ساری رات روتی رہی ــــ بیوی سے کھل کر باتیں کرنے کے لئے وقت ہی نہ ملا۔

دوسرے دن روانہ ہونے سے پہلے اس کا سامان تانگہ پر رکھ دیا گیا۔ وہ اسی ڈیوڑھی میں بیٹھا تھا۔ قریب ہی اس کی ماں بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ اس نے اسے تسکین دینے کی کوشش کی لیکن اس بڑھیا کے تو حواس ہی قائم نہ رہے تھے۔ پھر نہ معلوم وہ کس کام سے اٹھ کر گلی کی طرف چلی گئی۔ اتنے میں بائیں ہاتھ والے دروازے سے اس کی بیوی اندر داخل ہوئی۔ وہ منظر اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا۔

اس وقت اس کی محبوب بیوی کی سرمگیں آنکھوں کے گوشوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ وہ باریک ململ کی سیاہ رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھی قمیص کے نیچے جالی دار بنیائن تھی۔ اس کی پتلی لچکدار کمر کے دونوں خطوط جوں جوں اوپر اٹھتے تھے توں توں کشادہ ہوتے جا رہے تھے۔ اُس کا انگیا کی ضرورت سے بے نیاز سینہ کس قدر دلفریب تھا۔ سر ڈھانپنے کے لئے جب اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تو اس کی بنیان اوپر کو سرک گئی اور تنی ہوئی چکنی جلد پر اس کی کوڑی کی طرح دلکش ناف نظر آنے لگی۔ پیٹ کے موہوم سے دلفریب ابھار پر ایک نہایت دلنشین گہرائی ....

وہ اس جسم کا بھوکا تھا۔ وہ اس بدن کی پرستش کرتا تھا۔ وہ تنے ہوئے چکنے ــــ گوشت سے پُر کولھوں پر فدا تھا۔ اس جسم کی لچکدار جلد کی حدت اور نمی کو محسوس کر کے اس پر مدہوشی سی طاری ہونے لگتی تھی .... وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ

آگے بڑھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جس جسم میں نشہ آور شراب لہریں مارتی تھی۔ اس سے لطف اندوز ہونے سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا شے ہو سکتی تھی؟ . . . . قریب تھا کہ وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لے کہ اتنے میں اس کی ماں اندر داخل ہوئی۔ اس کے قدم رک گئے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رخصت چاہی۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں بیوی کو تسلی دی کہ وہ جلد ہی لوٹ آئے گا۔

ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے آج کئی برس بعد وہی پرانا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے اس مرتبہ اس پر پھر کمزوری اعصاب کا حملہ ہو گا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا اور بمشکل اپنی بچی کو سنبھالے رکھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کا سامان بھی آ گیا۔ اپنے ویران گھر کے بیچوں بیچ اس نے چارپائی ڈال کر بستر بچھا دیا۔ پھر وہ اپنی بیٹی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے لئے کھلونے پھل اور کپڑے نکالے۔ بچی بہت خوش ہوئی۔ سرسوں کے تیل کے چراغ کی روشنی میں اس کی لڑکی رات گئے تک اس سے باتیں کرتی رہی اور پھر باپ کے گلے سے لپٹ کر سو گئی۔ منیر احمد کو نیند نہ آئی۔ وہ ایک ہاتھ سے بچی کو تھپتھپاتا رہا اور دوسرا ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر آسمان کی طرف تکتا رہا۔ اب یہ گھر اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اگر اسے یہیں رہنا پڑے تو وہ پاگل ہو جائے۔

دوسرے دن اس نے چچا سے زمین بیچ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ زمینوں کی قیمتیں نسبتاً گر چکی تھیں۔ لیکن جنگ میں لوگوں نے کمایا بھی خوب تھا۔ اس لئے اس کی زمین کے کئی گاہک نکل آئے اور کسی قدر کشمکش اور سودا بازی کے بعد اس نے کل زمین اور مکان تیرہ ہزار روپے میں بیچ ڈالا۔

یہ سب کام آٹھ دس دن کے اندر ختم ہو گیا۔ جب اس کے گھر کا سازوسامان چھکڑوں پر لدنے لگا تو گاؤں کے لوگ اور اس کے دور و نزدیک کے رشتہ دار جمع ہو گئے اور سب اس کے اس ارادہ پر اظہار افسوس کرنے لگے۔ اس کے ان دوستوں نے جو بچپن ہی سے اس کے ساتھی تھے۔ اسے تاکید کی کہ وہ اپنے آبائی گاؤں میں ضرور آتا رہے۔

منیر احمد نے کانگڑے کی وادی میں ایک چھوٹے سے قصبے میں پریکٹس شروع کر دی۔ یہ ایک پہاڑی مقام تھا۔ اس وادی میں ہرے بھرے سبزہ زار اور اونچے اونچے درختوں کے جنگل تھے۔ پہاڑوں سے آنے والی آڑی ترچھی برساتی ندیاں تھیں۔ جو یا تو برسات کے دنوں میں بہتی تھیں، یا جب پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف پگھلنے لگتی اور چاروں طرف پر وقار پہاڑ رعونت کے ساتھ کھڑے نظر آتے تھے۔

لڑائی سے پہلے یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لیکن لڑائی کے دنوں میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں کے جنگلوں سے لکڑی حاصل کی جاتی تھی۔ لڑائی کے دنوں ہی میں یہاں ماچس بنانے اور ریشم کے تیار کرنے کے دو کارخانے بھی قائم ہو گئے پہلے یہ لوگ کشمیر میں کام کیا کرتے تھے لیکن چونکہ وہ جگہ بہت دور تھی، اس لیے اس جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ گورنمنٹ نے بھی گتے اور لکڑی کی پیٹیاں بنانے کے کارخانے قائم کر دیئے تھے۔ اس طرح بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری لوگ بھی اس جگہ آن بسے تھے۔ بہت سے لوگوں کو یہ مقام اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے زمینیں خرید کر مکان بنوا لئے اور مستقل طور پر اسی جگہ رہنے لگے۔

قصبہ سے باہر بڑی تعداد میں بنگلہ نما مکان بنے ہوئے تھے۔ یہاں زیادہ تر عیسائی رہتے تھے یا بچارے غریب اینگلو انڈین۔ اس جگہ رہنے والے وہ لوگ تھے جن کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن سفید پوشی بھی لازمی تھی جو لوگ در اصل امیر تھے وہ سول لائنز میں رہتے تھے۔

ہر مکان کے اردگرد کچھ زمین چھوڑ دی گئی تھی۔ سبھی مکان تقریباً ایک ہی ڈیزائن کے بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک میں تین تین کمرے۔ ان کے علاوہ باتھ روم، اسٹور روم برآمدے، علیحدہ باورچی خانہ، صحن، وغیرہ۔

جو زمین باہر بچی ہوئی تھی۔ اس میں مکان کے سامنے والے حصہ میں پھولوں کی کیاریاں بنائی جاسکتی اور پچھلی جانب سبزیاں اگائی جاسکتی تھیں۔ بعض لوگوں نے بیڈمنٹن کورٹ بھی بنا رکھے تھے۔

ان مکانوں کے درمیان ہری بھری قد آدم باڑیں تھیں۔ ان باڑوں کی پتیاں گہرے سبز رنگ کی تھیں۔ برسات کے دنوں میں ان میں ——— ہلکے نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کھلتے تھے اور بارش میں دھلے دھلائے پھولوں کے غنچے آنکھوں کو بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔

مکان میں داخل ہونے سے پہلے اس کی خوب اچھی طرح سے صفائی کروائی گئی دیواروں پہ سفیدی، دروازوں پر نیا پالش، باقی تھوڑی بہت مرمت ہو جانے کے بعد سارا سامان مکان میں رکھ دیا گیا۔ تین کمروں میں سے ایک ڈرائینگ روم بنا دیا گیا اور ایک بڑا کمرہ اس نے اپنے لئے مخصوص کر لیا اور اپنے نام کی، لکڑی کی چھوٹی سی تختی پھاٹک پہ لٹکا دی۔

منیر احمد نے اپنے ہمسایوں کی طرح مکان کے سامنے کے حصے میں کیاریاں بنوائیں۔ پچھلے حصہ میں سبزیاں اُگائیں، صرف ایک کونے میں جنگلی گلاب کے چند پیڑ رہنے دیئے۔ ان کی اوٹ میں لوہے کے ایک بڑی سی بنچ پڑی تھی۔ یہاں چیڑ کے اونچے اونچے درختوں کا سایہ بھی تھا۔ بعد میں مکان کی پچھلی طرف بیڈ منٹن کھیلنے کا کورٹ بھی بنا لیا گیا۔

باہر کے برآمدے میں لوہے کے تاروں کے بنے ہوئے گملے لٹکا دیئے گئے۔ ان میں سے رنگ برنگ کے پھولوں کی بیلیں نیچے لٹکی رہتی تھیں۔ کمرے اپنی حیثیت کے مطابق اس نے سجا لئے۔

رہنے کا ٹھکانہ بنا لینے کے بعد منیر احمد نے آشاں (عائشہ) کو ایک مقامی امریکن میں داخل کرا دیا۔ یہ ایک مشن اسکول تھا جہاں انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی۔

امریکہ کے ماحول میں چند ہی دن رہنے کے بعد آشاں کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس کے اعضا میں پھرتی اور آنکھوں میں بچپن کی شوخی عود کر آئی۔ اسکول میں جونیر کلاس تک مخلوط طریقۂ تعلیم رائج تھا۔ اس لئے آشاں کی، لڑکیوں کے علاوہ لڑکوں سے بھی دوستی قائم ہو گئی۔ جب کبھی منیر احمد اپنے مکان کے برآمدے میں جھولنے والی کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا ہوتا تو آشاں کے دوست اور سہیلیاں آتیں اور خوش نوا پرندوں کی طرح چہچہا کر کہتیں "گڈ ایوننگ انکل"!

منیر نے دوسری لڑکیوں کی طرح آشاں کے سر کے بال بھی کتروا ڈالے۔ اس خیال سے کہ جب وہ بڑی ہو جائے گی تو اس کے بال چھوڑ دیئے جائیں گے۔

آشاں کی سب سے گہری سہیلی ان کے پڑوسی ہندوستانی پادری مسیح پال سنگھ کی لڑکی تھی۔ مسیح پال سنگھ پہلے سکھ تھا۔ پھر عیسائی ہو گیا۔ وہ بہت ہی حلیم الطبع شخص تھا۔ اگرچہ اس کے ہاتھ پاؤں کی بناوٹ اور جسم کا ڈھانچہ پنجاب کے سکھوں کی طرح خوب مضبوط تھا۔ لیکن اس کے صفاچٹ چہرے سے ہیبت اور خشونت کے وہ آثار نا پید تھے۔ جو بعض سکھوں کی صورت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے محبت اور اطمینان چھن چھن کر نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شادی ایک اینگلو انڈین عورت سے ہوئی تھی۔ دونوں کی عمر میں بہت تفاوت تھا۔ وہ تقریباً بیالیس برس کی عمر کا تھا اور بیوی ستائیس اٹھائیس سال کی۔ ان کے دو بچے تھے۔ ایک شیر خوار لڑکا اور ایک آشاں کی ہم عمر لڑکی مارتھا۔ مارتھا بھی آشاں کے مشن اسکول ہی میں پڑھتی تھی۔ ان دونوں کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کی محبت کی وجہ سے منیر احمد کی ان کے ہاں بھی آمد و رفت تھی۔

منیر احمد کی مسیح پال سنگھ سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب آشاں نے اپنی منہ بولی بہن، مارتھا کو بطور تحفہ ایک گڑیا نذر کی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مسیح پال سنگھ گڑیا ہاتھ میں لئے ان کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ منیر نے دور ہی سے اسے پہچان لیا۔ اگرچہ پہلے کبھی ان کی آپس میں گفتگو نہ ہوئی تھی۔ لیکن وہ اس کی صورت سے آشنا تھا۔ اس نے بارہا اسے اپنے باغ کی کیاریوں میں نلائی کرتے یا پیڑھ کے درختوں کے تلے انجیل پڑھتے دیکھا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو سلام دعا کے بعد مسیح پال سنگھ نے گڑیا دکھاتے ہوئے اپنی مخصوص نرم آواز میں پوچھا" ڈاکٹر صاحب! یہ گڑیا میری لڑکی آپ کے ہاں سے لے گئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ آپ کی بچی نے اسے بطور تحفہ نذر کی ہے۔"

منیر احمد نے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا: جی ہاں یہ درست ہے۔ مارتھا آشاں کی منہ بولی بہن ہے۔ آشاں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی دو گڑیوں میں سے ایک مارتھا کو دے دینا چاہتی ہے۔"

مسز پال سنگھ دلفریب انداز میں مسکرا دیا۔ مجھے یونہی شک گزرا... مارتھا باہر گئی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا آپ سے دریافت کر لوں۔ اب مجھے مارتھا سے اس غلط فہمی کے لئے معافی مانگنی ہوگی۔"

منیر احمد نے اسے یقین دلایا کہ مارتھا بہت ہی نیک اور ایماندار بچی ہے۔

اس کے بعد وہ پندرہ بیس منٹ تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے

اس طرح ان کی ایک دوسرے کے ہاں آمد و رفت شروع ہوئی۔

اس مقام پر سدا بہار ہی کا موسم رہتا تھا۔ جب وہ آشاں کو اچھے اچھے کپڑے پہنا کر باہر لے جاتا تو قدرت کے حسین مناظر، ڈھلوانوں کی شادابی، پہاڑیوں کی شادابی، پہاڑوں کی متانت اور اس کی بچی کی مینا کی سی باتوں سے اس کے دل کو بڑی تسکین حاصل ہوتی تھی... کبھی کبھی وہ دور نکل جاتے تو بعض اوقات انہیں وہ پہاڑی لڑکے دکھائی دیتے جو ندی کے کنارے دم سادھے بیٹھے رہتے تھے۔ دراصل وہ مچھلیاں پکڑنے کی دھن میں ہوتے تھے۔ ایک برتن سے کٹورے میں گندھے ہوئے آٹے کی گولی رکھ کر وہ اس کے اوپر ایک مضبوط کپڑا باندھ دیتے تھے اور کپڑے کے بیچوں بیچ ایک سوراخ کر دیتے۔ پانی کی رو میں مچھلیاں بہتی ہوئی آتیں اور ان میں سے پندرہ بیس اس سوراخ میں داخل ہو جاتیں۔ گم صم بیٹھے ہوئے وہ پہاڑی لڑکے ایک دم ہمادنی سے چونک پڑتے اور کٹورا پانی

سے باہر نکال کر رکھ دیتے تھے اور جلدی سے کپڑا ہٹا کر تڑپتی ہوئی مچھلیاں تھالی میں اُلٹ دیتے۔

سب سے ظالم تو کیکڑے پکڑنے والے ہوتے تھے۔ یہ لوگ برسات کے دنوں میں نہروں یا ندیوں کے کنارے دور دور تک پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھے نظر آتے تھے۔ ڈیڑھ ہاتھ لمبی لکڑی کے ایک سرے پر پندرہ بیس کینچوے بندھے ہوتے تھے۔ کیکڑا کینچوؤں کی طرف لپک کر آتا۔ جونہی وہ کینچوؤں کو اپنی گرفت میں لیتا شکاری جھٹ لاٹھی اچک کر اسے ایک جھٹکے کے ساتھ کنارے پر پھینک دیتے۔ کیکڑا سراسیمگی میں بے ڈھنگی سی چال سے پانی کی طرف لپکتا۔ لیکن بیشتر اس کے کہ وہ پانی کے قریب پہنچنے پائے شکاری اس کی ایک ٹانگ لاٹھی سے دبا کر توڑ ڈالتا۔ کیکڑا درد کی شدت میں پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ جانے کی کوشش کرتا۔ لیکن یکے بعد دیگرے اس کی سب ٹانگیں اور بازو توڑ کر پرے پھینک دیئے جاتے۔ اس وقت مارے اذیت کے اس کی آنکھیں باہر کو اُبل آتی تھیں۔ لیکن وہ تھیلے میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح بے بس پڑا رہتا تھا۔ آشاں جب یہ منظر دیکھتی تو اس کا دل کانپ اٹھتا۔ وہ پوچھتی "ابا! وہ ان کا کیا کریں گے؟"

اس وقت شکاری ننھی لڑکی کی بات سن کر کہتا "بی بی! اسے بنگالی بابو کھایا کرتے ہیں۔"

وہاں بنگالی بابوؤں کی بھی کمی نہ تھی۔ اس لئے ان لوگوں کا یہ نیا بیوپار بھی خوب چل رہا تھا۔

آشاں بڑی ذہین لڑکی ثابت ہوئی۔ وہ اسکول کی بہت اچھی طالبات میں سے سمجھی جاتی تھی۔ اسکول میں چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آشاں کو اس فاختہ کا پارٹ دیا گیا۔ جس کا بھائی دانہ چگنے گیا اور وہاں وہ ایک چیل کے گھونسلے میں جا پھنسا۔ اوپر سے چیل آگئی اور اپنے بچوں کو پروں میں چھپا کر بیٹھ گئی۔ ادھر اس کی بہن فاختہ یعنی آشاں بہت پریشان تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس جگہ پہنچی اور بڑی مشکل سے اپنے بھائی کو رہائی دلائی۔

وہ کوئی ایک کھیل بھی کھیل لیتی تھی۔ اسے رسی پھاندنے میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس بات میں اسکول کی صرف دو لڑکیاں اس کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ باقی بچاری تو منہ دیکھتی ہی رہ جاتی تھیں۔ وہ بچاری شہری لڑکیاں تھیں، ان کی رگوں میں وہ خون کہاں جو آشاں کی نس نس میں دوڑ رہا تھا۔

اس کے علاوہ اسے گیند کھیلنا بھی خوب آتا تھا۔ وہ ربڑ کے گیند کو ایک مرتبہ فرش پر دے مارتی اور پھر گیند اچھالے ہی جاتی اور اسے کبھی زمین پر گرنے نہ دیتی۔ اس کھیل میں اسکول کی کوئی ہوشیار سے ہوشیار لڑکی بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

دن گزرتے گئے۔

منیر احمد کی مصروفیتیں بڑھتی گئیں۔ اب اس کا مطب بھی چل نکلا تھا۔ چار گھنٹے صبح اور چار گھنٹے شام کے وقت وہ مطب ہی میں گزارتا تھا۔ صرف اتوار کے دن کی چھٹی کرتا یعنی شام کے وقت مطب میں نہ جاتا۔ اس نے اپنے مکان ہی پر پریکٹس شروع

کر دی تھی۔ صرف اتنا اضافہ ضرور کیا تھا کہ مالک مکان سے کہہ کر اپنے کمرے کے آگے والے حصہ کے سامنے ایک سائبان کھڑا کروا لیا تھا۔ اس سائبان کے اندر لکڑی کی بنچیں بچھی ہوئی تھیں۔ مریض آتے اور ان پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔

ڈاکٹری کے علاوہ اس کا دوسرا مشغلہ مرغی خانہ تھا۔ اس نے مکان کی پچھلی جانب بڑے اہتمام کے ساتھ ایک مرغی خانہ بنوا لیا تھا۔ مرغیاں پالنے کے فن پر اس نے بہت سی کتابیں منگوائیں۔ کتابوں میں لکھی ہوئی ہدایتوں کے مطابق ایک بہت بڑی جالی مرغی خانہ کے چاروں طرف لگوا دی۔ جالی کے اندر انیٹوں کے چھوٹے چھوٹے ڈربے اس نے بنوا دیئے۔ تاکہ مرغ اور مرغیاں سردی گرمی سے بچ سکیں اور مرغیاں انڈے دے سکیں۔ اس نے اعلیٰ نسل کی انگریزی مرغیاں اور مرغے خرید کر پالے۔ چند ہی سال بعد ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہو گئی کہ اگر وہ چاہتا تو اچھی خاصی تجارت شروع کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے سوچا کون یہ نیا جھنجھٹ مول لے۔ اس کا وقت خاصہ گذر جاتا تھا۔ دسترخوان پر بلاناغہ انڈے کھانے کو ملنے لگے تھے اور بچہ چوزے بھی تعداد میں اس قدر زیادہ تھے کہ ہر روز کھائے جاتے تو ختم نہ ہوتے۔

باغبانی بھی اس کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ اب اسے پھولوں کی قسموں سے بھی کافی واقفیت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے کیاریاں بنا کر پھولوں کے پودے لگاتا۔ پھولوں کے ساتھ وہ سبزیوں کو بھی نظر انداز نہ کرتا تھا۔ ہر موسم کی سبزی ترکاری اس کے چھوٹے سے باغ سے مل جاتی تھی۔

ان مشاغل کے بعد جو وقت ملتا وہ پادری صاحب کی صحبت میں گزار دیتا۔ آشاں عموماً اپنی سہیلیوں میں مصروف رہتی اور وہ اپنے دوست مسیح پال سنگھ کے ساتھ باتیں کرتا۔ دینیات میں مسیح پال سنگھ کا علم بہت وسیع تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ محض انجیل پڑھ لینا یا مسیح کے گن گا لینا ہی اس کا مذہب نہ تھا بلکہ وہ عملی زندگی میں بھی مذہب کی اعلیٰ تعلیمات کو مدِ نظر رکھتا۔ وہ ایک عالم باعمل تھا اور شاید اسی وجہ سے اس کے چہرے سے ایک ابدی مسرت اور اطمینان کا نور جھلکتا تھا۔ اس کی آواز دھیمی ہوتی تھی۔ اس کی گفتگو میں تیزی و طراری کا شائبہ تک نہ تھا۔ منیر احمد کو اس کی یہ ادا بہت پسند تھی کہ وہ دوسروں کی بات کان دھر کر سنتا تھا۔ اسے اپنی بات کہنے کی جلدی نہ ہوتی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے مسکرا مسکرا کر دوسروں کی باتیں سنتا۔ خواہ وہ باتیں کتنی بھی خشک کیوں نہ ہوتیں یا کہنے والا کتنی بھی غلط بیانی سے کام کیوں نہ لیتا، اس کی پیشانی پہ بل تک نہ آتا۔

اس کی صحبت میں منیر احمد کو ہمیشہ ہی انتہا درجے کی خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ مسیح پال سنگھ کے مکان کے ارد گرد ان کی بہ نسبت دگنی زمین خالی پڑی تھی۔ شاید زمین کے مالک کا اس جگہ ایک اور مکان بنوانے کا خیال ہو جو کسی مصلحت سے بنوایا نہیں گیا۔ خیر بہر دست وہ ساری جگہ مسیح پال سنگھ کے تصرف میں تھی۔ مسیح پال سنگھ نے کوئی باغ نہیں لگوایا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کا مذاق اسٹیونسن کی طرح تھا۔ اسے زمین کا سادہ ٹکڑا بہت پسند تھا۔ اسی طرح اپنے احاطے میں چیڑھ کے درختوں تلے بیٹھنا اسے بہت ہی مرغوب تھا۔

شام کے وقت منیر احمد بھی درختوں کے اس جھنڈ تلے جا بیٹھتا تھا۔ منیر احمد کو

مذہب یا فلسفے کی باریکیوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی اور نہ وہ انہیں سمجھتا ہی تھا۔ لیکن وہ اس کی تقریریں سے کام کی کوئی نہ کوئی بات پا ہی لیتا تھا۔ مثلاً جب وہ کہتا "ابتدا میں کلمہ تھا۔ کلمہ خدا کے ساتھ تھا۔ کلمہ خدا تھا"۔۔۔ اور پھر وہ اس کی تشریح کرتا تو منیر احمد کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اس کی عظمت اور قابلیت کا قائل ہو جاتا۔ اسے یقین تھا کہ اگر کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی آکر اس کی یہ گفتگو سنے تو اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ ان زیادہ گہری باتوں کے بجائے اسے حضرت مسیح کے سیدھے سادے اقوال زیادہ پسند تھے اور پھر بائبل کی وہ دلچسپ کہانیاں بڑے غور سے سنتا۔ لمبے سوئے ہوئے بیٹے کی کہانی۔ سات کنواریوں کا قصہ۔ بیج بونے والے کا افسانہ وغیرہ اسے واقعی بہت پسند تھے۔ وہ یہ کہانیاں آشاں کو بھی سنایا کرتا۔ کئی رات تک آسمان سے باتیں کرنے والے چیڑھ کے درختوں تلے مسیح پال سنگھ، اس کی بیوی اور منیر احمد باتیں کیا کرتے تھے۔ مسیح پال سنگھ کی آواز میں بڑی شیرینی تھی۔ جب وہ باتیں کرتے وقت اپنے ہاتھوں کو بھی ایک خاص انداز سے حرکت دیتا تو سننے والے پر سرور سا طاری ہو جاتا۔ جب کبھی منیر احمد کو ماضی کی یاد ستاتی تو مسیح پال سنگھ کی آواز ہی سن کر اسے اپنے دکھ دور ہوتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ سب لوگ بائیسکوپ دیکھنے چلے جاتے تھے۔ ان دنوں وہاں خاموش تصویریں آتی تھیں۔ ان میں بعض مذہبی کھیل بھی ہوتے تھے جنہیں دیکھ کر مسیح پال سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔

ارد گرد پہاڑوں میں بہت سے تفریح کے مقامات بھی تھے۔ کبھی وہ سب مل کر پکنک پر بھی چلے جاتے۔ سارا دن ہنسی مذاق، گھومنے پھرنے اور

نہانے دھونے میں گزر جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ منیر احمد بڑھاپے کی طرف قدم بڑھاتا گیا اور اس کی بچی شباب کی جانب۔

آشا جب چودہ برس کی پہنچی تو اس کی جوانی کے سامنے اس کی ماں کا شباب بھی پھیکا پڑ گیا۔ یہ صحت مند اور متناسب الاعضا لڑکی ہزاروں میں ایک تھی۔ اس کا رنگ گورا نہ تھا۔ لیکن خون کی حدت سے اس کے رخسار گلنار تھے۔ ہونٹ رس بھری ناشپاتی جیسے تھے جن میں سے شہد ٹپک پڑے گا۔۔۔ روایت ہے کہ بعض عورتیں خدا فرصت میں آرام سے بیٹھ کر پوری توجہ سے بناتا ہے۔ اسی پر صادق آتی تھی۔ لیکن وہ اس وقت اپنے حسن و شباب سے اس قدر بے خبر تھی جیسے ایک چھ برس کی بچی —— وہی دوڑ بھاگ، کودنا پھاندنا، کھیل کھیلنا —— جب منیر احمد بیٹھک میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول ہوتا تو وہ بچوں کی طرح مچلتی ہوئی آتی اور پلنگ پر لیٹ کر باپ کا ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھ لیتی تھی۔ وہ سمجھ جاتا کہ اس وقت اس کی بیٹی کوئی فرمائش لائی ہے۔ وہ اٹھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتا اور پوچھتا! "آشو! آج لاڈلی بیٹی کی کیا فرمائش ہے؟"

اس پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور کہتی "ابا! آپ کو میرے دل کا حال کیونکر معلوم ہو جاتا ہے۔ کیا آپ غیب داں ہیں؟"

وہ آشا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا "ہاں آشو! میں غیب داں ہوں۔ کم از کم تمہارے دل کی باتیں مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتیں۔"

اس کے بعد کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتی اور اپنی فرمائش منظور ہو جانے پر وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

آشاں ابھی تک اس قدر الھڑ تھی کہ منیر احمد کو یہی خیال آتا کہ اس کے لاڈ پیار کی وجہ سے اس لڑکی کو دنیا داری کی ہوا تک نہیں لگنے پائی۔ ابھی تک وہ ننھی بچی ہی ہے۔ اس نے بارہا آشاں کو مارتھا کے ساتھ کمرے میں رقص کرتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ قدم اٹھاتیں، جسم کے ہر عضو کی حرکتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتیں اور بڑے انہماک سے باریک آواز میں کوئی گیت شروع کر دیتیں۔

منیر احمد نے بیٹی کو اسکول سے ہٹا لیا۔ البتہ استانی اسے گھر پہ پڑھانے کے لئے آتی تھیں۔ اس کے بال کٹوانے بھی اب بند کر دیئے تھے اور وہ بڑھ کر بڑے گھنے اور لمبے ہو گئے تھے ـــ آشاں کی مارتھا کے سوا کسی اور کے گھر زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ اس نے انگریزی طریقہ پر تعلیم پائی تھی۔ پردے کی حد تک پردہ کی پابندی کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

تین چار برس اور گزر گئے۔

آشاں نے وہ روپ نکالا کہ اگر وہ گاؤں میں ہوتی تو علاقہ بھر میں ایک شور سا مچ جاتا اور کتنے ہی منچلے نوجوانوں کے سر پھٹ گئے ہوتے لیکن دنیا کے اس خاموش گوشہ میں ایک جنگلی پھول کی طرح کھل کر رہ گئی تھی اور اس کا جسم گرمی شباب سے چٹک رہا تھا۔ آنکھوں میں وہ طراوت پیدا ہو گئی تھی جو صرف بھرپور

شباب ہی کا نتیجہ ہو سکتی تھی۔ ہونٹوں پر ایک ایسی منداز چکنائی نمودار ہو گئی تھی جس پر بھونرے منڈلاتے رہیں۔ وہ پلنگ پر پڑی پڑی انگڑائیاں لیتی اس کے جسم کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا۔ جسم کے اعضا میں میٹھی میٹھی خلش محسوس ہوتی۔ وہ بیٹھے بیٹھے گہرے سانس لے کر سینہ تان لیتی اور دزدیدہ دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی اور پھر راستہ بھولی ہوئی ہرنی کی طرح متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ وہ گھنٹوں چارپائی پر پڑی پڑی بے چینی سے کروٹیں لے لے کر اپنے جسم کو ادھر ادھر پٹختی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ اتوار کا دن اور دوپہر کا وقت منیر احمد اخبار دیکھ رہا تھا اس پر غنودگی سی طاری تھی۔ اور پھر اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ کب نیند نے اسے آدبایا اور پھر یکایک جو آنکھ کھلی تو اسے پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے بجلی کا پنکھا چلا دیا۔ پانی کا لوٹا لے کر غسلخانے میں گیا۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اب اس کے ہاتھ کی جلد پر سلوٹیں پڑ رہی تھیں۔ جسم کی رنگت بھی پھیکی پڑ گئی تھی۔ وہ بدن میں بھی پہلے کی بہ نسبت کچھ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب وہ بوڑھا ہو رہا ہے۔

وہ بیاکھیاں لگاوں میں دبائے باہر کھلی ہوا میں نکل آیا۔ ہوا بند تھی لیکن آسمان کے ایک گوشے سے مٹیالے رنگ کے بادل پھیل کر سورج کو اپنے دامن میں چھپا لینا چاہتے تھے۔ گدھ کے آگے آگے چیلیں پرواز کر رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ بارش ہو گی۔

وہ کیاریوں میں سے ہوتا ہوا جنگلی گلاب کے پیڑوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا

اس جگہ دو تین چیڑھ کے درخت بھی موجود تھے۔ اسے خیال آیا کہ ایک عرصہ سے لوہے کی بنچ گلاب کے جھنڈ کے نیچے پڑی ہے۔ اگر اسے جھنڈ کے اس طرف درخت تلے رکھوا دیا جائے تو جس دن بادل چھائے ہوئے ہوں۔ وہ صبح و شام اس پر بیٹھ کر باغ کا نظارہ کر سکتا ہے۔

انہی خیالات میں غلطاں وہ آگے بڑھا معاً گنج میں بچھی ہوئی بنچ پر... آشاں کسی اجنبی نوجوان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔

منیر احمد دم بخود رہ گیا ــ کس قدر ناقابلِ یقین.... آشاں بدمست شرابیوں کی طرح نوجوان کے شانے پر گری پڑی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے بال بے احتیاطی سے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے، اس کی آنکھیں بند تھیں، مُنہ ذرا کھلا تھا اور دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے، نتھنے پھڑک رہے۔ دوپٹہ سینے پر سے کھسک چکا تھا اور ایک گول گورا شانہ عریاں تھا جیسے گریبان میں سے اس کی داہنی چھاتی کا ابھار صاف نظر آرہا تھا اور وہ اجنبی اس کے شانوں، گردن، ہونٹوں اور آنکھوں پر پے در پے بوسے دیتے جا رہا تھا۔ اس وقت آشاں اپنے ماحول سے اس قدر بے خبر تھی کہ اسے اپنے تن بدن کا کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ وہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح ٹہنی سے ٹوٹا ہی چاہتی تھی۔

یہ ہوشربا نظارہ اس قدر خلافِ امید تھا اور پھر اس قدر اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا کہ بُت بنا کھڑا رہ گیا۔ اسے یہ بھی خیال نہیں آیا کہ اسے ایسے موقعہ پر ٹل جانا چاہئیے۔ پہلے حیرت اور غضب کے مارے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کا ایک پاؤں زمین میں گڑ گیا۔

دفعتاً اجنبی کی نگاہ اس پر پڑی۔ بجلی کے ایک جھٹکے کے ساتھ وہ آشاں کو پرے دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے لمحہ میں آشاں بھی ہٹی ۔ ۔ ۔ ۔ نیر احمد نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ اپنا نیم عریاں سینہ ڈھانپتی اور اوڑھنی سنبھالتی ہوئی گھر کی طرف بھاگ گئی اور اجنبی نوجوان نے لحظہ بھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اچک کر باڑھ میں سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں تک اس کے اعصاب کی قوت بالکل ہی سلب ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ بغلوں میں دبی ہوئی بیساکھیاں لرزتی رہیں۔ پھر جب غیظ کی پہلی لہر چڑھ کر اتر گئی اور وہ اس قابل ہوا کہ حرکت کر سکے تو وہ بڑی تیزی سے بیساکھیاں ٹیکتا ہوا ادھر ادھر دیکھتا ہوا گھر کی جانب بڑھا۔ ڈرائینگ روم سے نکل کر جب سونے کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ سامنے آشاں پلنگ پر اوندھے منہ پڑی سسکیاں لے رہی ہے۔

وہ ایک لمحہ کے لئے رکا۔ اس کی گذشتہ زندگی بھر کا غیظ ایک شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ اس کی آنکھیں ایسی تھیں جیسے خون ٹپکنے کو ہو۔ اس کا سکڑا ہوا چہرہ پتھر کی طرح بے حس تھا اور چہرے کے ٹیڑھے میڑھے خطوط کسی مصری ممی کی طرح دہشت ناک نظر آ رہے تھے۔ آشاں نے باپ کو ایسی غضب ناک حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باپ اپنی آنکھیں اس پر گاڑے ہوئے تھا۔ اس کی باچھوں میں سے درندوں کی طرح دانت نکل کر چمک رہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔ بھاگ نکلنے کے لئے اٹھنے لگی لیکن ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے۔ وہ بے بس ہو کر رحم طلب نظروں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی لیکن اس کے باپ کا چہرہ لاش

کی طرح سفید اور بے حس تھا اور وہ لمحہ بھر کے سکوت کے بعد آگے کو بڑھا آ رہا تھا۔

آشاں کی آنکھیں حیرت، نگبہ طور پر پھیلتی گئیں۔ اس کی کن پٹیاں جلی اٹھیں۔ اس نے انتہائی وحشت کے زیر اثر چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔ اُدھر اس کا باپ آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ادھر اس کا سر نفی کے طور پر حرکت کر رہا تھا۔ اس کے خشک ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ تک اٹھانے کی سکت باقی نہ رہی۔ باپ نے نزدیک پہنچ کر پوری قوت سے اس کے گال پر طمانچہ رسید کیا "حرام زادی! ... بے حیا!! بے شرم! .... ذلیل .... !"

اس کے حلق سے گالیاں ایسی انوکھی اور مہیب آوازیں نکل رہی تھیں جیسے اس کے جسم کے اندر کوئی حیوان بیٹھا بول رہا ہو۔ آشاں تھپڑ کھا کر فرش پر گر پڑی ہے باپ بیساکھیاں پرے پھینک کر اس پر بھیڑیے کی طرح جھپٹ پڑا۔ گھونسے، گھونسے، تھپڑ پہ تھپڑ، پاگل کتے کی طرح اس نے اس کے بال نوچ ڈالے۔ جوں جوں وہ اسے مارتا تھا۔ توں توں اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ آشاں کی قمیص تار تار ہو گئی۔ مسوڑھوں سے لہو بہنے لگا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں چوپائے کی طرح گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چلتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ باپ کے ہاتھوں کی زد سے باہر نکل جائے۔ اس کے سر پر بیساکھی کی چوٹ اس زور سے پڑی کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔

اس وقت منیر احمد نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ ان کی بارہ چین دوپہر کی چھٹی

کرنے کے بعد واپس آرہی ہے۔ وہ پھاٹک ہی پر تھی کہ منیر احمد نے فوراً سونے کے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔ باورچن سیدھی کچن میں پہنچی اور وہاں سے برتنوں کے ہلانے جلانے کی آوازیں آنے لگیں۔

منیر احمد کمرے میں کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی وحشت کم ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب کی تشنجی کیفیت دور ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا دل پریشان ہونے لگا۔ ایک نامعلوم سا خوف اس کے ذہن پر چھانے لگا۔ پھر وہ بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جلدی جلدی ٹہلنے کے بعد وہ ایک دم رکا اور روتی، پانی اور دواؤں کا بکس لے کر وہ بھاگ کر سونے کے کمرے میں پہنچا۔ اس نے آشاں کی طرف دیکھا۔ آشاں خون میں لت پت بےہوش پڑی تھی۔ اس نے اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ جلدی سے اس کے سر کا زخم دھویا۔ اس کی انگلیاں بڑی پھرتی سے اپنا کام کر رہی تھیں۔ زخم پر پٹی باندھ دینے کے بعد اس نے اس کے جسم کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنا شروع کیا۔ اس نے اس کی ٹانگیں ہلا جلا کر دیکھیں۔ اس کے بازو، کلائیاں، ٹخنے، گردن سب کو بڑی نرمی سے ہلایا جلایا اور اسے بڑی تسکین محسوس ہوئی۔ پھر اس نے اسٹیتھسکوپ لگا کر دل کی حرکت اور سانس کی آمد و رفت کا جائزہ لیا۔ اسے کسی قسم کی شدید چوٹ نہ آئی تھی۔ سر کا زخم بھی معمولی تھا۔

اس نے کھڑکی کھول دی اور دروازہ مقفل کر کے کچن کی طرف گیا۔ باورچن سے کہا کہ آج آشاں اپنی ایک سہیلی کے ہاں دعوت پر گئی ہے اور وہ آج کھانا نہیں کھائے گا۔ چوزے کا سوپ ہی پی لے گا۔ باورچن دل میں خوش ہوئی کہ جان چھوٹی۔

باورچن کے چلے جانے کے بعد منیر احمد دیر تک برآمدے میں ٹہلتا رہا۔ آشاں ابھی تک بیہوش تھی لیکن اسے اس بات پر اطمینان تھا کہ اس کی زندگی کو کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا۔ باہر پورا چاند چیڑھ کے درختوں کی نازک شاخوں میں اُلجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

منیر احمد عجب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ دو جھینگر بول رہے تھے۔ وہ رات کی تاریکی میں بیسیا کھمیاں ٹیکتا ہوا باڑ میں سے نکل کر مسیح پال سنگھ کے مکان کی طرف بڑھا۔ وہ کمرے میں بیٹھا نظر آ رہا تھا لیکن وہ اکیلا نہ تھا۔ مارتھا اس کے پاس بیٹھی تھی۔ یہ چوروں کی طرح کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ دل میں ڈر رہا تھا کہ اگر اسے کوئی اس حالت میں دیکھ لے تو نہ معلوم کیا سمجھے۔ بارے مارتھا دوسرے کمرے میں گئی تو اس نے مسیح پال سنگھ کو آواز دی۔ مسیح پال نے اسے اندر بلا لیا۔ لیکن اس نے کہا کہ وہ اس سے تنہائی میں بات چیت کرنا چاہتا ہے۔

مسیح پال سنگھ گھبرایا ہوا ننگے سر ہی باہر نکل آیا۔ چیڑھ کے درختوں تلے پہنچ کر وہ دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ منیر احمد نے ساری بات کہہ سنائی۔ مسیح پال سنگھ نے کل واقعہ سننے کے بعد کہا "یہ بالکل معمولی بات ہے۔ جوانی کی عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ اس قسم کی باتوں پر آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہئے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ لڑکی کی شادی کر دیں۔ بلکہ آپ کو چاہئے تھا کہ یہاں تک نوبت پہنچنے سے پہلے اس کی شادی کر دیتے۔"

اس کے بعد مسیح پال سنگھ نے اپنے مخصوص لب لہجہ میں ایک بڑی لمبی چوڑی تقریر کی۔ منیر احمد کے دل کو بڑی تسکین حاصل ہوئی۔ باتیں کرنے سے اس کے جی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ پھر جب وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھا تو محجوب سا ہو کر بولا "افسوس تو اس امر کا

ہے کہ میں نے بچاری کو پیٹ ڈالا۔"

زندگی میں ایک مرتبہ پھر شکنوں کے خاص انداز میں ایک قہقہہ لگا اُٹھی۔ [illegible]
کہنے لگی۔ "مسٹر منیر احمد! آپ سے چار انگل بلند قامت اور مضبوط جسم والی نوجوان لڑکی کا
آپ کے گھونسوں سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔"

جب منیر احمد واپس آیا تو اس نے دروازہ کھول کر دیکھا کہ آشاں اب بھی بے ہوش پڑی
ہے۔ بڑی کھڑکی میں پورے چاند کی دودھ کی سی سفید روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ اس
کے قریب جا کھڑا ہوا۔ آشاں کی قمیص کے چیتھڑے ہو کر لٹک رہے تھے۔ ان چیتھڑوں
پر بھدے رنگ کے خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اس نظارے کی
تاب نہ لا سکا۔ اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کی قمیص اتاری
اور جلدی سے مُنہ پھیر کر اسے آتشدان میں پھینک ماچس دکھا دی۔

کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ صرف کلاک کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔
اس کے دل پر ایک غبار سا چھا رہا تھا۔ اس کی ٹانگ لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے کانپتے
ہوئے ہاتھوں سے ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں سے دُھلی ہوئی قمیص نکالی اور بڑی احتیاط
سے نظریں زمین پر گاڑے ہوئے وہ آشاں کے پلنگ کی طرف قدم بقدم بڑھ رہا تھا
۔ ۔ ۔ دفعتہً اس کی آنکھیں اوپر اٹھ گئیں ۔ ۔ ۔ ۔

سفید چاندنی میں اُجلے بستر پر نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا بے داغ اور بے عیب
جسم ایسے پڑا تھا جیسے سیپ میں موتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نہال چند

اگرچہ میں نے پرانی کتابوں کی دکان اس لئے بند کر دی تھی کہ اس کی آمدنی بہت کم تھی اور لوگ پرانی کتابوں کی دکان کو زیادہ قیمت دینے کو تیار نہ تھے لیکن اصل بات ایک ہی تھی یعنی میرے باعث میں کوئی کام جمی کے ساتھ نہیں کرتا تھا اور وہ تھی میرے ذہن کی آوارگی۔ میں نے کئی قسم کے پیشے اختیار کئے لیکن کچھ عرصے کے بعد ترک کر دیئے۔ کشمیر کی کشش مجھے کھینچ لے گئی۔ وہاں بڑے طمطراق سے پرانی اور نایاب کتابوں کا کاروبار شروع کیا۔ کشمیر کی جی بھر کر سیر کی۔ لیکن ایک نوکر انسان کو جس شے کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ وہاں اس قدر ارزاں نہ تھی۔ اس لئے من جلد ہی اچاٹ ہو گیا اور کاروبار بند کر کے واپس لاہور جانے کی ٹھانی۔

گلمرگ میں برف گرنی شروع ہو گئی تھی۔ اس خوف سے کہ کہیں برف اور زیادہ پڑنے لگے اور راستہ بند ہو جانے کے سبب لاہور پہنچنے ہی سے رہ جاؤں۔

میں نے دکان کا سامان اونے پونے بیچا اور ایک سہانی صبح کو لاری میں سوار ہو کر شام کو راولپنڈی پہنچا اور وہاں ایک رات کاٹ کر دوسری شام کو لاہور جا اترا۔

والد صاحب فوت ہو چکے تھے۔ اب بڑے بھائی ہی خاندان کے کفیل تھے۔ شام کو میں گھر پہنچا تو انہیں موجود نہ پایا۔ ماتاجی مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں، انہوں نے میری بلائیں لیں اور پراٹھے پکوا کر کھلائے۔ بھابی، ناک بھوں چڑھائے، منہ سے تو کچھ نہ کہتی تھیں، البتہ فرش پر زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی گھومتی رہیں۔

رات کو بھائی صاحب آئے اور انہوں نے اپنی خفگی چھپانے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی . . . "کیا ابھی تک تو اپنے آپ کو دودھ پیتا بچہ سمجھتا ہے؟ اب تیری عمر بائیس برس کی ہو چکی۔ تو کسی کام کے نزدیک تک نہیں پھٹکتا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر تو ہے کس خیال میں۔ تو سمجھتا ہے کہ میں ساری عمر تجھے گھر بٹھائے کھلائے جاؤں گا۔" اور اس کے بعد انہوں نے وہ پرانی کہاوت دہرا دی کہ کام پیارا ہوتا ہے چام پیارا نہیں ہوتا . . . . "میں بال بچے دار آدمی ہوں اور تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ بچے جوں جوں بڑے ہوتے ہیں، ان کے اخراجات بڑھتے جاتے ہیں لیکن تیرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اگر تو میری یا ماتاجی اور بہنوں کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکتا تو کم از کم اپنا پیٹ تو پال۔ اب تک تو نے کچھ کم مزے لوٹے ہیں۔ ذرا پوچھ تو ماتاجی سے، میں نے کس عمر میں کام شروع کر دیا تھا . . . ." اور اس طرح بھائی صاحب بہت دیر تک بکتے جھکتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ ماتاجی ٹانگوں میں دہکتی ہوئی انگیٹھی لئے بیٹھی تھیں۔ "اچھا اب رہنے دے بیٹا۔ بیچارا تھکا ماندہ آج ہی تو آیا ہے . . . ."

اس پر بھائی صاحب اور بھڑک اُٹھے "تو ماتاجی! کدن سے پہاڑ پھاند کر چلا آرہا ہے۔ ایک تو آپ کے اس بے جا لاڈ نے اسے بگاڑ دیا ہے۔"

بھائی صاحب کی کڑک سُن کر، گھر کی بلّی جو مزے میں میاؤں میاؤں کر رہی تھی، بدک کر بھاگ گئی۔ ماتاجی نے دبی زبان سے کہا "بچّہ ہی تو ہے نا! آپ سمجھ جائے گا...."

اس بات پر بھائی صاحب کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ لیکن میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں اور ان کی باتوں کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ مدھم ہونے لگیں۔ جیسے وہ کہیں دور چلے گئے ہوں۔

دوسرے روز جو میری آنکھ کھلی تو اچھا خاصہ دن چڑھ آیا تھا۔ مجھے خوب گہری اور میٹھی نیند آئی تھی۔ طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ رفتہ رفتہ رات کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس لئے کہ میں نے ان باتوں سے زیادہ متاثر ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب جو ان باتوں کا خیال آیا تو دفعتہً میری رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ یہ نہیں کہ بھائی صاحب کو کھری کھری سناؤں بلکہ یہ کہ آج کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ ہی لوں اور کچھ نہیں تو کم از کم کوئی نوکری ووکری ہی کر لوں۔

بھائی صاحب، بھابی، بچے، بہنیں، گھر کے سبھی لوگ باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ جب میں جاگا تو ماتاجی بستر ہی میں مجھے چائے اور مٹھیاں دے گئیں اور ہدایت کر گئیں کہ جب تک بھائی صاحب دفتر نہ چلے جائیں۔ میں باورچی خانے میں نہ جاؤں۔

میں کپڑے پہن کر بھائی صاحب سے بھی پہلے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اب پھر

اپنا لاہور تھا اور میں۔ وہی جانے پہچانے چوڑے مقامات، بارونق سڑکیں، تانگوں موٹروں، سائیکلوں کی ریل پیل۔ وہی دلہن کی طرح سجی ہوئی دکانیں۔ قطار در قطار مال روڈ کے کنارے کنارے .....

راستے میں کوئی نہ کوئی آشنا مل ہی جاتا تھا اور دو چار منٹ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر بات چیت گفتگو ہو جاتی اور پھر میں آگے بڑھ جاتا۔ اسی طرح گھومتے پھرتے میں راین روڈ کی طرف جا نکلا۔ اس جگہ اب کچھ نئی دکانیں بھی بن گئی تھیں۔ میں تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد آیا تھا۔ میں نے سوچا تو اس جگہ کا نقشہ ہی نیا نظر آنے لگا۔ یہاں میرے ایک پرانے واقف نہال چند کی فوٹو گرافی کی دکان تھی۔ نہال چند کی عمر پچپن برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بال تقریباً سب کے سب سفید ہو چکے تھے۔ رنگ سرخ و سپید تھا۔ لمبی لمبی مونچھیں، تیز چمکتی ہوئی آنکھیں، اکہرا بدن، اور چھوٹا قد ـــ یہ تھے لالہ نہال چند۔ ان کے مزاج پر عمر اور زندگی کے جھمیلوں کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب کبھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں ہمیشہ ہی خوش و خرم اور ہنسی مذاق کا دلدادہ پایا۔ اس شخص سے میرے بہت گہرے تعلقات تو کبھی نہیں رہے تھے۔ البتہ ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ضرور تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ مجھے دیکھ پائے تو ضرور خوش ہوگا۔ بڑے مزے کا آدمی تھا، سوچا اس سے ملتا چلوں۔

جب میں اس کی دکان کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ حضرت حسبِ عادت اپنی دکان کے چبوترے ہی پر پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھے گنا چوس رہے ہیں۔ میں قریب پہنچا تو امید کے مطابق اس نے فوراً مجھے پہچان لیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔

علیک سلیک کے بعد اپنے قریب ہی چبوترے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جڑ کی طرف سے گنے کا بالشت بھر ٹکڑا مجھے دکھا کر خاص انداز میں ہلاتے ہوئے کہا: "لو چوس لو۔" اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ وہ عمر و رتبہ کا لحاظ کئے بغیر ہی ہر کسی سے بے تکلف ہو جاتا اور پھر مذاق کرنے سے بھی نہ چوکتا۔

میں اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ ڈیڑھ برس کے عرصے میں اس کی صورت میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا۔ وہی متحرک بھنویں، چمکتی ہوئی آنکھیں، پھڑکتے ہوئے ہونٹ، بے چین طبیعت، وہی ہنسی اور وہی ٹھٹھول۔ میں نے اسے اپنی آوارگی کے چند چٹ پٹے واقعات سنائے اور اس نے ان میں کچھ ایسی دلچسپی لی جیسی میرا کوئی ہم عمر دوست ہی لے سکتا تھا۔ بات بات پر لالا استاد ہاتھ۔

آدھ پون گھنٹہ ادھر اُدھر کی باتوں میں گزر گیا۔ پھر اس نے پوچھا "کہو برخوردار! اب یہ سرگشت کیسی؟"

میں نے جواب دیا: "بس یونہی گھومتے پھرتے ادھر آنکلا! آپ کو بھولا نہیں تھا میں نے سوچا، درشن ہی کر لوں۔"

وہ ہنسا: "تو اب آئندہ کیا کام کرنے کا ارادہ ہے؟"

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا اور پھر ایک بات جو سوجھی تو کہا: "کام وام کیا اب تو نوکری کریں گے۔"

"نوکری کیسی؟"

"کوئی بھی ہو۔"

"مثلاً؟"

"... مثلاً ... آپ ہی کے ہاں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ میں فوٹو گرافی کا کام بھی بہت اچھا — جانتا ہوں۔ یاد ہے نا وہ میرے ہاتھ کے بنے ہوئے نگیٹو؟" ان کی بھنویں سکڑ گئیں۔ "او ہاں ہاں ... مگر ... بھئی بات یہ ہے کہ مجھے تو [illegible]زم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی زبان منہ میں گھما پھرا کر اسے مسوڑھوں پر پھیرنے لگا۔ میں جانتا تھا۔ بڈھا بھی ایک ہی گھاگ ہے۔ شیشے میں پری اتارنا چاہتا ہے — میں خاموش رہا۔

پھر اس نے خود بخود مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا "خیر بھئی! اب تم جو بھی [illegible] اور بھئی سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی تم سے کچھ انس سا ہو گیا ہے۔ [illegible] نہیں .... اچھا۔ تو بتاؤ لوگے کیا؟"

میں نے تھوڑے توقف کے بعد کہا "بندہ پرور! [illegible] پر مان جاؤں گا۔"

وہ ہنس دیا "دیکھو برخوردار! یہ پچیس وچیس کی بات تو ہے جھوٹ .... مجھے ... کہو بیس پہ کام کرو گے ....؟"

میں نے یہ بات نامنظور کر دی۔

"تو [illegible] پچیس پہ مان جاؤ۔ بیٹا! اب تمہیں پچیس ہی دے ڈالوں گا۔ جو ہو سو [illegible] تم کوئی پرائے ہو؟"

"[illegible] صاحب تو [illegible] میں پچیس سے ایک پائی کم نہ لوں گا۔"

[illegible] اپنے ہاتھوں کو حرکت دے کر کہا "تو بھئی تمہاری مرضی۔"

[illegible] کی باتیں ہونے لگیں [illegible] میں اٹھ کر چلنے لگا تو

اس نے میری تنخواہ تیس تک پہنچا دی۔ لیکن میں نہ مانا۔

جب میں وہاں سے لوٹا تو راستے میں اسی بات پر غور کرتا رہا کہ اگر وہ چالیس تک منظور کر لے تو پھر کچھ نہ کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہو سکتی ہے۔ میرا کام چل نکلتا۔ ہر مہینے کچھ روپے بھائی صاحب کی ہتھیلی پر بھی دھر دیتا تو وہ خوش بھی ہو جاتے اور کبھی آڑے وقت پر کام بھی آتے۔ اتنا تو میں جانتا تھا کہ بھائی صاحب بھابی کی لگائی بجھائی کے باوجود مجھ سے محبت کرتے اور میری بہتری چاہتے ہیں۔

سوچتے سوچتے مجھے ایک بڑے مزے کی چال سوجھی۔ اس وقت میرے پاس روپیہ بھی بہت کم تھا۔ لیکن میں اپنی جمع پونجی داؤں پر لگانے کو تیار ہو گیا۔ چنانچہ میں اسی وقت مال روڈ کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں بھگا مل اینڈ سنز کی مشہور فرم کے آگے رک گیا۔

بھگا مل کا لڑکا مکھن رائے میرا لنگوٹیا یار تھا۔ ان لالوں کے نام بھی عجیب تھے۔ باپ بھگا مل اور بیٹا مکھن رائے۔

دو تین عورتیں دکان سے باہر نکل رہی تھیں۔ میں ان کی چکنی پنڈلیوں کو دیکھتا ہوا ان کے لئے راستہ چھوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا اور جب وہ چلی گئیں تو میں اندر داخل ہوا۔ وہی پرانی فضا تھی۔ یہاں ہم کاؤنٹر کے پیچھے چھپ کر تاش کھیلا کرتے تھے۔ میری آنکھیں مکھن رائے کو ڈھونڈ رہی تھیں اور مکھن رائے بڑی میز کے آگے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو مارے خوشی کے ہانپنے لگا۔ مکھن رائے بس مکھن کا پیڑا ہی تو تھا۔ سارے میں کرسی پر ڈھیر ہو رہا تھا۔ اچھلے پلپلے گال

انبار۔

"ارے یار کہاں۔ اتنی مدت . . . " اس نے اپنی باریک آواز میں چیخ کر پوچھا "آنکھیں ترس گئیں تم کو۔ کبھی کا کارڈ بھی تو نہیں بھیجا۔"

وہ کس قدر خوش نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس روز مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ حد سے زیادہ مرتے آدمی کو اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے میں کس قدر دقت پیش آ سکتی ہے۔

مجھے کرسی پر بٹھایا گیا۔ بڑے اصرار سے آئس کریم سوڈا پلایا گیا اور پھر پان کا بیڑا کھلانے کے بعد ہاتھ میں ایک عدد اعلیٰ قسم کا سگرٹ تھما دیا گیا۔

میں نے ایک لمبا کش لگایا اور دھواں چھوڑ کر جو الف لیلیٰ کی داستان شروع کی . . . تو دو ڈھائی گھنٹے آنکھ جھپکتے میں گزر گئے۔ آخر میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ ان دنوں ان کی اپنی کئی دکانیں موجود تھیں۔ میں نے کل احوال سنا کر کہا۔ کہ مجھے عارضی طور پر ایک دکان دلوا دو۔

اس نے جواب دیا ۔ کام فوراً ہو جائے گا۔

دکان مل گئی۔

میری دکان سڑک کے دوسری جانب تھی۔ لیکن نہال چند کی دکان سے اس دکان کا فاصلہ پچاس ساٹھ قدم تھا۔ میں اپنی دکان سے نہال چند کو دکان میں گھستے باہر نکلتے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دکھائی نہ دینے کے باوجود اس کی حرکات سے میں اندازہ لگا سکتا تھا۔ کہ اس کے دل پہ کیا گزر رہی ہے۔

میں نے ۔ ے کے ایک بہت بڑے ٹکڑے پر جلی حروف میں یہ عبارت

لکھوائی "یہاں ٹیوب لیپنگ مفت کی جاتی ہے"۔۔۔ اور اسے اپنی دکان کے آگے لگا دیا۔ گھر سے چند گری پڑی پرانی ٹیوبیں بھی اٹھا لایا اور انہیں یونہی ادھر ادھر لٹکا دیا۔ اپنے یار دوست بھی کئی ایک تھے۔ انہیں بھی سازش میں شامل کر لیا اور نتیجہ یہ کہ میری دکان میں گاہکوں کا تانتا سا بندھا رہتا۔ تین چار روز ہی یہ تماشہ ہوا ہوگا۔ کہ ایک دن دوپہر کے وقت لالہ نہال چند پشت کی طرف ہاتھ باندھے خراماں خراماں میری دکان پر آ پہنچے۔ میں نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا۔ کرسی پر بٹھایا۔ پان منگوایا . . . . صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کافی مرعوب ہو چکے ہیں۔

"کہو بھائی یہ کیا تماشا ہے"۔

میں نے انکسار سے سر جھکا کر کہا "بس صاحب! سوچا کچھ کرنا تو ہے ہی . . . . چلو دکان ہی کھول ڈالو اپنی . . . ." وہ چپ چاپ منہ ہلاتا رہا اور یونہی ہوا میں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

پھر اس نے پیک تھوک کر منہ پونچھتے ہوئے کہا "ادے بھئی! وہ نوکری کرنے کا جو ارادہ تھا تمہارا . . . . ."

"اجی تین حرف بھیجو نوکری دوکری پر۔ میں باز آیا . . ."

اب نہال چند نے جبڑے ہلا ہلا کر مسوڑھوں پر چپکے ہوئے لبدے کو ہٹایا لیکن صورت سے ظاہر تھا کہ گہری سوچ میں ہے اور پھر کچھ کھانس کے حلق صاف کرتے ہوئے بولا "دیکھو برخوردار! نئے سرے سے کام چلانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ کیا سمجھے! اور بھئی یہ تو کہو کہ میری دکان کو تم نے پرائی سمجھا۔ کیا تمہاری کھوپری

میں ایک کوڑی بھر گوارا بھی نہیں۔ اگر تنخواہ ہی کی بات تھی تو مجھ سے کہا ہوتا۔۔۔ اچھا جو ہوا سو ہوا۔۔۔۔ چلو تم جیتے میں ہارا۔ اب تمہاری بات ہی رہے۔۔۔۔"

میں نے جی ہی جی میں خوش ہو کر بظاہر متین صورت بنا کر کہا۔ "دیکھئے حضور! اب دو دن ہوا ہوئے۔۔۔ کیا سمجھے آپ!۔۔۔۔ میں اور چالیس پہ مان جاؤں، ابھی تو یہ بندہ تو اب نوکری کرنے پہ تیار ہی نہیں ہے!"

نہال چند نے بھنویں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ "اچھا۔۔۔ ہنسنے لگے اب۔"

"نہیں یہ حقیقت ہے۔۔۔۔ اپنے کام کی بات ہی کچھ اور ہے۔۔۔۔ میں گورنمنٹ کالج میں گیا تھا۔ وہاں سب لوگ میرے واقف ہیں۔ پروفیسر پریم چند چوپڑا کہتے تھے کہ آئندہ سارا کام تمہیں کو دیا کریں گے۔ دیال سنگھ کالج میں بھی تیر نشانے پہ بیٹھا ہے۔ اور ہاں! ایس ڈی کالج بھی گیا تھا۔۔۔" اس بات پر وہ چونکا۔ مجھے یاد تھا کہ جب میں پہلے دن اسے ملنے کے لئے اس کے ہاں گیا تھا تو ایس ڈی کالج کے چند طلبا اس کے ہاں آئے ہوئے تھے اور اس کی سہل انگاری کی شکایت کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "تو لڑکوں کے سکرٹری نے کہا۔ نہال چند بہت سست آدمی ہے۔ اس کا کام تسلی بخش نہیں ہے۔۔۔۔ اس لئے آئندہ ہم سارا کام تم کو دیا کریں گے۔۔۔۔ اور تو اور کل مجھ سے نئی فوج والی میم صاحب نے کہا کہ نہال چند کھر اب کام کرتا۔۔۔ آگے سے ہم تم کو دینا مانگتا۔۔۔۔"

نہال چند نے اب ہتھیار ڈال دیئے اور مرعوب ہو کر بولا۔ "برخوردار جانتا ہوں تم نے مجھے پریشان کرنے کے لئے یہ دکان کھولی ہے۔ یہ ہے بھی درست تم خود تو

کام کیا کرو گے البتہ میری جیبیں میں روڑا اٹکا ہی دو گے۔ ۔ ۔ اچھا کہو تم کیونکر میری جان چھوڑو گے؟"

میں نے مسکین بنتے ہوئے کہا "میں تو آپ کا داس ہوں۔ ۔ ۔ زیادہ نہیں تو بس پچاس روپے پر مان جاؤں گا۔"

اس پر حضرت بری طرح تڑخے "یہ سراسر چار سو بیس ہے۔ ۔ ۔ چار سو بیس کیا آٹھ سو چالیس ہے۔ ۔ ۔ یاد رکھنا۔ ۔ ۔" یہ کہا اور مٹھیاں کس کر میری جانب دیکھا۔ میں سر تسلیم خم کیے کھڑا رہا۔ ۔ ۔ ۔ پھر جیسے غبارے میں سے ہوا نکل جائے "اچھا استاد مان لیا تمہیں۔ کل سے کام شروع کر دو۔"

"اقرار نامہ لکھا جائے گا؟"

"ہاں ہاں ضرور ضرور لکھا جائے گا۔"

اور جب وہ اٹھ کر خوش و خرم واپس جانے لگا تو میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔ ہاں یار کہہ تو وہ مکتی فوج کی بڈھی نے واقعی یہ بات کہی تھی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ نہال چند کھراب کام کرتا ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ آگے سے ہم تم کو دینا مانگتا۔ ۔ ۔ ۔"

اس کی گھنی بھنوؤں تلے اس کی روشن آنکھیں شوخی سے چمک رہی تھیں۔

دوسرے دن سے میں اس کے ہاں ملازمت کرنے لگا۔ اقرار نامہ بھی لکھا گیا اور اس میں احتیاطاً ایک شرط میں نے یہ بھی شامل کروا دی کہ اگر اس نے مجھے نوکری سے برطرف کیا تو ایک ماہ کی تنخواہ زائد دینی پڑے گی۔

اس کی دکان میں دو ملازم پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایک اس کا شاگرد اور

دوسرا پرنٹر۔ پرنٹر ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اور اس کے گھر میں کوئی نہ کوئی بیمار ضرور رہتا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ بیماریوں اور دواؤں کے اخراجات کا رونا روتا رہتا۔ نہال چند کا شاگرد عجیب سدھی سی طبیعت کا تنہائی پسند نوجوان تھا۔ اس کا منہ قدرے پھولا سا تھا جیسے وہ سب سے روٹھا ہوا ہو۔

دکان کا کام عجیب طریقے سے چل رہا تھا۔ سامان ادھر ادھر بکھرا ہوا، گرد اڑتی ہوئی۔ دیواروں پر چھپکلیاں مکھیوں پر جھپٹتی ہوئی اور کونوں میں مکڑیوں کے جالے لہراتے ہوئے۔ دکان میں کبھی فوٹو کا کاغذ نہ ہوتا، کبھی مسالہ ندارد اور کبھی لوشن ختم!

نہال چند اپنا کام چلانے کے لیے غیر معمولی جدوجہد نہیں کرتا تھا۔ وہ اسے بس چالو رکھتا تھا۔ اس نے فوٹوگرافی کی ضروریات کی چیزیں کبھی ایک ہی مرتبہ لاکر نہ رکھیں۔ حال یہ تھا کہ ادھر کام آیا پڑا ہے اور ادھر چھوکرے کو کاغذ کے لیے بھگایا جا رہا ہے۔

دکان میں کام بالکل ہی ختم ہو جانے پر وہ دو ڈھائی گھنٹے کے لیے دکان سے رخصت ہو جاتا۔ شہر کے کالجوں اور کوٹھیوں کے چکر لگاتا اور وہاں آخر کچھ نہ کچھ کام لے ہی آتا ـــ یہ ایک قطعاً علیحدہ بات ہے کہ بعض اوقات بہت زیادہ کام مل جاتا تھا اور اسے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی مگر اپنی طرف سے اس نے کام بڑھانے کے لیے زیادہ زور کبھی نہیں لگایا بلکہ اگر کام کافی موجود ہو تو اس کا مزاج ہی بدل جاتا تھا اور اگر کام کم ہوتا تو ہر شخص اسے مرعوب کر سکتا تھا۔ مثلاً کوئی دن ایسا ہے کہ جیب میں پیسہ نہیں کام بھی کم ملا ہے تو گاہک کے تقاضا کرنے پر اس کے انداز گفتگو میں دنیا بھر کی ملائمت جمع ہو جاتی ... "بندہ پرور! یہ ہاتھ میں تھوڑا سا

کام ہے۔ بس اس کے بعد فوراً آپ ہی کا کام شروع کیا جائے گا۔"

گاہک برہم ہو کر کہتا: "دیکھئے نا! آپ مجھے بہت پریشان کرتے ہیں۔ پرسوں کا وعدہ تھا۔ آپ نے کام کر کے نہیں دیا، کل آیا آپ نے انکار کر دیا . . . اور پھر آج . . . ."

"حضور . . . آج کا کیا ذکر ہے۔ آج تو ابھی شروع ہی ہوا ہے ختم تو نہیں ہو گیا۔ رہی پرسوں کی بات، سو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اس روز ہولی کی چھٹی تھی۔ اور جناب کل یونہی بادل گھرے رہے . . . . اب دیکھئے سر سے بلا ٹالنے والا کام تو ہم کرتے نہیں۔ آپ ہی کہئے کہ اگر آسمان پہ بادل چھائے ہوں . . . ."

"جی یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن . . . لیکن آپ کو گاہکوں کا بھی تو خیال رکھنا چاہیئے . . . ."

"ارے آپ گاہک ہیں" - یہ کہہ کر اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے لگتا: "نہیں صاحب ہم تو آپ کو گاہک نہیں سمجھتے . . . ." پھر مجھے وہ آواز دیتا: "دیکھئے بابو یوگراج جی . . . یہ ہیں ہمارے . . . . اب کیا کہوں . . . بس گاہک کے سوا کچھ ہی سمجھ لو . . ہمارے کرم فرما . . . اور سنئے کان کھول کر، آج ان کا کام انہیں مل جانا چاہیئے . . . کیا سمجھے . . . خواہ کچھ بھی ہو۔ گورنمنٹ کالج والوں کا کام جہاں تک کیا ہے بس وہیں چھوڑ دو کوئی ضرورت نہیں اسے کرنے کی جب تک کہ آپ کا کام ختم نہ ہو جائے . . . ."

اس قسم کی چکنی چپڑی باتیں سن کر گاہک خوش ہو جاتا اور نہال چند حسب موقعہ بعض اوقات گاہک کی کمر میں ہاتھ ڈال لیتا اور بعض مرتبہ بڑے ادب سے بار بار سر تسلیم

ختم کرتا اور جی بندہ پرور . . . جی بندہ پرور کی رٹ لگائے جاتا . . . . یہ قصہ بس اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ گاہک پر وہ کچھ ایسے ڈورے ڈالتا کہ رخصت ہونے سے پہلے وہ دو چار روپے بھی دے جاتا۔

جب کبھی نہال چند کی جیب گرم ہوتی تو پھر اس کا رویہ بالکل مختلف ہوتا تھا۔ ایسے موقعہ پر جب گاہک آتا۔ نہال چند دکان کے چبوترے پر اپنی ترنگ میں آنکھیں نیم وا کیے بیٹھا ہوتا یا گنا چوسنے میں مصروف ہوتا یا سنگترے کی پھانکیں کھانے میں منہمک۔۔ گاہک آتا "ہمارا کام ہو گیا" پہلی مرتبہ سوال ہونے پر وہ عموماً چپ رہتا۔ دوبارہ سوال کیے جانے پر روکھا سا جواب دے دیتا "ابھی نہیں ہوا"

"تو پھر؟"

"بس ہو جائے گا"

"کب؟"

اس پر وہ کچھ گرم ہو کر کہتا "بس ہو ہی جائے گا۔ میں لکھ کر تو نہیں دے سکتا کہ کب ہو گا۔"

اس پر گاہک شکایتوں کے دفتر کھول دیتا۔ لیکن وہ چپ ہی رہتا۔

گاہک پوچھتا "تو پھر کب آؤں؟"

"کہہ دیا نا ۔۔ کل دل آجائیے گا۔"

"یہ ناممکن ہے مجھے آج ہی شام چاہیئے۔ واہ صاحب یہ بھی خوب رہی . . . "

اس پر وہ جھک کر کہتا "بندہ پرور! ہم بھی انسان ہیں۔ جانور یا مشین تو ہیں نہیں۔ ایک تو ہمارے پاس کام زیادہ اور پھر سبھی گاہک بہترین کام کروانا چاہتے ہیں اس

کے لئے تو کچھ وقت چاہیے۔ اُن بھاڑے کے ٹٹوؤں کی طرح نہیں کہ بس اپنا الّو سیدھا کرکے بچارے گاہک کو چلتا کیا۔"

اس پر گاہک کچھ مرعوب سا ہو کر واپس چلا جاتا۔

وہ روز کی آمدنی بلا ناغہ گھر لے جاتا اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ پس انداز کچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ جو آیا چیٹ۔ اوّل تو خود ہی بڑا چٹورا تھا۔ سارا دن مُنہ ہلاتے جاتا اور پھر گھر میں اس کا جوان بیٹا جو کالج میں پڑھتا تھا۔ نئی نویلی بہو اور آٹھ ماہ کی پوتی نوکر وغیرہ، ادھر دکان کے اخراجات علیحدہ تھے۔ تین نوکروں کی تنخواہیں۔ دکان کا کرایہ اور بیسیوں جھمیلے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ایسے کھلے خرچ کے بعد اس کے پلے کیا پڑتا ہوگا۔ ہر روز جب دکان پر آتا تو خالی جیب ——— بالکل بائبل کے اس مقولے کے مطابق کہ "اے خدا ہماری آج کی روٹی آج ہمیں دے۔" ——— مگر تھا قسمت کا دھنی۔ عام طور پر ہر روز اسے ایک اچھی خاصی رقم مل جاتی تھی۔ آمدنی کے کم و بیش ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا رویہ نہ صرف گاہکوں سے بدل جاتا تھا بلکہ گھر والوں سے برتاؤ میں بھی فرق پڑ جاتا تھا۔

ان کے گھر یلو نوکر کا معمول تھا کہ ہر روز شام کو "بڑی بی جی" یعنی بڈھے کی بہو کے حکم کے مطابق وہ دکان پر نہال چند سے یہ پوچھنے کے لئے آتا کہ رات کو کھانے کے لئے کیا چیز پکائی جائے۔

اگر اس کی جیب میں خوب سی رقم ہوتی تو دور ہی سے نوکر کو آتے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ رخساروں پر لہو جھلکنے لگتا۔ نوکر قریب پہنچتا تو پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے، وہ خود ہی ہنس کر کہتا۔ "سنا اب بے منڈو! آج تو اتنا خوش کیوں ہے بے"

نوکر ابھی تیرہ چودہ برس کا لڑکا ہی تھا لیکن بڑا چلتا پرزہ۔ نہال چند کو خوش دیکھ کر وہ خود بھی خوب دانت نکال کر ہنستا ــ "جی کچھ نہیں"۔

"ابے کچھ نہیں کے بچے جھوٹ مت بول بتا تو کوئی لمڈیا تو نہیں پھنسالی۔ اور اب تو سالے تیری چکیلی کلا بھی آ گئی ہے۔ جب وہ ننھیال گئی تھی تو سور ایسا رو! ایسا رو! . . . . کہ بابو لوگ راج جی . . . ."

اس طرح کی خوشگوار سی تمہید کے بعد وہ گھر والوں کا فرداً فرداً حال دریافت کرتا . . . اور منی! کیا کر رہی تھی منی؟"

"جی ہنس رہی تھی جب ہی تو میں آیا نا؟"

"ہنس رہی تھی ہاہا۔ ہاں تو آج کیا پکے گا رات کو؟"

"آپ ہی بتائیے"

"اجی نہیں ــ آج تو آپ ہی بتائیے"۔

منڈو اس بات پر شرما جاتا۔ بالآخر خود ہی کہتا "اچھا تو آج گوشت لے جا کیا سمجھے . . . . نرم ہو۔ تھوڑا سا پرسے کا بھی ڈلوا لینا میرے لئے۔ اور اس میں مٹر بھی ڈالنا۔ مٹر دیسی لے جانا، شملے کے نہیں۔ دیسی مٹروں میں مٹھاس زیادہ ہوتی ہے اور منی کے لئے ہارلکس کی بوتل لے جائیو . . . . ہارلکس؟ سمجھے نہیں؟ ابے ہارلکس . . . ہارلکس کہنا! لا میں تجھے لکھے دیتا ہوں . . . . اور ننھے کے لئے سنگترے"

ننھے سے مراد اس کا وہ جوان شادی شدہ لڑکا جو ایک بچی کا باپ بھی تھا۔

اس کے بعد بالائی اور بی بی کے لئے مونگ کے دہی بڑے اور پکوڑیاں۔ اور جب شام کے وقت خود گھر جاتا تو پھل اور پھولوں کے گجرے لے جاتا۔ نوکر کو

خوب چٹخارے لے لے کر سب چیزوں کے نام گنوانے کے بعد کہتا "بابو یہ گراج . . . . ارے بھائی اسے دس روپے کا ایک نوٹ تو دے دو"

میں اوپر والے کمرے میں فلمیں ڈبولپ کرنے میں مصروف ہوتا اور جب منڈو میرے پاس آتا تو میں اور نہیں تو کم از کم اس کی بی بی کی خیریت تو ضرور دریافت کر لیتا اور منڈو بھی دل کھول کر سب حالات بیان کرتا۔ اگر میں کرید کرید کر بی بی کی بابت سوالات کرتا۔ تو وہ بھی جواب دینے میں بخل نہ کرتا۔ میرے پاس پہنچ کر منڈو کا رنگ کچھ اور ہو جاتا تھا "کہو منڈو یار کیا باتیں ہو رہی تھیں لالہ جی سے"۔

پھر میں پوچھتا "تمہاری بی بی جی کیا کرتی ہیں دن بھر . . . ."

"کچھ نہیں" منڈو اپنی مسکین آواز میں جواب دیتا "بس پاؤں پھیلا کر لیٹی رہتی ہیں اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر انگڑائیاں لیتی رہتی ہیں"

اس قدر دل تڑپا دینے والا جواب سن کر میں منڈو کی طرف پیار کر دیکھتا لیکن اس کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بالکل بھیگی بلی بنا چپ چاپ کھڑا رہتا۔ اس قسم کی باتیں کرتے وقت وہ کم ہی مسکراتا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتا۔ اگر میں معمولی سی بات بھی پوچھتا تو وہ خوب تفصیل سے کل حالات بیان کرتا۔ میں پوچھتا "جب تو آنے لگا تھا۔ اس وقت بی بی جی کیا کر رہی تھیں"

"جی کچھ نہیں بس نہانے لگی تھیں"۔

"بیوقوف یہ بتا کہ وہ نہا رہی تھیں یا نہانے کے لئے تیار ہو رہی تھیں"۔

"جی کچھ نہیں اس وقت وہ انگیا پہنے آنگن میں گھوم رہی تھیں"۔

میں پھر پوچھتا "اب وہ تجھ سے شرماتی نہیں کیا۔ وہ کوئی بڑی بوڑھی تو

ہیں نہیں۔ ۔ ۔ ۔“

”جی کچھ نہیں ابھی تو ان کی عمر بہت کم ہے۔ ایک روز مجھ سے کہتی تھیں۔ وے منڈو میں تجھ سے چار پانچ برس ہی تو بڑی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ لیکن وہ مجھ سے شرماتی نہیں ہیں جب وہ چار پائی کے اوٹ میں نہاتی ہیں تو مجھ سے کہتی ہیں۔ وے منڈو! میرا تولیہ پکڑا دے وے منڈو! میری انگیا تو لائیو۔“

منڈو سیدھے سادے سوال کا جواب بھی دلچسپ انداز میں دیتا لیکن صورت بالکل معصوم اور متین بنائے رکھتا اور کہنے کا انداز بھی سرد ہوتا تھا۔

کبھی کبھی میں منڈو کو دو چار آنے انعام بھی دے دیتا۔ منڈو سمجھتا کہ یہ پیسے میری جیب سے نکلتے ہیں۔ حالانکہ یہ اسی لالہ کی جیب سے نکلتے تھے۔

جس روز نہال چند کو احساس ہوتا کہ آج آمدنی نہیں ہوئی۔ اس دن کا تماشا قابلِ دید ہوتا تھا۔ منڈو حسبِ معمول شام کے وقت آتا تھا۔ نہال چند آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتا۔ منڈو اپنا سوال دہراتا لیکن جواب ندارد۔ منڈو میز کا سہارا لے چپ چاپ کھڑا رہتا اور اس پُراسرار خاموشی میں نہال چند اپنے کام میں مصروف رہتا اور اپنی ایک مونچھ دانتوں میں چبائے جاتا۔ بالآخر آہستہ سے پوچھتا ”گھر میں دال وال نہیں۔“

”جی نہیں۔“

”اور وہ جو میں مسور کی دال لایا تھا؟“

”بہت تھوڑی سی ہے۔“

”اور وہ ماش کی؟“

"بہت ہی کم ہے۔"

"وہ چنے کی دال۔"

"تھوڑے سے دانے بچے ہیں۔"

اس پر وہ چلا کر کہتا: "ابے الو سب کو ملا کر پکا لو۔ گھلی ملی دال۔ کمبخت کچھ اپنا دماغ بھی لڑایا کر۔ ۔ ۔ ۔"

پھر منڈا سر جھکائے زمین کی طرف دیکھتا ہوا واپس چلا جاتا۔

نہال چند کو اپنے لڑکے سے جسے وہ "ننھا" کہہ کر پکارتا تھا، بہت زیادہ محبت تھی۔ "ننھا" شادی شدہ تھا، ایک بچی کا باپ تھا۔ لیکن ایک عرصے سے کالج میں بی اے کا متعلم تھا۔ کئی برس سے وہ امتحان پاس نہیں کر پایا تھا۔ بی اے پاس نہ ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ فیل ہوتا رہا ہو بلکہ اس نے کبھی امتحان ہی نہیں دیا تھا اور امتحان نہ دینے کا سبب یہ تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ جب ننھا باپ کے پاس دکان پر آتا، باپ پوچھتا "بیٹے تم لوگوں کے امتحانات کب شروع ہوں گے۔"

"جی اپریل میں۔"

"اپریل میں۔" نہال چند منہ پھیلا کر پوچھتا

"جی۔" مسکین سا جواب ملتا۔

"اپریل میں تو بہت زیادہ گرمی ہو جاتی ہے بیٹے۔"

"جی۔"

"اچھا تو بیٹا! اب کے امتحان مت دے۔ پھر دے دیں گے۔ آخر جلدی کیا ہے۔" اس کے بعد نہال چند مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا "کیوں بابو یوگ راج!

ابھی بچہ ہی تو ہے۔"

میرے پلّے سے بھلا کیا جاتا تھا میں فوراً جواب دیتا" جی اور کیا۔ ابھی تو ننھا بچہ ہے۔ کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ امتحان کا کیا ہے اور پھر اس قدر گرم موسم ...."

اس دوران میں اس کا لحیم شحیم "ننھا" سر نیچے ڈالے خاموش کھڑا رہتا۔ میری یہ بات سن کر نہال چند پھولا نہ سماتا "ہاں اور کیا .... مت دو امتحان بیٹے .... جاؤ کھیلو۔"

اس پر بھی "ننھا" اپنی جگہ کھڑا رہتا۔ نہال چند اس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہتا "بیٹے کچھ اور چاہیئے۔"

اس پر ننھا کھڑے کھڑے یونہی فرش کو پاؤں سے کرید ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنا دھڑ عجب بے ڈھنگے پن سے ہلا ہلا کر ادھر اُدھر جھومنے لگتا "جی ... یونہی ... میں بائیسکوپ جاؤں گا۔"

"بائیسکوپ جاؤ گے؟ جاؤ بیٹے ... جاؤ ... بابو یوگراج ننھے کو بائیسکوپ کے لئے پیسے دے دو۔"

"اور پتا جی" ننھا لاڈ سے منہ پھلا کر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا ...

"میرے ساتھ میرے چار دوست بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں بھی لے چلو ...."

جتنے روپوں کی ضرورت ہوتی۔ نہال چند اسے دے دیتا۔ اس طرح اس کا بے کار لڑکا دوسرے تیسرے روز دکان پر آجاتا تھا۔ وہ درحقیقت بڑا لاڈلا اور سیدھا سادا نوجوان تھا ۔ اگر کبھی وہ دھوپ میں دکان پر چلا آتے تو چاہے سردیوں ہی کا موسم کیوں نہ ہو۔ نہال چند ہمیشہ اسے خفا ہوتا کہ وہ دھوپ میں اتنی دُور کیوں

چلا آیا۔

نہال چند خود بھی کھانے پینے کا شوقین تھا۔ باہر سے گھوم پھر کر دکان پر واپس آتے ہی مجھ سے کہتا۔ "بابو یوگ راج کہو کچھ پیسے ویسے آئے یا نہیں"۔ اور پھر تجوری میں سے نکال کر انہیں گننے لگتا اور گنتے گنتے میری آنکھ بچا کر دو تین روپے اڑا لیتا . . . . اس بارے میں وہ مجھ سے نہ معلوم کیوں ڈرتا تھا۔ روپے اڑا لینے کے بعد وہ ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرتا اور پھر کھانستا ہوا دکان کے باہر والے کمرے میں جا کھڑا ہوتا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھل والے کی آواز آتی "بینگو والا۔ بجوری بینگو والا" بھلا نہال چند کو صبر کہاں۔ کیا مجال جو کوئی بھی خوانچے والا ادھر سے گزرے اور نہال چند کی رال نہ ٹپکے۔ چنانچہ وہ دن بھر پھل، آئس کریم، آلو کی ٹکیاں اور پاپڑ پکوڑیاں کھاتا رہتا۔ لیکن کھاتے وقت مجھے ضرور بلا لیتا۔

گاہکوں کے حساب کتاب کا یہ حال تھا کہ رکی ہوئی رقمیں دروازے پر یا کرسی کے بازو پر یا دیوار پر لکھ لیتا تھا۔ زبانی بھی اسی طرح حساب یاد رکھتا تھا کہ فلاں بادامی رنگ کی پگڑی والے سردار سے تین روپے سوا چار آنے لینے ہیں۔ فلاں [illegible] رنگ کے جمپر والی کرسٹی سے دو روپے اور فلاں مکھی کی سی مونچھوں والے آدمی سے دو روپے سات آنے اور مکتی فوج والی میم سے . . . .

مکتی فوج والی میم سے اسے بہت انس تھا۔ وہ میم عموماً دکان پر آیا کرتی تھی اور [illegible] قد ، صورت اور چال ڈھال والی عورت تھی لیکن عمر کچھ زیادہ ہو چکی تھی۔ جسم میں [illegible] پیدا ہو گیا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی آنکھیں بڑی رسیلی تھی۔ فراخ سینے میں ابھی [illegible] باقی تھا اور قد و قامت میں نہال چند سے چار انگل بڑی ہی [illegible]

اس کے سامنے بچھا جاتا تھا۔ خوب لہک لہک کر اور بعض اوقات ٹک ٹک کر باتیں
کیئے جاتا۔ جس وقت میم صاحب دکان میں داخل ہوتی وہ سب گاہکوں کو میرے سپرد
کر کے خود اس سے باتیں کرنے لگتا۔ یورپین لوگ یوں بھی ہنس کر بات چیت کرنا
معیوب نہیں سمجھتے اور پھر تبلیغ کرنے والے عوام میں خوب گھل مل جانا اپنے مقصد
کے لیئے مفید بھی سمجھتے ہیں۔ اس لیئے وہ میم بھی ضرورت سے زیادہ دکان میں ٹھیری
رہتی۔ شاید نہال چند نے اسے بھی کوئی جھانسا دے رکھا ہو۔ ورنہ اس کی آمد کی سی
صورت تو ایسی نہ تھی کہ میم اس پر ریجھ جاتی۔

اس طرح دن بڑے آرام سے گزرتے رہے۔ نہال چند نے دکان کا سیاہ و
سفید میرے سپرد کر رکھا تھا اور میں اس کے اعتماد کا ناجائز حد تک فائدہ نہیں
اٹھاتا تھا۔ البتہ پان سگریٹ کے لیئے چند آنے ادھر ادھر کر دینے میں حرج نہیں
نہیں سمجھتا تھا۔ جس روز چاہتا چھٹی بھی منا لیتا تھا۔ ایک مرتبہ جب نہال چند دن کے
گیارہ بجے کے قریب دکان سے باہر جانے لگا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ دوپہر
کو دو بجے سے پہلے پہلے واپس پہنچ جائے۔ مجھے خود چند دوستوں کے ساتھ سینما کا
میٹنی شو دیکھنے کے لیئے جانا تھا۔ میں نے بار بار تاکید کی کہ وہ ضرور وقت پر واپس
پہنچ جائے تاکہ میرے دوست بائیسکوپ پر میرا انتظار ہی کرتے نہ رہ جائیں۔ اس
نے بھی مجھے یقین دلایا کہ میں ضرور واپس چلا آؤں گا۔ چنانچہ میں مطمئن ہو گیا لیکن
حضرت۔ نہال کہاں پہنچنے والے تھے۔ ہر گھڑی یہی گمان ہوتا تھا کہ شاید اب آجائے
اب آجائے لیکن اسے آنا تھا نہ آیا۔ یہاں تک کہ میں مایوس ہو گیا اور پھر آیا، تو
سات بجے کے قریب، جبکہ دوسرے شو کا وقت بھی گزر چکا تھا مجھے بے حد کوفت

ہوئی۔ جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ لیکن وہ مجھ سے بات کیے بغیر دکان کے چبوترے
پر جا بیٹھا۔ ادھر سے کابلی چنوں والا گزرا تو اس نے اسے بلایا اور مجھے بھی آواز دی۔
میں نے انکار کر دیا۔ لیکن جب اس نے بہت اصرار کیا تو میں اس کے پاس چلا گیا۔
اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میرا منہ مارے غصہ کے پھول رہا تھا
چنے کھانے کے بعد اس نے بڑی مسکین آواز میں کہا "بیٹا یوگ راج . . . " وہ
وہ بزرگ تھا کبھی بیٹا بھی کہہ لیتا تھا . . . "سنو بھائی اب تمہیں اصل بات سناتا
ہوں۔ آج میں یونہی گھومتا ہوا لارنس گارڈن چلا گیا۔ وہاں ایک خاموش گوشے
میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔" یہ کہہ کر اس نے ہلکی سی ایک سرد آہ بھری . . . "جانتے
ہو کیا ہوا۔ بس مجھ پہ ایک عجب سی کیفیت طاری ہو گئی . . . میں سوچنے لگا۔ یہ
دنیا کیا ہے۔ یہ انسان کیا ہے۔ یہ پرماتما کیا ہے۔ یہ خاک کا پتلا کیوں بنایا گیا ہے۔
اس دنیا میں آخر کسی کو رہنا تو ہے نہیں . . . اُف کس قدر تنہائی تھی وہاں پر۔
مکمل خاموشی۔ میں اس قسم کی باتیں سوچنے لگا۔ یہاں تک کہ میری آنکھوں میں آنسو
آگئے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک اور گہری سانس لے کر سرد آہ بھری۔ اس کی یہ حالت
دیکھ کر میرا جی پسیجا اور جب میں نے شام کے دھندلکے میں اس کی بے نور آنکھوں
جھریوں والے چہرے اور نیچے کو لٹکی ہوئی سفید سفید مونچھوں کی طرف دیکھا تو میں نے
ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کی مسکین صورت میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی اور دنیا کی
ناپائیداری کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں نے سوچا بچارے بوڑھے کو
اپنے گزرے ہوئے دن اور کھوئی ہوئی جوانی کی یاد آگئی ہوگی۔ اس قسم کی باتیں
سوچ کر میرے دل سے نہ صرف ساری کدورت ہو گئی بلکہ میں الٹا اسی کو تسلی دینے

لگا۔ زندگی کے فلسفے پر جو تھوڑا بہت میں کہہ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ وہ غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ بس گاہے گاہے ایک ہلکی سی سرد آہ کھینچ کر رہ جاتا۔

دوسرے روز مجھے ایک اور شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت اس روز سارا دن گھوڑ دوڑ کے میدان میں بازی لگاتے اور کسی فوج کی میم صاحب کے ساتھ شام تک اِدھر اُدھر سیر گشت کرتے اور چہکتے رہے تھے۔ مجھے یقین نہ آیا تو وہ شخص کہنے لگا کہ میں نے نہال چند کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور میں یہ اس کے مُنہ پر کہنے کو تیار ہوں۔ میں دکان جا رہا تھا، وہ آدمی بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ اسے بھی اسی رستے سے گزرنا تھا۔ نہال چند دور سے چبوترے پر بیٹھا دکھائی دیا۔ ہم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھا تو دکان کے اندر گھس گیا۔ خیر وہ شخص تو آگے بڑھ گیا۔ اور میں دکان کے اندر چلا گیا۔ میں نے ایک بیگڈیو کو سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"لالہ جی میں نے آپ کی ایک شکایت سُنی ہے۔"

"کیا؟"

میں نے جواب دینے کے لئے اس کی طرف دیکھا تو وہ تنکے سے دانت کریدتے ہوئے شوخ انداز سے کچھ اس طرح مسکرایا کہ اور کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

میں تین چار ماہ تک وہاں ملازم رہا۔ آخر میں حسبِ عادت اس ملازمت سے بھی تنگ آ گیا۔ ایک روز کسی چھوٹی سی بات پر بگڑ کر اپنے گھر جا بیٹھا اور دوسرے روز دکان پر بھی نہ گیا۔

[illegible] ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ اس [illegible] نہال چند سے

پوچھا کہ بابو یوگراج کہاں ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں نے اسے نکال دیا ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑا طیش آیا۔ فوراً وکیل سے مشورہ کرکے میں نے اسے نوٹس بھیج دیا کہ چونکہ تم نے مجھے نکال دیا ہے اور اس بات کی شہادت بھی موجود ہے اس لئے اب تم اقرارنامے کے مطابق نہ صرف میری پچھلے مہینے کی تنخواہ دو بلکہ ایک ماہ کی زائد تنخواہ بھی ادا کرو۔

نوٹس ملتے ہی اس نے فوراً کل رقم مجھے بھیج دی۔ اس کے بعد ایک روز بازار میں ملا تو کہنے لگا کہ میں نے کب کہا تھا کہ یوگراج کو نکال دیا ہے۔ میں نے کہا "گواہ پیش کروں؟" اس پر وہ بڑے پیارے انداز میں مسکرایا۔ ۔ "اور اگر میں نے کہا بھی ہو تو کیا تم میرے بیٹے نہیں ہو"

اس کی مسکراہٹ اور بوڑھی آنکھوں کی جھپک میں عجب دلکشی تھی۔ میں نے کہا "اب ساری تنخواہ کون واپس کرے"۔ وہ فوراً بولا "تو نصف پر ہی مان جاؤ"۔

میں نے آدھی تنخواہ کے روپے اسے واپس دے دیئے۔

بھائی صاحب نے مجھے زیادہ عرصے تک بیکار نہ بیٹھنے دیا۔ بمبئی میں کاروبار کی صورت نکل آئی۔ مجھے بھی بمبئی دیکھنے کی تمنا تھی۔ فوراً آمادہ ہو گیا۔ بھائی صاحب نشیب و فراز سمجھا کر دفتر کو چل دیئے۔ میں اسٹیشن پر پہنچا۔

وہاں مجھے نہال چند دکھائی دیا۔ نہ جانے اسے کیونکر معلوم ہو گیا کہ میں جا رہا ہوں۔ مجھے الوداع کہنے کے لئے پلیٹ فارم پر آن پہنچا۔ جب میں گاڑی پر سوار ہو گیا اور گارڈ نے سیٹی بجا دی تو اس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو اس میں آلو کے پراٹھے ہیں۔ ۔ ۔ اچار بھی ہے اور پیاز بھی۔ بھوک لگے گی

تو راستے میں کھا لینا۔"

میں نے پوٹلی لے لی۔ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ چل دی۔ میں نے پوٹلی ٹٹولتے ہوئے شرارت سے کہا۔ "کیا واقعی یہ پراٹھے ہماری بھابی کے نازک ہاتھوں کے پکے ہوتے ہیں؟"

یہ سن کر اس نے پاؤں زمین پر مار کر کہا۔ "کھڑا تو رہ . . . پاجی . . ." اور پھر اس کے لبوں پر وہی پرانی شوخ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

گاڑی بڑھتی چلی جارہی تھی اور سفید شلوار اور طرّے دار پگڑی میں گُلّا اسانہال جنید الوداعی رومال ہلا رہا تھا۔

کلی کی فریاد

رات آنے کو تھی۔
سکھیوں کے نقرئی قہقہے فضا میں جلترنگ کے مانند گونج رہے تھے اور سینہہ اپنے دونوں گھٹنوں کو سڈول بازوؤں میں جکڑے، ان میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ نازک شاخ پر کھلے ہوئے مہکتے لہکتے ہوئے خوش رنگ پھولوں کے مانند سہیلیاں کھلکھلا کر آپس میں چہل کر رہی تھیں۔ ان کی محفل میں سینہہ سب سے الگ تھلگ، گُم صُم اور غافل دکھائی دیتی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ ہر بات سن رہی تھی — اس کا دل سطحِ آب پر لرزاں کنول کی طرح ہچکولے لے رہا تھا اور اس کے جسم کا انگ انگ ساجن ملن کے گیت گا رہا تھا۔

بڑی بڑی سیپیوں کے سے پپوٹوں تلے اس کی سیاہ پتلیاں گویا انگوری شراب کی چادر تلے ہر شے کو خوابناک کیفیت میں ڈوب کر دیکھ رہی تھیں . . . خرگوش

کے بچوں کے مانند اُجلے اجلے اس کے پاؤں، آمدِ شباب کے باعث گدرائے ہوئے ٹخنے اور ٹخنوں میں سے گلابی بادلوں کی طرح جھوم کر اٹھتی ہوئی اس کی پنڈلیاں ... اور وہ جھینپ گئی... اس کا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا... اس نے اور زیادہ جھینپ کر آنکھیں موند لیں

خوشگوار لمحہ قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ اس لمحے کا اس کے مجبور دل کو مدت سے انتظار تھا۔

اس نے آنکھیں بند کیں۔ اُس نے دیکھا کہ عرشِ بریں کا ایک ایسا گوشہ ہے جہاں ایک پُروقار پہاڑ کی طویل و عریض ڈھلان پہ لہلہاتی گھاس کی سبز چادر بچھی ہے۔ نور کے درختوں کی شاخیں فضا کی رفعتوں میں گم ہو رہی ہیں۔ رنگ رنگ کے پھول کھلا رہے ہیں اور وہ تن تنہا ان رنگین پیڑوں کی چھاؤں تلے کھڑی ہے۔ اس کے بدن کے گرد ایک نورین چادر لپٹی ہوئی ہے۔ جس میں سے اُس کا بدن جگمگا رہا ہے اور جسم کے روئیں روئیں سے فضا میں پرواز کر جانے کی امنگ پیدا ہوئی۔ لیکن بارِ حسن سے بوجھل اُس کا نازک بدن اڑان کے قابل کہاں تھا۔ البتہ جب وہ قدم قدم چلنے لگی تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کا ہر قدم ایک البیلا رقص پیش کر رہا ہے۔

اس سُبک رفتاری سے نہ جانے وہ کہاں سے کہاں نکل گئی۔ دفعتہً آہٹ پاکر اس کے پاؤں بوجھل ہو کر رُک گئے... اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی پتلیاں حیرت و خوف کے ملے جلے جذبات کے تحت دائیں بائیں، اوپر تلے گھومنے لگیں معاً اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب لیا اور لمحہ بھر کو بُت بن کر کھڑی ہو گئی۔

مرد! --- ضرور کوئی مرد اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی اور پھر دفعتہً وحشی ہرنی کے مانند قلانچ بھر کر بھاگ نکلی۔ اس کا بدن اس قدر

سبک تھا کہ وہ ڈھلان سے آگے ہرے بھرے کھیتوں میں فراٹے بھرنے لگی۔

وہ خوفزدہ ضرور تھی لیکن بے حد خوش ۔۔۔ وہ اتنی آسانی کے ساتھ اس قدر تیزی سے بھاگ سکتی تھی۔ اس رفتار سے تو وہ بڑے مزے میں عرش کے دوسرے سرے تک بھاگی چلی جائے گی اور وہ لنگڑا مرد اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے گا . . . لیکن وہ لنگڑا لنگڑا قدم سے قدم ملائے اس کے عین پیچھے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا . . . دھما دھم، دھما دھم . . . اس کے قدم آگے بڑھ رہے تھے اور کبھی تو وہ یوں محسوس کرنے لگتی ہے جیسے وہ ہاتھ بڑھا کر بڑی آسانی سے اسے دبوچ سکتا ہے لیکن شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کرنے سے گریز کر رہا تھا جیسے وہ مسکرا کر کہہ رہا ہو "بھاگ لے جتنا بھاگنا چاہے۔ آخر کار تھک کر تو خود بخود میری آغوشِ محبت میں آن گرے گی" . . .

سچ مچ وہ تکان محسوس کرنے لگی تھی۔ کھیتوں کے سلسلے پار کر کے اب وہ ایک گھنے جنگل میں گھس آئے تھے۔ وہاں کے پیڑ کچھ اس قسم کی مہک پھیلا رہے تھے کہ انسان پر خواہ مخواہ غنودگی طاری ہونے لگتی تھی . . . وہ تھک کر نڈھال سی ہو گئی۔ وہ بہت دور بھاگ چکی تھی۔ زخمی مرغابی کی طرح کبھی کسی درخت کے پیچھے چھپ جاتی اور کبھی کسی جھاڑی کی اوٹ میں جا چھپتی لیکن جبھی نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

اس طرح بھاگتے بھاگتے اس نے سوچا کہ وہ ذرا ہمت سے کام لے کر تیزی سے بھاگ نکلے اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر کسی درخت کی اوٹ میں چھپ جائے تو ایسے گھنے جنگل میں وہ مرد اسے کیوں کر پا سکے گا۔

یہ سوچ کر اس نے ایک بار پھر ہمت کی اور پھرتی سے بھاگ نکلی۔ اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ سچ مچ اب اس کے پیچھے قدموں کی چاپ ختم ہو چکی تھی۔ وہ ایک

بہت بڑے درخت کے نیلگوں تنے سے بغلگیر ہو کر ہانپنے لگی۔ وہ چھپنے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اس بات پہ وہ خوش ہو کہ رنجیدہ۔

دم بھر کو وہ بالکل ساکت کھڑی رہی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا ذہن ہر خیال سے خالی ہے۔ پھر معاً پیڑ کے تنے سے لپٹے ہوئے اس کے بازو میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔۔۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی انگلی سے انگلی چھوا دی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہو کر رہ گئی۔ جب اس نے بڑی آہستگی کے ساتھ ہاتھ کھینچنا شروع کیا تو دیکھا کہ دوسرا مردانہ ہاتھ اس کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ دیکھا کہ باریک کپڑا اس کے بدن سے الگ ہو کر نیچے گر پڑا ہے اور اس کا آنچل اس کے بازو سے الجھا ہوا ہے۔ اپنے آپ کو اس حالت میں پا کر وہ بڑی شرمسار تھی لیکن اس کے بدن میں حرکت کرنے کی سکت تک باقی نہیں تھی۔

کن انکھیوں سے اس نے تعاقب کرنے والے مرد کی جانب دیکھا۔۔۔

یہی وہ چہرہ تھا جسے ایک بار مردوں کے ہجوم میں دیکھ کر اس نے اپنا لیا تھا۔

اسے پہلی نظر ہی میں محبت نہیں ہو گئی تھی بلکہ اسکول آتے جاتے وہ اس چہرے کو منتظر پاتی تھی۔ پہلے تو اسے خیال تک نہیں آیا کہ وہ اسی کا انتظار کیا کرتا ہے۔ لیکن جب اسے یہ احساس ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ کچھ ایسی مانوس ہوئی کہ اگر کسی روز وہ دکھائی نہ دیتا تو اسے الجھن ہونے لگتی۔ بعد ازاں وہ سوچنے لگی کہ وہ اس سے کچھ کہتا کیوں نہیں۔ اس پر وہ اُداس سی رہنے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں اس سے منت تمام کہا کہ اگر تم مجھ سے دو باتیں کر لو گے تو میں ہمیشہ کے لئے

تمہاری ہو جاؤں گی۔ . . لیکن جس روز بیتھ نے بات کرنی چاہی۔ اس روز اس کی زبان گنگ ہو گئی اور وہ ہانپتی کانپتی گھر جا پہنچی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں۔

جب اس کی شادی کی بات چیت شروع ہوئی تو اس نے اپنی پھوپھی کو راز داں بنایا۔

پھوپھی ان پڑھ ضرور تھی لیکن زمانے کی ہوا کو خوب سمجھتی تھی۔ اس نے خود لڑکے کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ایک روز اپنے بھائی یعنی سینبھ کے پتا سے ٹکر لے لی۔

سینبھ کے پتا جی کسی تھیٹریکل کمپنی کے پارسی مالک کے مانند دکھائی دیتے تھے حالانکہ اُن کا ناٹک ڈرامے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن ان کی باتیں حرکات و سکنات تھیٹر کے ایکٹروں سے ملتی جلتی تھیں۔ آواز گرجدار اور لہجے سے مبالغہ آمیز ڈرامائیت تھا۔ بہن کی بات سن کر گرجے۔

"وہ کل کی چھوکری کیا جانے ان باتوں کو؟ کیا اب وہ ہم سے زیادہ سمجھدار ہو گئی ہے کہ کیا وہ بھول گئی ہے کہ ان باتوں کو سمجھنے اور اس بارے میں فیصلہ کرنے والے اس کے والدین ابھی زندہ و سلامت ہیں . . . کیا . . . ؟"

ہوا میں ہاتھ اچھال اچھال کر تھیٹریکل انداز میں نہ جانے وہ اور کیا کیا کہتا کہ بڑی بہن روک کر بولی:۔

"اے بس رہنے دو۔ تم تو یوں چلانے لگتے ہو جیسے کہیں لام لگ گئی ہو۔ باتیں دنیا بھر کی سن لو لیکن زمانے کی ہوا کو نہیں سمجھتے۔"

اس پر سینبھ کے پتا نے بہن کی جانب انگلی کا اشارہ کچھ اس انداز سے کیا جیسے

بھالا تان کر مارنے کو ہے

"تو بڑھیا!... تو سٹھیا گئی ہے۔ میں؟... میں، جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، زمانے کی ہوا کو نہیں سمجھتا.... اور تو؟... تو گھر بیٹھے زمانے کی ہوا کو سمجھنے لگی ہے؟

بسمان تیری قدرت سبحان تیرے کھیل
چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل

باوجودیکہ بہن کو دنیا کھلے بندوں "ہڈی" کے نام سے پکارتی تھی لیکن بھائی کے منہ سے چھچھوندر والی بات سن کر وہ آپے سے باہر ہو گئی اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر اور ٹھینگا دکھا کر بولی

"بھاڑ میں جائے تمہاری بیت بازی۔ صورت تو دیکھو گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے کی۔ آج تو مجھے چھچھوندر بنا کر چھپا چھڑا رہے ہو لیکن یاد رکھو وہ دن دور نہیں جب خود بھی نکو ہو جاؤ گے۔"

اس پر بھائی ایک دم پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے کی دیوار کے قریب پہنچ کر اس انداز سے رُکا جیسے اگر آگے دیوار نہ ہوتی تو وہ ابد تک آگے بڑھتا چلا جاتا۔ وہاں اس نے کندھوں کو جھٹک دے کر ہلکے ہلکے دو تین گھونسے دیوار پر مارے اور بہن سے آنکھ ملائے بغیر بولا۔

"اچھا وہ ہے کون؟"

"آدمی ہے اور کون۔" بہن نے جھٹک کر جواب دیا۔

بھائی نے بے صبری سے پتلیاں گھما کر آسمان کی جانب دیکھا اور بولا۔

"شکر ہے، شکر ہے، انسان ہے گھوڑا یا گدھا نہیں"۔

کمرے میں قدرے سکوت طاری رہا

"اس کا نام؟"

"پریم"۔

"آہا۔

پریم کا ساگر، پریم کی نیّا
پریم کے چپّو، پریم کھویّا

ہاں تو کام؟"

"نوکری"۔

"کیسی نوکری؟"

"سرکاری"۔

"کلرک ہوگا؟"

"ہاں"۔

"میں پہلے ہی سے جانتا تھا"۔

"کیا کہنے"۔

"باپ، کیا کرتا ہے؟"

"باپ نہیں ہے"۔

"ماں؟"

"ماں بھی نہیں ہے"۔

"گویا پریم ہی پریم ہے"۔

"لڑکا ہیرا ہے ہیرا۔"

"اجی چھوڑو۔"

"وہ مقابلے کے امتحان میں پاس ہو گیا ہے۔ اب بڑی ترقی پائے گا۔"

"امتحان کیسا؟"

"اب میں یہ کیا جانوں۔"

"بڑھیا دیکھ کر بے وقوف بنایا ہے کسی نے۔"

یہ سُن کر بہن ہاتھ کا پنجہ دکھاتے ہوئے بولی

"دیکھو بھیا! مانا تم سیانے اور سمجھ دار ہو، لیکن میں تمہیں ایک نصیحت کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ ہے کہ چاہے دنیا میں انسان کے لئے ہوشیار اور چالاک بننا کتنا بھی ضروری کیوں نہ ہو لیکن پھر بھی زیادہ چالاک بننے سے اُلٹا نقصان ہوتا ہے . . ."

اس پُرجس انداز سے سینہ کا پتا سینہ پھُلا کر غرّایا اور ڈکرایا۔ اس کی نقل اتارنے میں سینہ کی چہیتی سہیلی شیاما کو کمال حاصل تھا۔ چنانچہ وہ بڑے مزے مزے میں ان باتوں کو دوہرا رہی تھی اور سکھیوں کی محفل میں اس کی نقرئی آواز گونج رہی تھی۔

شیاما کا رنگ سانولا تھا اور خدوخال گوارا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی شخصیت میں بلا کی دلکشی تھی۔ وہ پھلجھڑی کی طرح ناچتی کودتی مندرجہ بالا گفتگو دہرا رہی تھی اور باقی لڑکیاں مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر ہی جا رہی تھیں۔

"اچھی شیاما! بتاؤ پھر کیا ہوا؟" ایک سہیلی نے اس سے دریافت کیا۔

شیاما اپنی دو لمبی چوٹیاں لہرا کر دو قدم پیچھے ہٹی اور اس نے آنکھیں مٹکا کر تالی کیا

تو ساری سہیلیاں اشتیاق سے پوچھنے لگیں "ہاں ہاں اچھی شیاما! کہونا۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"

اس پر شیاما ہنسی اور اس کے پلکھے سے گال تمتما اُٹھے "پھر؟ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر پِدّی نے پتے کو کر دیا چت۔"

شریر شیاما نے ہاتھ سے بھاؤ بتا کر اس انداز سے یہ بات کہی کہ محفل میں ندامت کا شور مچ گیا اور پھر قہقہوں کا شور مسلسل نغمہ بن گیا۔

صرف سینہہ سکھیوں کی ان خوش گپیوں سے بہت دور تھی۔ وہ اب بھی پیڑ کے نیلگوں تنے سے لگی کھڑی تھی۔ ساجن کے چہرے کو ایک بار دیکھ کر اسے پھر نظر ملانے کی جرأت نہیں ہوسکی۔ اس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے تھے۔ اس کا ذہن لمحہ بھر کو مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن جب ذہن سوچنے کے قابل ہوا تو وہ عجیب تذبذب میں پڑ گئی۔ آخر وہ ایسی حالت میں پریتم کے قابو میں کیسے آگئی۔ کتنی بُری بات ہے۔ ایک نظر پھر اپنے بدن پر ڈالی اس نے آنکھیں موندلیں۔

"سینہہ" بالکل نئی آواز میں اپنا نام سن کر اس کا بدن تھرتھرا گیا۔

"سینہہ" پھر آواز آئی "تم مجھ سے پرے بھاگ رہی ہو۔ تم مجھ سے دور ہٹ رہی ہو میں بہت دکھی ہوں۔ ۔ میں بے حد پریشان ہوں۔"

نہیں نہیں۔ ۔ ۔ سینہہ نے دل ہی دل میں کہا اور پلٹ کر پریتم کے گلے سے لپٹ گئی۔

معاً "برات آگئی، برات آگئی" کا شور بلند ہوا۔ وہ چونکی اور دیکھا کہ اس کی سہیلیاں

دولہا دیکھنے کے اشتیاق میں ایک دوسرے کے اوپر گرتی پڑتی بھاگی جارہی تھیں۔ ہائے
اس کی کتنی خواہش تھی کہ وہ بھی اپنے پیارے کو گھوڑی پہ سوار دیکھ سکتی۔۔۔۔

باجوں کا شور اور بھی قریب سنائی دینے لگا۔ برات دم بدم بڑھتی آرہی تھی۔

سینہ بالکل تنہا بیٹھی تھی

معاً چند آوازیں سنائی دیں۔

"دولہا تو کوئی اور آدمی ہے۔"

جب پڑوسی نے بھائی سے کہا:

"تم نے بڑا دھوکا دیا ہمیں۔ ہائے اب نہ جانے معصوم لڑکی کیا کرے گی۔"

تو بڈھے نے شرارت سے گھنی مونچھوں کو جنبش دے کر جواب دیا۔

"کرے گی کیا؟ —— رانی بن کر راج کرے گی۔"

سینہ نے نازک کلیوں کے مانند اپنے نیم وا ہونٹوں کو جن میں سے موتی جھلک رہے
تھے آنسو پی جانے کی ناکام کوشش میں زور سے بھینچ کر بند کر لیا۔

تین چور

سامنے کھیتوں میں اونچی سی جگہ پر جسے وہ "ٹبہ" کہتے تھے، کوئی گدھا گھومتا پھرتا آپہنچا اور لگا زور زور سے ہینگنے۔ اُس کی آواز نے گویا گھڑی کے الارم کا کام کیا اور پھلیل سنگھ کی آنکھ کھل گئی۔

ابھی تڑکا ہی تھا اور پھلیل سنگھ سویرے اٹھنے کا عادی نہیں تھا۔ لیکن آج چونکہ ومدمے کا میلہ تھا، اس لئے وہ جاگ اٹھا۔ ورنہ گدھے کا ہینگنا کیا، اگر ایک چھوڑ دس گدھے اس کو روندتے ہوئے گزر جائیں تو بھی اُس کی نیند میں خلل نہ پیدا ہو۔

اٹھ کر اس نے پہلے مُندی مُندی آنکھوں سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دودھ کے کٹورے میں ڈوبتے ہوئے بتاشوں کی طرح ابھی چند تارے آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور چپ چاپ کھڑے ہوئے

درختوں پر پھیلتی ہوئی مدھم روشنی کس قدر دلکش دکھائی دیتی تھی اور پھر رات کی پُرسکون اور تکان زدہ فضا میں سے سحر کے سوتے پھوٹے پڑتے تھے پھلیل سنگھ کے لئے یہ ایک نئی کیفیت ہی نہ تھی لیکن حقیقت یہ تھی بعض لوگ اس وقت بھی کھیتوں کو جا چکے تھے۔

پھلیل سنگھ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، اگرچہ قد و قامت میں چھوٹا نہیں تھا۔ بائیس برس کی عمر تھی۔ ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ کام کچھ نہیں کرتا تھا مگر کھانے میں سب سے آگے۔ بڑے بھائی کبھی کبھی بڑبڑاتے ضرور تھے۔ لیکن والدین کی موجودگی میں ان کا کچھ بس بھی نہیں چلتا تھا۔ اب جو پھلیل سنگھ جاگا تو اس نے اٹھتے ہی بازو پھیلا کر اینڈتے ہوئے ایک جمائی لی اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے رانیں سہلاتا ہوا ٹخنوں تک لے گیا۔

یوں تو روز بے فکری ہی میں گزرتا تھا لیکن آج اسے قطعاً کوئی پریشانی نہ تھی۔ چہرے سے نہ صرف بے فکری ٹپکتی تھی بلکہ ایک روحانی سرور بھی۔ کیونکہ آج کا دن کہیں سال بھر کے بعد آتا تھا اور ہر شخص کو اعلانیہ خوشیاں منانے کا حق تھا، کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی پر جو اس وقت خشک گھاس کے مانند محسوس ہو رہی تھی، اس نے ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچنا شروع کیا کہ آخر وہ انجانے طور پر اس قدر خوش کیوں تھا ___ تھوڑی دیر بعد اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ دو آنکھیں چمک اٹھیں . . . . پریتو سسرال سے واپس آگئی تھی۔ شادی سے پہلے دونوں کی گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ بات کچھ اڑ نکلی تو پریتم کور کے والدین نے

اس کی شادی کر دی۔ اس بات پر پھلیل سنگھ بہت تلملایا۔ لیکن پریتو نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا کہ میں سسرال جا کر وہیں کی تو نہیں ہو جاؤں گی، میکے بھی آیا کروں گی اور کبھی کبھار تم بھی میرے سسرال پہنچ جایا کرنا۔ پریتو منہ بولتا ہاتھ پاؤں کی ایک بے باک لڑکی تھی۔ چھوٹی موٹی تکلیفوں سے پریشان نہیں ہوتی تھی اس کی اس قسم کی باتوں سے پھلیل سنگھ کی ڈھارس بندھ گئی۔ ورنہ اس نے دو چار کے سر اتار دیئے ہوتے۔ اگر سچ مچ وہ اس قسم کی حرکت کر بیٹھتا تو ان کے میل جول کی افواہ کی تصدیق ہو جاتی لیکن پریتو چاہتی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ چنانچہ اس نے لاٹھی نہیں ٹوٹنے دی۔

جب پریتو پہلی بار سسرال سے واپس آئی تھی تو خوب گلے سے لپٹ کر روئی تھی لیکن اب کے وہ کچھ کترا رہی تھی۔ پھلیل سنگھ نے کہہ دیا کہ دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے . . . سردار کپوڑا سنگھ کا سر گلیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرے۔

پھلیل سنگھ اب بات بات میں لوگوں کو دھمکیاں دیا کرتا تھا۔ ڈاکوؤں اور خونیوں میں تو اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا ہی، اب اس نے خود بھی کچھ سر نکال لیا تھا۔ پھر جب امر سنگھ اور جگیر سنگھ جیسے شہدے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگیں تو اور کسی کی کیا مجال تھی کہ دم مار سکے۔

پریتو نے جب اس کی دھمکی سنی تو لگی اسے پچکارنے۔ ادھر پریتو کی باہیں اس کی گردن میں حمائل ہوئیں۔ ادھر سردار پھلیل سنگھ فوراً پگھل گئے۔ تھپکیاں دینے لگے اور کہا کہ میں تو یونہی دل لگی کر رہا تھا۔

پھلیل سنگھ نے پوچھا "کہو میلے چلو گی؟"

"ہاں — تم تو جاؤ گے ہی"۔

وہاں — اور راستے میں ملاقات بھی رہے گی"۔

"میرے لئے کیا لاؤ گے؟" . . . جیسا کہ ہر عورت کا قاعدہ ہے۔ مرد سے ضرور پوچھتی ہے کہ میرے لئے کیا لاؤ گے۔

ان باتوں کے تصور سے چھبیل سنگھ کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ اُس کا جوڑا ڈھیلا ہو کر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ پگڑی ٹخنوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ وہ خلا میں یونہی دیکھ دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا اور نہ معلوم وہ کب تک اس کیفیت میں غرق رہتا۔ مگر اس کے لنگوٹیئے دوست امر سنگھ اور جگیر سنگھ بھی آ پہنچے۔ تاڑ کے درخت کے مانند لمبے تڑنگے۔ سانہنیوں کے شکاری کتوں کی طرح چوکنے۔

آتے ہی انہوں نے للکار کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ آج میلے کا دن تھا۔ اور چھبیل سنگھ گدھے بیچ کر سویا ہوا نہیں تھا تو کم از کم لیٹا تو تھا۔ دوستوں نے آتے ہی چارپائی اُلٹ دی۔ اس نے ڈھیلی ڈھالی پگڑی سر پہ لپیٹی اور تینوں گاؤں کی جانب چل دیئے۔

اودھر سورج طلوع ہوا۔ ادھر گاؤں میں گہما گہمی شروع ہو گئی۔ آج وہ ہر روز کی سست رفتار زندگی مفقود تھی۔ بلکہ بچے بچے کو گویا پر لگ گئے تھے۔ بڑے بوڑھوں کو گھر پر ہی ٹکے رہنا تھا۔ لیکن نوجوانوں کے اُمنگ بھرے دلوں کو چین کہاں۔ ایک جانب دوشیزاؤں نے کاجل کنگھی سنبھالی تو دوسری طرف نوجوانوں نے بھی ریشمی تہبند لہرا دیئے۔ ترچھے بانکے نوجوان اپنی اپنی اڑیل سانڈنیوں یا صبا رفتار گھوڑوں پر سوار، شملے اڑاتے گاؤں کے گرد چکر کاٹنے لگے۔

چھلیل سنگھ نے آج خاص طور پر آئینہ سامنے رکھ کر پگڑی باندھی، کھدر کی دودھیا قمیص پر مخمل کی واسکٹ اور نیچے سلک کا تہبند، پاؤں میں پشاوری جوتا، ہاتھ میں پیتل کے تاروں سے بندھی ہوئی لمبی اور مضبوط لاٹھی۔

گاؤں سے باہر آکر نوجوان ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے اور پھر پھبتیاں کس کس کر ایک دوسرے کا مذاق اڑانے لگے۔ مختلف طبیعتوں کے لوگ علیحدہ علیحدہ گروہوں میں تقسیم ہو کر چل دیئے۔ چھلیل سنگھ اپنی گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر بیٹھا ادھر اُدھر تاک جھانک کر رہا تھا۔ جگیر سنگھ اور رام سنگھ ایک نہایت بدتمیز سانڈنی پر سوار تھے جو لمحہ بھر کو بھی چین سے نہ کھڑی ہوتی تھی اور بے طرح بلبلائے جا رہی تھی۔

چھلیل سنگھ پریتو کا انتظار کر رہا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کن عورتوں کے گروہ میں شامل ہے تاکہ راستے میں اُسے تلاش کرنے میں دقت نہ ہو . . . . وہ بار بار اپنے گندمی سینے پر لٹکتے ہوئے سنہرے کنٹھے کو انگلیوں سے چھوتا اور گردن اٹھا اٹھا کر گاؤں سے باہر نکلنے والی سب سے بڑی گلی کی طرف دیکھتا۔

بالآخر جیسے خربوزوں سے بھرا ہوا چھکڑا باہر نکلا۔ اس میں گاؤں کی نوجوان عورتیں سوار تھیں۔ بیل ڈھلوان کی طرف بڑی تیزی سے سینگ ہلاتے ہوئے بھاگے اور ان کی گھنٹیوں کی ٹناٹن سے فضا گونج اٹھی۔ پریتو احتیاطاً چھکڑے کے سب سے پچھلے حصے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر ادھر چھلیل سنگھ کی مونچھیں متحرک ہوئیں اور ادھر وہ اپنے عاشق کی سج دھج دیکھ کر کھل گئی۔ اس نے اطلاعاً اپنا ہاتھ ایک خاص

انداز سے اوپر اٹھایا اور پھر بڑی صفائی سے اسی ہاتھ سے کھینچ کر اس نے چھوٹا سا گھونگھٹ نکال لیا۔

اب کیا تھا چھیل سنگھ نے اپنی چلبلی گھوڑی کو ایڑ لگائی اور وہ گرد اڑاتی ہوئی اس تیزی سے چل نکلی جیسے غلیل میں سے غُلّہ نکلے۔

جب وہ چھکڑے کے قریب سے گزرا تو اپنی مخصوص آواز میں کھانسا۔ چھکڑے میں اس کی اپنی بہن بھی بیٹھی تھی۔ اُس نے پریتو کو تاکید کر دی تھی کہ وہ راستے میں جہاں کہیں بھی اتریں اور میلے میں جس جگہ بھی ٹھہریں یا گھومیں، وہ اس کی بہن کے ساتھ ساتھ رہے تاکہ آپس میں بات چیت کرنے میں کوئی دقّت نہ ہو۔

اس طرح سارا راستہ ہنستے کھیلتے کٹ گیا اور جب وہ میلے میں پہنچے تو گھنے درختوں کی چھاؤں تلے چھیل سنگھ نے بڑی سی دری بچھا دی۔ اس کی بہن پریتو اور اڑوس پڑوس کی واقف کار عورتیں وہیں پر بیٹھ گئیں۔ گھوڑی اور سانڈنی کو بھی وہیں پر چھوڑ دیا گیا۔

میلے میں ارد گرد کے سینکڑوں لوگ آن جمع ہوتے تھے۔ اگرچہ چھیل سنگھ کا جی نہیں چاہتا تھا کہ درخت تلے سے اٹھ کر ادھر ادھر جائے لیکن دوست کہاں چھوڑنے والے تھے۔

دوپہر سے پہلے پہلے عورتیں بھی میلے میں شامل رہتی تھیں لیکن اس کے بعد یہ مخلوط میلہ صرف مردوں کا میلہ رہ جاتا تھا۔ کیونکہ مردوں کے ہجوم اور نشے میں بدمست نوجوانوں کے شور و غل میں عورتوں کا وہاں رہنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عورتوں کے چلے جانے کے بعد مرد خوب کھل کھیلتے۔ چنانچہ دوپہر کے وقت جب عورتیں واپس

آنے لگیں تو انہوں نے گھوڑی اور سانڈنی بھی واپس بھیج دیں، تاکہ رات کو جانے کی زحمت نہ ہو۔ چھلیل سنگھ کو پرتیو سے باتیں کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا تھا اور اب وہ اس خیال سے بہت اداس ہو گیا۔ اس نے موقعہ پا کر چھکڑے کے پیچھے پرتیو کو جا دبوچا اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ دوسرے روز شام کو ساگ توڑنے کے بہانے اس کے کنوئیں پر ضرور آئے گی۔ پرتیو نے وعدہ کر لیا اور اس خوف سے کہ کوئی دیکھ نہ لے پیچھے سرک گئی اور اس کے کنٹھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "خود تو کنٹھے پہنے پھرتے ہو اور ہمارے لئے پیتل کی زنجیر بھی نہیں"

دوپہر کے بعد دفعتہً لوگ گھر یلو شراب کی بوتلیں بغلوں میں دبائے آتے اور برسرِ عام منہ لگا کر غٹا غٹ پی گئے اور پھر لگے جھومنے۔۔۔۔ ایک بہت بڑے مجمعے کے لوگ گھبرا بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ڈھکتی کلیوں میں لپٹے ہوئے الغوزے بجنے لگے اور ایک بانکے نے کان پر ہاتھ رکھ کر تان اٹھائی۔

بلے بلے بئی روٹی لے کے دیور دی چلی
سر تے ڈورا باگنڈے دی چھل ورگا
بئی روٹی لے کے۔۔۔۔۔

پہلے بول کے بعد ایک دم بلے بلے کا شور بلند ہوا اور جگبیر سنگھ بل کھاتے چھلیل سنگھ کی بغل سے نکلا اور لاٹھی کو دونوں سروں سے پکڑ کر اسے ہوا میں کیا اور پاؤں سے گرد اڑا کر لگا بے ڈھنگے انداز سے رقص کرنے۔ اس کی لہراتی ہوئی داڑھی نے ایک سماں باندھ دیا۔ وہ بڑی پھرتی سے ناچ رہا تھا۔

لمبی ٹانگوں کے طفیل دوچار رپاٹوں میں ادھر سے ادھر جا نکلتا۔

بھانت بھانت کی آوازیں بلند ہوئیں اور اپنے زیور کے لئے روٹی لے جانے والی البیلی عورت کے قصے نے جو طول کھینچا تو پھر نوبت کہیں کی کہیں جا پہنچی جب کہانی اپنی آخری منزل میں داخل ہوئی تو لوگوں کو صبر کا یارا نہ رہا۔ ہائے وائے کے نعرے تیز تر ہوتے گئے۔ اس افراتفری میں چند ایک لوگوں کی پگڑیاں اچھال دی گئیں۔ اس پر لٹھ برس گئے۔ پانچ سات کے ٹخنے اتر گئے۔ مگر اپنے اپنے زخموں پر دھجیاں لپیٹ کر وہ پھر کھیل کے میدان میں آ گئے۔

ڈونچی کا کھیل شروع ہوا۔ جگبیر سنگھ اور امر سنگھ دونوں تہبند پرے پھینک خم ٹھونک کر میدان میں جا کھڑے ہوئے۔ اگرچہ وہ دونوں پھلیل سنگھ سے دس دس بارہ بارہ سال بڑے تھے۔ لیکن کھیل کود میں کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں تھے اور اس قدر پختہ دم تھے کہ میلوں بلا تکان دوڑے چلے جاتے تھے۔ ——سورج کی تیز روشنی میں وجیہہ جوانوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑے دیکھ کر ایک مرتبہ تو پھلیل سنگھ کا دل بھی لہرایا۔ لیکن اس کی طبیعت درحقیقت اداس تھی۔ اس لئے باوجود اصرار کے اس کھیل میں حصہ نہ لیا۔

تاریکی چھانے لگی تو کھیل ختم ہوا۔ پھلیل سنگھ کا نشہ اتر چکا تھا۔ لیکن سر میں گرانی تھی۔ جگبیر سنگھ اور امر سنگھ بھی پسینہ پونچھتے ہوئے اس کے قریب چلے آئے۔ لوگ باتیں کرتے ہوئے بھرے تنور والے کی دکان پر پہنچے۔ کھانا وانا کھانے کے بعد جگبیر سنگھ نے کہا۔ یار دو دن تو اچھا گذر گیا۔ لیکن پیسہ ایک نہیں بچا۔ گھر والوں کے لئے ہمیں کچھ نہ کچھ تو لے جانا چاہئے تھا۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد دفعتہً جگیر سنگھ نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ کسی کے ہاں آج ہاتھ صاف کیا جائے۔

پھلیل سنگھ یہ سن کر اچھل پڑا۔ واہ کیسی معقول تجویز تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر اسے یہ بات کیوں نہ سوجھی۔ اس میں اسے اپنی نجات کا راستہ بھی نظر آ گیا۔ ممکن ہے اس طرح پہ تیو کے طعنے کا کوئی مؤثر جواب نکل آئے۔

چنانچہ یہ ٹھیری کہ ذرا رات بھیگ جائے تو وہ لوگ ستانے کے بعد کسی طرف کا رخ کریں اور راتوں رات کچھ نہ کچھ لے اڑیں۔ اس طرح گھر والے یہ بھی نہیں کہیں گے کہ ان کے لئے میلے سے کوئی سوغات نہ لائے۔ یہ طے کر کے وہ لوگ بھیڑ بھاڑ سے ہٹ کر ایک کھیت کی منڈھ پہ سر رکھ کر سو گئے۔

کچھ دیر اونگھنے اور آرام کرنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی کمر سے بندھا ہوا چھلکے سا جھاڑن اتارا اور اس میں جوتے باندھ کر دوبارہ کمر سے لپیٹ لیا اور پھر اٹھ کر ایک سمت کو ہلکی چال سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

چاندنی رات تھی۔ دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سکون کا راج تھا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے مزے مزے دوڑے چلے جا رہے تھے۔

جب یہ لوگ تقریباً چھ کوس کا فاصلہ طے کر چکے تو ایک گاؤں کے قریب کچھ فاصلے پر رک گئے۔ تجویز یہ تھی کہ پہلے اس بات کی کوشش کی جائے کہ گاؤں کے سرے پر ہی کسی مکان میں کام بن جائے لیکن اگر مال ملنے کی کوئی امید نہ ہو تو پھر گاؤں کے اندر داخل ہوں۔

انہوں نے پگڑیوں کے شملوں کو گھما کر سر کے دوسری جانب اس طرح سے ٹھونس لیا کہ دیکھنے والوں کو محض ان کی آنکھیں نظر آئیں۔ باقی چہرہ دکھائی نہ دے اور پھر سہج سہج قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ اگرچہ وہ چوکنے تھے اور دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ لیکن تجربہ کار مجرموں کی طرح انہوں نے اس قسم کی حرکات سے پرہیز کیا جس سے کسی دیکھنے والے کو شبہ ہو۔ مگر بھلا آدھی رات کو وہاں کون بیٹھا تھا۔

آخر چوری کرنے کا مناسب موقع بھی نہیں تھا۔ خاصی گرمیوں کا موسم لوگ صحن میں یا چھتوں پر سو رہے تھے اور پھر اس پر طرہ یہ کہ چاند اپنے پورے جوبن پر تھا ــــ لیکن آج وہ مجبوراً چوری کر رہے تھے اور اسی لئے وہ گاؤں کے اندر جہاں ساہوکاروں کے مکان تھے، جانے سے کترا رہے تھے . . . . دفعتاً اُن کے قریب ہی ایک درخت کے سائے تلے سے ایک کتا نکلا اور انہیں اجنبی جان کر غرانے لگا۔ دوسرے لمحے ببلیل سنگھ نے لاٹھی کا ایک ہی بھرپور وار دیا کہ کتا ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی دبی سی چیخ بھی اس کے حلق سے نہ نکل سکی۔

ایک سائے سے دوسرے سائے تک وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک چھوٹے سے مکان کو تاکا جو گاؤں سے قطعاً الگ بنا ہوا تھا اور پھر خاص بات یہ تھی کہ چھت پر قریب کھڑے ہوئے شرینہہ کے درخت کا سایہ بھی پڑ رہا تھا۔ مکان کے قریب ایک کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا جس پر چڑھ کر وہ بڑی آسانی سے چھت پر پہنچ سکتے تھے وہ لپک کر اس مکان کی دیوار کے سائے تلے جا کھڑے ہوئے۔ مکان کچی

اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ پچھواڑے سے شگاف کرنا بھی مشکل نہ تھا۔ لیکن ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ بہرحال چھت پر چونکہ کوئی نہیں تھا اور نہ چاند کی روشنی وہاں پہنچتی تھی۔ اس لئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ پہلے چھت سے صحن کی طرف جھانک کر موقعہ محل کا جائزہ لیا جائے اور پھر جو مناسب ہو عمل میں لایا جاوے۔

دیوار کی طرف منہ کر کے امر سنگھ اکڑوں بیٹھ گیا اور بھلیل سنگھ نے اس کے دونوں کندھوں پر پاؤں رکھ دیئے۔ پہلے امر سنگھ اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا اور پھر بھلیل سنگھ اس کے کندھوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دبی آواز سے انہیں بتلایا کہ وہ آسانی سے چھت پر پہنچ جائے گا۔

بھلیل سنگھ نے چھت پر نظر دوڑا کر پہلے لاٹھی آگے سرکائی اور پھر خود اچک کر اوپر جا پہنچا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل سرکتا ہوا صحن کی طرف بڑھا۔ اس کے دونوں ساتھی انتظار میں کھڑے تھے کہ دفعتاً وہ لوٹ آیا اور انہیں جلدی سے اوپر آنے کو کہا۔ ایک دوسرے کو اٹھا کھینچ کر وہ چند لمحوں کے اندر اندر اوپر پہنچ گئے۔ ایک دوسرے کے متوازی وہ رینگتے ہوئے آگے بڑھے اور پہلی منڈیر کے قریب پہنچ کر لیٹ گئے۔ گردنیں آگے بڑھائیں تو وہ منظر دکھائی دیا کہ جگبیر سنگھ اور رام سنگھ کے منہ سے حیرت و مسرت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

صحن کے بیچوں بیچ ایک جوان اور حسین عورت چارپائی پر سوئی پڑی تھی اور اس کے بدن پر سونے کے اتنے زیورات تھے جتنے وہ تصور کر سکتے تھے۔ سر پر چونک، کنپٹیوں پر جگنیاں، کانوں میں بالیاں، گلے میں ہار اور کلائیوں میں یہ موٹے موٹے گوکھرو اور لال چوڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی شادی کو بہت تھوڑا عرصہ

نہیں ہوا۔۔۔اس قدر خوش شکل عورت بھی اُن کی نظر سے کبھی نہیں گزری تھی۔ سوتے میں عورت کی ٹانگیں شلوار کے پائینچوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ ایسی تناسب گدرائی ہوئی رانیں اور پنڈلیاں بھی انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ہی دیکھی تھیں۔ گرمی کی وجہ سے عورت نے قمیص بھی نہایت باریک جالی دار کپڑے کی پہن رکھی تھی۔ ایک بازو سر کے نیچے تھا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھ کر سرہانے کے نیچے کی طرف لٹک رہا تھا۔

تینوں چور درخت کے سائے میں مبہوت بیٹھے تھے۔ چند لمحوں کے لئے تو انہیں اپنے آپ کا ہوش نہ رہا اور پھر اس منظر سے توجہ ہٹی تو عورت کے قریب والی دوسری چارپائی پر نگاہ پڑی۔ اس پر ایک نوجوان مرد لیٹا تھا۔ وہ بھی ہزاروں میں انتخاب تھا۔ عورت نہ شکل اتنی اچھی نہ تھی۔ لیکن اس کا جسم ایسا تھا کہ اچھے سے اچھے جوان کو دیکھ کر رشک آئے۔ وہ مرد محض ایک جانگیہ پہنے سو رہا تھا۔ اس کا سینہ اس کے بازو اور رانیں اور پھر اس کی مکمل شخصیت ایسی تھی کہ دیکھ کر دل پہ ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ تو وہ تینوں ساری چوکڑی بھول گئے۔

وہ چپ چاپ پیٹ کے بل لیٹے ہوئے حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ کافی وسیع صحن تھا۔ پرلے گوشے میں دو بہت اعلےٰ نسل کی بھورے رنگ کی بھینسیں بندھی تھیں۔ ان میں شاید ایک دودھ دینے والی اور دوسری ابھی بیاہنے والی تھی۔ سامنے کی دیوار پر کھونٹے سے دودھ بلونے کی بڑی بلونی لٹک رہی تھی۔ اس طرف کے گوشے میں رسوئی بنی ہوئی تھی جس میں چند برتن چمک رہے تھے۔

منڈیر سے ذرا پرے کھسک کر وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ واقعی خطرے کی بات تھی۔ ایک طرف سونا تھا اور دوسری جانب دیو ہیکل جوان۔ ظاہر تھا کہ اگر ایسے میں وہ جاگ اٹھا تو اُن میں سے ایک آدھ کو تو رکھ ہی لے گا۔ چھلیل سنگھ نے کہا کہ اس قدر عظیم الجثہ انسان ان کے برابر لمبی دوڑ نہیں لگا سکتا۔ اور اگر صحن کی بجائے باہر کھلے کھیتوں میں مقابلہ ہو جائے تو وہ تینوں شاید ہی اس سے مار کھائیں۔

تینوں جوان جن کی طاقت، ہتھکنڈوں اور دلیری کی علاقے بھر میں دھوم دھام تھی، ڈر رہے تھے کہ کہیں اپنے گھر سے اٹھارہ بیس کوس پرے مفت میں نہ مارے جائیں۔ آخر چھلیل سنگھ کے گرم خون نے جوش مارا۔ اس نے کہا میں صحن میں اترتا ہوں اور عورت کے زیور اتارتا ہوں۔ اگر مرد کی آنکھ کھل گئی یا عورت کے شور مچانے پر وہ جاگ اٹھا تو ظاہر ہے کہ وہ پہلے اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ اس وقت وہ دونوں فوراً چھت سے کود کر اس پر حملہ کر دیں۔

امر سنگھ نے سوال کیا کہ کیوں نہ ہم دونوں نیچے اتر کر اس کے سرہانے کھڑے رہیں۔

چھلیل سنگھ نے کہا "یہ درست نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں اگر ہمیں بھاگنا پڑا اور ہم تینوں صحن میں ہوئے تو فرار ہونا مشکل ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ چوکے کے قریب اٹھی ہوئی دیوار پر پاؤں رکھ کر نیچے اتر گیا اور دبے پاؤں عورت کے قریب جا پہنچا۔

جب وہ اس کی چارپائی کے نزدیک لگ کر بیٹھ گیا تو اس نے نزدیک سے

عورت کے بدن پر نگاہ دوڑائی۔ اس کی جلد کی نزاکت، صحت، رنگت اور دہک سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی باریک جالی دار قمیص میں اس کا بدن اور بھی دلفریب دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ذہن کو اس قسم کے خیالات سے آزاد کیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

سوتی ہوئی عورت کے بدن سے زیور اتارنے میں اس کا ہاتھ بہت صاف ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہر زیور اتارنے کے بعد اس کی مونچھوں تلے اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں اور وہ ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ دونوں رات کی خاموشی میں چھت پر اوندھے لیٹے تھے۔ ان کی ٹھوڑیاں تین چار انگل بلند منڈیر پر رکھی ہوئی تھیں۔ چہرے پگڑیوں کے شملوں میں چھپے ہوئے تھے اور بھیڑیوں کے مانند دہکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں ___ البتہ جگیر سنگھ کی لمبی داڑھی منڈیر سے نیچے لٹکتی ہوئی ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے ہل رہی تھی۔ چھیلیل سنگھ نے یہ منظر دیکھا تو اسے ہنسی آنے لگی۔

چھیلیل سنگھ نے کمر سے بندھے ہوئے جھاڑن کو زمین پر بچھا دیا اور زیور اتار اتار کر اس میں رکھے جاتا تھا۔

اس نے عورت کے ماتھے اور سر کے سب زیورات اتار لیے۔ دونوں کلائیوں کے گوکھڑو بڑی ترکیب سے اتارے یعنی گوکھڑوؤں کے دونوں سروں میں پھندا ڈال کر وہ انہیں مخالف سمتوں کی جانب کھینچتا اور جب ان کے منہ کھل جاتے تو وہ انہیں اتار لیتا۔ گلے کا ہار بھی اتار لیا اور پھر اس نے کانوں کی بالیاں اتارنے میں بھی نہایت صفائی سے کام لیا۔

تقریباً سب بھاری زیورات اتر چکے تھے۔ صرف کان کی بالیاں رہ گئی تھیں لیکن مشکل یہ تھی کہ عورت کا چہرہ پرلی طرف کو جھکا ہوا تھا اور کان نیچے دب گیا تھا۔ پھلیل سنگھ سوچ میں پڑ گیا کہ وہ عورت کا سر کس طرح گھمائے۔ اس کی نظر اٹھی دیکھا کہ اس کے ساتھی اشاروں ہی اشاروں میں بھاگ آنے کے لئے کہہ رہے ہیں لیکن وہ اپنی کامیابی پر اس قدر نازاں تھا کہ وہ ان چند بالیوں کو بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے چارپائی کی رسی میں سے ایک باریک بان نکالا اور اسے ایک سرے سے پکڑ کر اس کا دوسرا سرا عورت کے کان میں گھمایا۔ پہلی مرتبہ تو کچھ اثر نہ ہوا، جب اس نے دوسری مرتبہ گھمایا تو عورت نے کروٹ بدل کر منہ اس طرف کر لیا۔ وہ یک لخت جھک کر چارپائی کے نیچے ہو گیا۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے سر اٹھایا اب عورت کے رخسار اور اس کے ہونٹوں میں بالشت بھر کا فرق تھا۔ لیکن اس نے کوئی ایسی حرکت کرنے سے اپنے آپ کو باز رکھا۔ اس نے شملے سے چہرہ کو ایک مرتبہ پھر اچھی طرح ڈھانپ لیا اور ہاتھ بڑھا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

وہ بالیاں اتار چکا تھا تو تیسری جو آخری بالی تھی کچھ پھنس گئی۔ بہت کوشش کی لیکن سوراخ اس قدر تنگ تھا کہ بالی اترنے میں ہی نہ آتی تھی۔

معاً عورت کے ہاتھ کو حرکت ہوئی۔ پل بھر میں بالی اتری اور اس کی طرف بڑھی۔

پھلیل سنگھ بھونچکا سا رہ گیا۔ عورت نے اپنی مدھ بھری آنکھیں کھولیں اور مسکرانے لگی۔

پھلیل سنگھ اس عورت کی ایسی حرکت پر اتنا حیران ہوا کہ بت بنا بیٹھا رہا۔

اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

عورت نے اطمینان سے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے آہستہ سے پچکار کر کہا "اچھا تمہارے لئے تو یہی بہتر ہے کہ جس طرح اور جن ہاتھوں سے تم نے سب زیور اتارے ہیں، اسی طرح اور انہیں ہاتھوں سے انہیں پہنا دو ورنہ اگر تم بھاگ گئے تو میرا خاوند تم تینوں کو جا پکڑے گا اور مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دے گا۔"

پھلیل سنگھ چپ رہا۔

عورت دلکش انداز میں ہنسی —"ہاں سوچ لو۔ . . ." یہ کہہ کر اس نے اطمینان سے آنکھیں موند لیں۔

پھلیل سنگھ کا اجڈپن عود کر آیا۔ بولا "یہ میں مانتا ہوں کہ تمہارا خاوند بہت مضبوط شخص ہے۔ لیکن ہم لوگوں کو دوڑ کر پکڑنا یا ہم سے لڑنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔"

یہ سن کر عورت نے زیورات کا جھاڑن اٹھایا اور پوٹلی باندھ کر اس کے ہاتھ میں تھما دی اور کہا "لو، جب تم اس سامنے والے اس چھوٹے سے درخت کے قریب پہنچ جاؤ گے تو میں اسے جگا دوں گی۔"

پھلیل سنگھ کو تاؤ بھی آیا اور اس نے اپنی انتہائی بے عزتی بھی محسوس کی، مگر خیر وہ اٹھا اور ڈھیلوں کی طرح پوٹلی ہاتھوں میں لئے چھت پر چڑھ گیا۔ اس نے مختصر طور پر ساتھیوں کو سارا قصہ سنایا۔ پھر وہ تینوں وہاں سے چل دیئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شخص انہیں دوڑ کر نہیں پکڑ سکے گا اور کھلے میدان میں پہنچ کر وہ اس سے یوں بھی نپٹ لیں گے۔

جب وہ ببول کے اس درخت کے قریب پہنچے تو انہوں نے گھوم کر دیکھا۔ انہیں مکان کی چھت پر وہی شخص دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور اب وہ پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ دیوہیکل دکھائی دے رہا تھا۔ اُن کے دیکھتے دیکھتے اس نے چھت سے چھلانگ لگائی۔ پھلپل سنگھ تو بس وہیں پاؤں جما کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھیوں نے اصرار کیا کہ ایسی حماقت مت کرو، گاؤں کے قریب لڑنا مناسب نہیں۔ اگر گاؤں والوں کو معلوم ہو گیا تو وہ سب کے سب ہم پر پل پڑیں گے، مفت کی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ اگر لڑنا ہی ہے تو گاؤں سے ذرا پرے ہٹ کر لڑیں گے۔

پھلپل سنگھ کو ان کی رائے مناسب معلوم ہوئی اور تینوں آگے پیچھے ایک ہی سمت میں دوڑنے لگے۔ وہ خاصی رفتار سے لپکے ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن ان کا تعاقب کرنے والا بہت تیز نکلا۔ چنانچہ انہیں رفتار اور تیز کرنی پڑی۔ لیکن انہیں محسوس ہوا کہ اس طرح بھی کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ ان کا تعاقب ریل کے انجن کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا آ رہا تھا۔ اور اب ان کے درمیان دو بڑے کھیتوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ پھر وہ پوری رفتار کے ساتھ دوڑ پڑے تھے۔ چند منٹ تک وہ اسی طرح دوڑتے چلے گئے۔ وہ تینوں انتہائی تیز اور لمبی دوڑوں کے لئے خاص شہرت کے مالک تھے۔ لیکن وہ اس وقت حیران رہ گئے۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ اس قدر گرانڈیل شخص اس قدر تیز کس طرح دوڑ رہا ہے۔ ان کا یہ خیال بھی غلط نکلا کہ وہ تھوڑی دور تک دوڑنے پر ہانپ جائے گا۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس قدر تیز رفتار کے ساتھ زیادہ لمبی دوڑ لگانے سے وہ خود کچھ ہانپنے

رہے تھے۔ ادھر اُن کا حریف کچھ اور بھی قریب آگیا تھا۔

اسی طرح دوڑتے دوڑتے انہوں نے مشورہ کیا کہ سامنے جو جھونپڑیوں کے دو جھنڈ نظر آرہے ہیں۔ اُن کے بیچ میں سے ہو کر گزرا جائے۔ جھنڈوں کے درمیان تنگ راستے سے گزرتے وقت لگے دونوں ساتھی اچک کر دائیں طرف کی جھاڑی کی اوٹ میں کھڑے ہو جائیں اور پھلیل سنگھ سیدھا دوڑتا ہوا چلا جائے۔ یہ سب کام اس صفائی سے کیا جائے کہ اُن کے حریف کو بس یہی معلوم ہو کہ وہ تینوں سیدھی قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں —— اور جب وہ اس راستے میں سے ہو کر گزرے تو اس پر عقب سے حملہ کر دیا جائے اور اس وقت اگلا ساتھی بھی لوٹ آئے اس طرح وہ تینوں اس کو ٹھکانے لگا دیں۔

چنانچہ اسی طرح کیا گیا۔ جگبیر سنگھ اور رام سنگھ جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ پھلیل سنگھ چونکہ سب سے پیچھے تھا۔ اس لئے وہ بھاگتا چلا گیا اور جب اُن کا حریف جھاڑیوں میں سے ہو کر گزرا تو جگبیر سنگھ نے لاٹھی تول کر ایسا بھرپور وار کیا کہ اگر اس کے سر پر بالوں کا بہت بڑا جوڑا نہ ہوتا تو لاٹھی اس کے جبڑوں تک اتر جاتی۔ پھلیل سنگھ فوراً واپس پلٹا۔ اس کے پہنچنے تک انہوں نے اس کی پیٹھ اور ٹانگوں پر دو چار لاٹھیاں اور برسا دیں۔ لیکن اُن کا حریف پہلے بھرپور وار ہی سے گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

پھلیل سنگھ نے اُن کا ہاتھ روک دیا اور کہا: اب مت مارو بے چارے کو — آؤ اب ہم لوگ چل دیں۔

وہاں سے دو کوس پرے وہ لوگ ایک رہٹ کے قریب کھیت میں

چھپ کر لیٹ رہے۔ سوچا کہ کچھ دیر آرام کریں گے۔ اور دن چڑھے میلے میں واپس چلے جائیں گے۔

کچھ دیر تک وہ سوئے رہے۔ صبح ہوئی تو انہوں نے رہٹ سے منہ ہاتھ دھویا۔ چھلیل سنگھ نے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا "یار جو کچھ بھی کمو رات والا جوان خوب تھا۔۔۔ آہاہاہا۔۔۔۔ کیا خیال ہے تمہارا وہ مر تو نہ گیا ہو گا۔۔۔ بھئی مجھے تو کچھ فکر سی لگی ہوئی ہے۔۔۔۔"

چھلیل سنگھ نے گویا سب کے دل کی بات کہہ دی۔ وہ بولے "چلو اس کا پتہ لگائیں۔ ہمیں گاؤں میں کوئی پہچانتا تو ہے نہیں۔"

وہ واپس چل دیئے۔ پہلے اس جگہ پہنچے۔ جہاں انہوں نے اس پہ وار کیا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ شاید گاؤں والوں میں سے کسی نے دیکھ پایا ہو اور اسے اٹھا کر لے گئے ہوں لیکن زمین خون سے سُرخ ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ اس قدر خون بہہ جانے کے بعد وہ شاید ہی زندہ بچا ہو۔

وہ تینوں مغموم سے ہو گئے۔ درحقیقت وہ ایسے غیر معمولی جوان کو جان سے مارنا نہیں چاہتے تھے ۔۔ اب انہوں نے مشورہ کیا کہ تینوں علٰحدہ علٰحدہ گاؤں میں داخل ہوں اور حالات کا پتہ لگائیں۔

وہ بکھر کر علٰحدہ علٰحدہ گاؤں کی طرف چل دیئے۔ چھوٹے سے گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ اس کا نام دربارا سنگھ ہے اور وہ اس وقت گاؤں کے دائرے میں پڑا ہے۔

دائرے میں پہنچے تو وہاں اور بھی کئی لوگ جمع تھے۔ انہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ مرا نہیں۔ بھیڑ میں گھس کر دیکھا تو دربارا سنگھ ایک بڑی چارپائی پر تکیے کے سہارے بیٹھا تھا۔ سر پر پٹی بندھی تھی اور وہ ہنس ہنس کر لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔

دن کی روشنی میں اس کا غیر معمولی سا پلا ہوا جسم دیکھنے کے قابل تھا۔ اُف کس قدر تنومند تھا وہ شخص۔

وہ علاقے بھر میں مشہور جوان تھا۔ وہ اکیلا کئی کئی جوانوں پر بھاری تھا اور آج تک اس کے ہاتھ سے بچ کر کوئی شخص نہیں جا سکا تھا۔

چھیل سنگھ نے براہِ راست دربارا سنگھ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ دربارا سنگھ نے اسے پردیسی راہ گیر سمجھ کر سارا قصہ کہہ سنایا۔ پھر ہنستے ہوئے مزے میں ہنس کر بولا۔ وہ آدمی ہی ایسے تھے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ معمولی چور نہیں تھے۔ کیونکہ آج تک دوڑ میں بھی میں کسی شخص کو بہت زیادہ دور تک جانے نہیں دیتا۔ رات والے جوان دوڑنے میں یقیناً مجھ سے کم نہ تھے۔ مجھے ملیں تو اُن کے ہاتھ چوم لوں۔ جب میں اُن کے پیچھے بھاگ رہا تھا تو دل ہی دل میں اُن پر آفرین کہہ رہا تھا۔ لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ آمنے سامنے مقابلہ نہ ہو سکا۔۔۔!

وہ چپ چاپ تعریفی نظروں سے اس کو دیکھتے رہے اور پھر انہوں نے آپس میں آنکھوں سے اشارے کیے اور وہاں سے چل دیئے۔

وہ تینوں چپ چاپ چلے جا رہے تھے اور تب وہ رات والے مکان

کے قریب سے گزرنے لگے تو دفعتہً چھیل سنگھ رُک گیا۔ اس نے چند سے سکوت کیا اور پھر کمر سے زیورات کی پوٹلی نکالی اور دوسرے لمحے اسے گھما کر ایسے نشانے پہ پھینکا کہ پوٹلی عین صحن کے بیچ میں جا کر گری۔

پھر وہ تینوں جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور جب گاؤں سے دور پہنچ گئے تو ایک مرتبہ پھر انھوں نے رہٹ کا ٹھنڈا پانی پیا۔

چھیل سنگھ نے داڑھی سے پانی کی بوندیں پونچھتے ہوئے تنکرے کی سی دمکتی ہوئی آنکھوں سے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کہو یار! آج رات کس کے ہاں ہاتھ صاف کیا جائے"۔

بابا مہنگا سنگھ

ایک ہمارے ماموں صاحب ہیں کہ شہر میں کسی نہ کسی کام سے آتے رہتے ہیں۔ رات عموماً میرے ہاں ہی گزارتے ہیں اور جب رخصت ہونے لگتے ہیں تو مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ مجھے گاؤں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کھلی ہوا، دودھ، دہی اور سیدھے سادے بھولے بھالے لوگوں سے مجھے کیا تعلق؟ میں دودھ کے بجائے چائے پینا پسند کرتا ہوں۔ کھلی ہوا کے بجائے کافی ہاؤس کی دھواں دھار فضا زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دیہات کے سیدھے سادے لوگوں سے براہِ راست تعلقات پیدا کرنے کے بجائے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر کسی دوست کے ساتھ ان بچاروں کے مفاد پر گفتگو کرنا افضل سمجھتا ہوں۔ حفظانِ صحت کی رو سے شہر کی ضرر رساں فضا میں چالیس برس جینے کو دیہات میں اسی سال تک زندہ رہنے پر ترجیح دیتا ہوں۔ . . . لیکن ماموں صاحب کے اصرار

سے مجبور ہو کر ایک مرتبہ دیہات میں جانا پڑا۔

گاؤں میں پہنچ کر مجھے مایوسی بالکل نہیں ہوئی بلکہ کچھ خوشی ہوئی کہ گاؤں کی بابت جو میرے خیالات تھے، وہ درست نکلے، اب ہر طرف کھلی ہوا تھی، کوئی اچھا مکان نہیں کوئی سینما نہیں، کوئی کار نہیں، کوئی کمپوٹنٹ نہیں بس کھلی ہوا ہے اور مجھے اس بات پر خوش ہونے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ میں ماموں کے مکان کے باہر والے کمرے میں بیٹھا جماہیاں لیا کرتا۔ گھر کے سامنے کھلی جگہ میں ماموں صاحب کی بھینس کھڑی دم ہلایا کرتی۔ کبھی کبھی میری طرف دیکھتی۔ کہو بیٹا دودھ پیو گے۔ مکھن چاٹو گے، دہی کھاؤ گے؟ . . . میں کہتا، میڈم! آپ دودھ کی بجائے گرم چائے کیوں نہیں دیتیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ چائے کے ذائقے سے واقف نہیں، ورنہ . . . بھینس بھی آخر دیہاتن ٹھہری۔ وہ قطع کلام کر کے سینگ ہلانے لگتی اور پھر اپنی بے قدری پر مضمحل ہو کر انتہائی بے اعتنائی سے پورب کی طرف دیکھنے لگتی اور میں گردن دوسری طرف کر کے پچھم کی طرف نظر جما دیتا۔

دو ہی روز بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اس جگہ میرے دیکھنے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ البتہ میں گاؤں والوں کے لئے دیکھنے کی شے ہوں۔ ماموں جان مجھے اپنے ہمراہ لے کر باہر نکلتے تو جو واقف ملتا، اور گاؤں بھر میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ان کا واقف نہ ہو ۔۔۔ اسے میری تفصیلات سے آگاہ کرتے۔ وہ لوگ مجھے سر سے پاؤں تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتے ۔۔۔ ان کے اس رویے سے میں قبول ہی گیا کہ مجھے بھی یہاں کچھ دیکھنا ہے . . . اور وہ پیاری پیاری دیہاتی لڑکیاں ۔۔۔ جن کی تربوز تربوز بھر چھاتیاں، جنہیں دیہاتی سچ مچ چھاتیاں سمجھتے ہیں . . . اور ان کے

وہ گویہ میں سنے ہوئے ہاتھ جنہیں پھیلا کر وہ کچھ ایسے بیباک انداز سے میری طرف بڑھتی تھیں کہ میں اپنے آپ کو بالکل سادہ لوح ظاہر کرنے لگتا، آنکھ دانکھ مارنا تو ایک طرف مسکرانے تک کی جرأت نہ ہوتی تھی ــــ اور بچارے بھولے بھالے نوجوان جن کی صورتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگر میرے ساتھ ماموں جان نہ ہوتے تو وہ ایک سکّے کے لیے میری جان لینے سے گریز نہ کرتے۔

اس فضا میں میرے لئے اور زیادہ عرصے کے لیے زندہ رہنا ناممکن ہوا جارہا تھا۔ مجھے بڑے اہتمام سے وہاں لے جایا گیا تھا اور میں بھی بڑے طمطراق سے وہاں گیا تھا۔ اس لئے دو ہی دن بعد لوٹ آنا قطعاً نامناسب معلوم ہوتا تھا۔ نہ معلوم میں کیا کر گزرتا۔ اگر سچ مچ میری دلچسپی کا سامان پیدا نہ ہو جاتا۔ منجملہ اور چیزوں کے میرے دل میں سب سے زیادہ کشش سردار جھنگا سنگھ کے لئے پیدا ہوئی۔

ایک روز صبح کے وقت جبکہ ماموں صاحب مجھے پورا آدھ سیر تازہ دوہا ہوا دودھ پلانے پر مصر تھے۔ سردار جھنگا سنگھ ادھر سے گذرا۔ ماموں سے علیک سلیک بھی ”واہگورو جی کی فتح“ کہہ کر آگے بڑھ گئے اور پھر مجھے ماموں جی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ تو میرے لئے مجسم درس عبرت تھا۔ وہ کیونکر؟ ــــ اب سردار جھنگا سنگھ کی عمر تین کم اسی برس کی تھی، لیکن اس عمر میں بھی دو چار سیر دودھ ایک ہی سانس میں پی لینا، اس کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور ادھر میں جو ابھی نوجوان تھا۔ آدھ سیر دودھ بھی نہیں پی سکتا اور جب سردار جھنگا سنگھ جوان تھا تو وہ دودھ سے لبریز گھڑے کو منہ لگا دیا کرتا تھا۔

”پینے کے لئے ــ“

"اور نہیں تو کیا؟"

میں کھیتوں میں غائب ہوتے ہوئے مہنگا سنگھ کو دیکھتا رہا۔ اس کا اونچا قد، لمبی داڑھی اور بڑے بڑے ہاتھ پاؤں ....

"کام کیا کرتا ہے؟"

"کچھ نہیں، اپنی زمین کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ پہلے ڈاکے ڈالتا تھا، اب واہگورو کی بھگتی کرتا ہے۔"

مجھے مہنگا سنگھ کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ ایک ذہین شخص تھا۔ سیاسیات، معاشیات اور نفسیات وغیرہ مضامین پر وہ گفتگو نہیں کر سکتا تھا لیکن بحیثیت ایک انسان وہ یقیناً بہت دلچسپ تھا۔ اس کا راکششوں کے مانند ڈیل ڈول، گینڈے کی طرح کھال، مربتے والی پھولی ہوئی ہرڑ کی سی آنکھیں، گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا سینہ، چھاج کے مانند کان، قدیمی بابلی بادشاہوں کی طرح بٹی ہوئی لمبی داڑھی اور مونچھیں دیکھ کر انسان کو اس بات کا شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی مزیدار بات کہہ سکتا ہے یا گدگدی پیدا کرنے والے کسی چٹکلے کو سن کر قہقہے لگا سکتا ہے۔

چاندنی راتوں میں گاؤں سے باہر عام طور پر نوجوان کبڈی کھیلا کرتے تھے۔ لیکن اندھیری راتوں میں عموماً مہنگا سنگھ کو گھیر لیتے۔ مہنگا سنگھ کو زندگی میں بے شمار دلچسپ واقعات پیش آ چکے تھے۔ وہ ان کی سزائیں بھگت چکا تھا اور جو ثابت نہ ہو سکے تھے، وہ ذیلدار نے معاف کر دیئے گئے تھے۔ اب وہ واہگورو نام کا سمرن کرتا تھا یا گاؤں کے نوجوانوں کو کوئی مزیدار قصہ سنا دیتا۔

گاؤں سے تقریباً ایک فرلانگ پر لفٹین کی باغیچی تھی، یعنی لفٹنٹ کا باغ۔ میں نے اس کی وجہ تسمیہ جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ خیر اس باغیچے کے قریب ایک اونچا ٹیلا تھا۔ ٹھنگا سنگھ رات کا کھانا کھانے کے بعد اس ٹیلے پر جا بیٹھتا اور پریم رس میں ڈوبے ہوئے شبد، اپنی بے ڈھب آواز، لیکن اپنی دانست میں نہایت دردناک لے کے ساتھ پڑھا کرتا۔ کچھ آدمی بھی اس کے قریب آن بیٹھتے۔ داڑھیوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر شبدوں کے الفاظ اور معانی کی داد دیتے۔ بعض اوقات پریم رس اور گیان دھیان سے دفعتہً گریز کر کے وہ عورتوں کی باتیں کرنے لگتے۔ ان کے بالوں، آنکھوں ہونٹوں، گردن اور چھاتیوں سے ہوتے ہوئے گہرائیوں تک اتر جاتے، سب مل جل کر بڑی فحش باتیں کرتے اور جب جی بھر جاتا تو دفعتہً ساری گفتگو کا ایک بہت ہی اعلیٰ اخلاقی نتیجہ نکال لیتے اور پھر سب بڑے گیانیوں کی طرح زندگی کی ناپائداری پر لمبی آہیں بلند کرتے ہوئے اٹھ کر گاؤں کی طرف چل دیتے۔

میرا بھی یہ معمول ہو گیا تھا کہ شام کا کھانا کھایا، اور بابا جی کے ٹیلے کی طرف چل دیتا۔ بابا ٹھنگا سنگھ آنکھیں موندے، گوروچرنوں میں سیس نواتے یا تو کپڑے کی بنی ہوئی مالا جپتے یا شبد گاتے۔ جس روز کا اب ذکر کر رہا ہوں۔ اس روز بھی سب لوگ پریم رس میں رس گلے بنے بیٹھے تھے۔ نہ معلوم عورتوں کا ذکر کیوں اور کہاں سے شروع ہوا، اس روز صنفِ نازک پر نیا الزام لگایا گیا اور ٹھنگا سنگھ نے پہلے گورو صاحب کے لکھے ہوئے استری چرتر کا حوالہ دیا اور پھر اس کا ذکر ترک کر کے ذاتی تجربات بیان کرنے لگے . . . .

ہم سب مرگ کران کے قریب ہو بیٹھے۔

تاروں کی مدھم روشنی میں جب جھنگا سنگھ نے اس نئے مضمون پر گفتگو کرنے کے لئے منہ کھولا تو اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی۔ اس کی ہوا میں لہراتی ہوئی داڑھی جیسے جھوم جھوم کر اظہارِ مسرت کرنے لگی۔

"عورتوں کی چالاکی...؟... ہا ہا... مرد خود اپنے آپ کو کتنا ہی عقلمند کیوں نہ سمجھے لیکن عورت کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی۔ اب میں آپ بیتی سناتا ہوں جو بظاہر اس قدر حیرت انگیز ہے کہ شاید تم لوگوں میں سے بعض کو اس بات کا یقین بھی نہ آئے...

ہم سب اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ غور سے سن رہے تھے۔ اصل بات شروع کرنے سے پہلے اس نے بتایا کہ اس وقت اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت طاقتور شخص تھا۔ گھونسہ مار کر اینٹ توڑ ڈالتا تھا۔ کئی معرکے کے ڈاکے ڈال چکا تھا۔ علاقہ بھر کے لوگ تو اس کا نام سن کر تھر تھر کانپتے تھے۔ پولیس تک کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ.....

یہ تمہید کافی لمبی تھی۔ وہ یہ باتیں پہلے بھی اتنی مرتبہ دہرا چکا تھا کہ ہم اسے سن سن کر تنگ آ چکے تھے۔ لیکن نہ اسے ٹوکا جا سکتا تھا، نہ اس کی تردید کی جا سکتی تھی، اب بھی لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ آخر وہ اصل قصے کی طرف متوجہ ہوا۔

"... جس واقعہ کا میں اب ذکر کرنے والا ہوں، اس سے پہلے کئی روز کوئی مال ہاتھ نہ لگا تھا۔ یوں تو واہگورو کا دیا سب کچھ تھا اور میں زورِ بازو سے بھی بہت کچھ کمایا تھا۔ لیکن جسم میں جان تھی، طاقت کا استعمال بھی تو لازم تھا نا... ہاں بھئی چرن سنگھ! تم تو تقریباً میرے ہم عمر ہی ہو نا؟ تمہیں یاد ہے؟ کیلاں کے گاؤں کے اردگرد کا

علاقہ کس قدر خطرناک سمجھا جاتا تھا....."

"ہاں مجھے یاد ہے۔ وہاں بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ اور جھاڑیاں کوہ تک چلی گئی تھیں، جنگل ہی جنگل تھا...."

مہنگا سنگھ نے پھر بات شروع کی: "بڑا سنسان علاقہ تھا، وہاں یا تو بھیڑیے رہتے تھے یا ڈاکوؤں کی کمین گاہیں تھیں، مجھے بھی بعض اوقات وہاں پناہ لینی پڑتی تھی.... ایک مرتبہ کافی عرصے تک وہاں چھپے رہنے کے بعد میں نے اپنے گھر جانے کی ٹھانی — مہینوں سے نہ گھر والوں کی مجھے اور نہ میرے گھر والوں کو کوئی خبر رہی تھی، میں نے دو تین ساتھیوں کو تاکید کر دی کہ میں زیادہ سے زیادہ آٹھ دس روز تک لوٹ آؤں گا اور اگر میں اتنے عرصے کے اندر اندر واپس نہ آؤں، تو سمجھنا کہ گرفتار ہو گیا ہوں، پھر مجھے جیل سے چھڑانے کی تجویز کر لینا...."

بابا مہنگا سنگھ نے اپنی کھانسی کو سنبھالتے ہوئے تھوڑے سے توقف کیا، اپنے گاؤں تک جانے میں کوئی خطرہ نہ تھا، سوچا رات کو سفر کیا کروں گا، اور دن کو کہیں چھپ رہوں گا۔ جنگل ختم ہوتے ہی پہلا گاؤں "کیلاں" تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، میرے ہاتھ میں ایک لمبا لٹھ اور کمر سے ایک ڈیڑھ فٹ کی کرپان لٹکی ہوئی تھی، یہ کرپان میں نے خالص لوہے کی بنوائی تھی.... اس وقت مجھے سوائے جانوروں کے اور کسی کا خطرہ نہ تھا، کیلاں کے لوگ چونکہ بڑے خطرناک علاقے میں رہتے تھے اس لیے سردیوں میں تو شام پڑتے ہی گھروں میں گھس بیٹھتے تھے۔ میں مزے سے شبد گنگناتا کھیتوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دفعتہً جو میری نظر اٹھی تو ایک بہت عجیب منظر دکھائی دیا.... کیلاں سے کئی کھیت ادھر درختوں کے جھنڈ کے پیچھے

شمشان اور قبرستان ساتھ ساتھ کچھ اس انداز سے بنے ہوئے تھے کہ اگر گاؤں سے ایک طرف دیکھا جائے تو سوائے ان گھنے درختوں کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا . . . دیکھتا کیا ہوں کہ قبرستان میں تیز روشنی ہو رہی ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے شمشان میں کوئی مردہ جلایا گیا ہو، اور آگ ابھی جل رہی ہے۔ لیکن یہ روشنی کچھ اور ہی طرح کی تھی اور پھر لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی۔ . . . "

سب لوگ بلا آنکھیں جھپکائے جھنگا سنگھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جھنگا سنگھ نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قصہ جاری رکھا۔

"یہ روشنی دیکھ کر میرے دل میں کئی قسم کے خیالات پیدا ہوئے۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ ایسی سنسان جگہ، اندھیری رات، شدت کی سردی، ہر طرف خاموشی کا عالم . . . اور قبرستان میں بڑھتی ہوئی روشنی، پہلے میں نے سوچا، ہے منا! (اے دل!) تجھے ان باتوں سے کیا لینا، سیدھا راستہ ناپتا چلا جا! تجھے منزل طے کرنی ہے، واگورو کی باتیں واگورو ہی جانے" لیکن دل کی تسلی نہ ہوئی، اور میں نے سوچا، دیکھوں تو سہی، آخر معاملہ کیا ہے؟ . . . . . بھائی! میں نے اپنا راستہ چھوڑ کر قبرستان کا رُخ کیا۔ قبرستان مجھ سے کافی فاصلہ پر تھا، جوں جوں میں قریب پہنچ رہا تھا، توں توں روشنی اور صاف نظر آنے لگی۔ قبرستان سے کچھ فاصلہ پر میں رک گیا . . . گھنی جھاڑیوں میں نہ صرف آگ کی روشنی صاف صاف دکھائی دے رہی تھی بلکہ وہاں کوئی چیز ہلتی ہوئی دکھائی دی . . . پہلے سوچا، شاید میرا وہم ہو، چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ یوں معلوم ہوا جیسے دو سینگ ہل رہے ہوں، میں قدم ناپتا، درختوں کی اوٹ لیتا ہوا کچھ اور قریب پہنچا تو سر سے پاؤں تک

بالکل سیاہ گلٹے دکھائی دی.... آگ کا ایک آدھ شعلہ جھاڑی کے اوپر لپکتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا... وہ سیاہ گاٹے ویرانے میں تنہا کھڑی ہوئی چڑیل کا روپ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ہمیشہ واہگورو اکال پرکھ کا بھروسہ کیا ہے.... چنانچہ میں واہگورو کا نام لے کر اور آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹھک گیا۔ کچھ اس قسم کا شبہ ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی اور ہستی بھی ہے۔ رات مکمل طور پر تاریک تھی۔ درختوں کے وہ حصے جہاں آگ کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی۔ بڑے خوفناک دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ایک نظر اپنے سر کے اوپر ڈالی، ٹہنیوں پر بھی ڈالی، کہ کہیں وہاں کوئی چھپا ہوا نہ بیٹھا ہو...“

ہم لوگ اس کی آواز کی گونج اور الفاظ کے جادو سے بُت بنے بیٹھے تھے۔ حاضرین میں سے کسی کے منہ سے تھرتھراتی ہوئی آواز نکلی... ”پھر تم نے کیا دیکھا...؟“

”میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ ایک درخت کی اوٹ سے دوسرے درخت کی اوٹ تک انتہائی احتیاط کے ساتھ چلتا ہوا میں بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں نے زندگی بڑے بڑے ویرانے میں بسر کی ہے۔ کئی عجائبات دیکھنے میں آئے۔ لیکن جو منظر وہاں دیکھا۔ وہ مرتے دم تک نہ بھولوں گا.... گاٹے کے قریب ایک قبر کے پاس بڑا سا چولھا بنا ہوا تھا۔ اس میں آگ جل رہی تھی۔ کچھ برتن پڑے تھے، پانی کا ایک کورا مٹکا.. ان سب چیزوں کے درمیان ایک عورت...!“

”عورت...؟“ سب کے حلق سے نکلا۔

”ہاں عورت....! بیس اکیس برس کے قریب ہوگی، اس قدر حسین اور پُرشباب کہ زبان بیان نہیں کر سکتی، میں تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سوچا، نہ معلوم یہ پری ہے سچ مچ کی، یا کسی چڑیل نے پری کا روپ دھارا ہے۔ درخت کے تنے کے ساتھ لگا ہوا

میں چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ ۔ ۔ ۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایسی کالی رات کو، آبادی
سے پرے ویرانے، بلکہ قبرستان میں کسی نوجوان اور حسین عورت کی یہ جرأت کیونکر ہوسکتی
تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ دیکھیں، اب یہ عورت کیا کرتی ہے ۔ ۔ ۔ اس نے میرے دیکھتے
دیکھتے چولہے میں اور لکڑیاں ڈال دیں، آگ بھبک اٹھی، پھر اس نے سر سے دوپٹہ
اتار دیا، اس کے سیاہ بال دکھائی دینے لگے، اس نے مینڈھیوں کو کھولا اور پھر ساری
چوٹی کھول کر بال بکھرا دیئے اور روئی کی صدری کے بٹن کھولنے لگی۔ صدری کے نیچے
ایک مخملی ویسکٹ پہن رکھی تھی، اس کے بٹن کھول کر اسے بھی اتار دیا، اور جب اس
نے قمیص کے بٹن بھی کھولنے شروع کئے تو میرا دل دھڑکنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ باگورو !..
باگورو!... بٹن کھولنے کے بعد اٹھا کر قمیص کو بھی اتار دیا، اب اس کے اوپر والے
حصے پر ایک تار بھی نہ تھا۔ آپ لوگ میری حیرانی کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں، اس وقت
مجھے کچھ اور گرد و پیش کی کچھ خبر نہ تھی، دل دھڑک رہا تھا، نہ معلوم یہ عورت کیا کرنے کو تھی
میں آنکھیں پھیلا کر حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور اب جو اس نے اپنی
شلوار کا ازار بند کھینچا، تو میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا ۔ چند لمحوں تک میری
حالت کچھ عجیب سی ہوگئی۔ میں نے سمجھا کہ یہاں ضرور بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن ہے،
اتنے میں پانی کے گرنے کی آوازیں آنے لگیں، میں نے جھجکتے ہوئے اس طرف
نظر ڈالی تو عورت نے پانی کا مٹکا، کالی گائے کے سر پر سینگوں میں پھنسا کر رکھ دیا تھا
ایک ہاتھ سے اس نے مٹکا تھام رکھا تھا، دوسرے سے لوٹے بھر بھر کر پانی اپنے
بدن پر ڈال رہی تھی۔ نہا کر اس نے ایک چادر سے بدن پونچھا، بغیر کپڑے پہنے اس نے
ایک رنگین ٹوکری میں سے زیور نکال کر پہننے شروع کر دیئے۔ انگوٹھیاں، گوکھرو،

چونک، نوریتریاں، کنٹھا، بازوبند، بالیاں، غرض وہ سر سے پاؤں تک سونے سے زرد ہو گئی۔ ...."

ہم میں سے ایک نے کہا۔ "ایسی سردی میں اس نے ... کپڑے نہیں پہنے ہے؟"

"نہیں ... یہی تو حیرانی کی بات ہے۔ اب اس نے ایک چھوٹی سی رکابی سے کپڑا سرکایا۔ اس میں گندھا ہوا آٹا تھا، چولھے پر توا رکھا، اور آٹے کو پیڑے کے انداز میں لپیٹ کر توے پر ڈال دیا اور اسے گھی میں تلنے لگی ....

اب میں سوچنے لگا، کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے، میں نے سنا تھا کہ چڑیل کی کمر کا پچھلا حصہ کھوکھلا ہوتا ہے یعنی ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی، دوسرے بھوتوں کا سایہ نہیں ہوتا اور اس عورت کا سایہ صاف نظر آ رہا تھا اور پھر ہر چیز اس قدر واضح تھی کہ میں نے سمجھ لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ایک تو بھوت چڑیلوں پہ میرا یقین نہیں تھا، لیکن اس عورت کا واقعہ اس قدر عجیب تھا کہ یقین نہ آتا تھا کہ ایک کمسن اور حسین عورت ایسی سنسان جگہ پر آنے کی جرأت کر سکتی ہے۔ خیر! اب میں نے قدم بڑھایا اور اس سے چند قدم پرے کھڑی ہوئی گائے کی پیٹھ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا .... گائے کے جسم کو چھو کر میرا یقین پختہ ہو گیا کہ یہ کوئی غیر معمولی ہستی نہیں ہے، اب میں کھڑا ہوا ہی تھا کہ اس عورت کی نظر میرے پاؤں پر پڑی اور پھر دفعتًہ اس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اب دفعتًہ اس کی صورت مسخ ہو گئی۔ باچھیں چر گئیں، دانت چمکنے لگے، نتھنے پھیل گئے اور آنکھیں جیسے ابل پڑیں .... ہاتھوں کی انگلیوں میں تشنج کی سی کیفیت پیدا

ہوئی، اور وہ بال پھیلائے "کلیجہ کھاؤں گی، کلیجہ کھاؤں گی" کہتی ہوئی میری طرف جھپٹی۔ اس کی آواز سن کر مجھے تسلی ہو گئی کہ یہ کوئی عورت ہے، چڑیل نہیں، جوں ہی وہ میرے قریب پہنچی، میں نے مسکرا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ وہ وحشیوں کی طرح ہاتھ کاٹنے لگی۔ میں نے زور سے اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ گرتے ہی پھر اٹھ کر مجھ سے گتھم گتھا ہو گئی۔ اس عورت میں بلا کی طاقت تھی۔ لیکن ظاہر تھا، ہم دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ ہو سکتا تھا، میں نے تنگ آ کر اس کے بالوں کو ہاتھ میں پکڑ کر خوب جھنجھوڑا اور اس کی پیٹھ پر دو تین دھپ بھی لگائے لیکن صرف اتنے زور سے، جو اس کی قوت برداشت سے باہر نہ ہوں، پھر میں نے اس کی نازک گردن کو اپنی لمبی انگلیوں کی گرفت میں لے کر کہا۔ "دیکھو! اگر ایسی چھچھوری حرکتیں کرو گی، تو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا . . . ." وہ بیچاری خاموش ہانپ رہی تھی، میں نے اسے پرے دھکیل کر کہا۔ "ذرا وہاں کھڑی ہو کر بات کرو مجھ سے . . . ."

اب اسے بھی اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں اس کی حقیقت سمجھ چکا ہوں اس لئے زیادہ حیل و حجت فضول تھی۔ دفعتًہ اس نے چادر اٹھائی اور اپنے جسم پر لپیٹ لی، اور اس کی آنکھیں نیچے جھک گئیں، میں نے اصل مقصد جاننے کی کوشش کی، وہ زمین کی طرف دیکھتی رہی اور جھجک جھجک کر باتیں کرتی رہی۔ اب اسے مجھ سے ڈر معلوم ہوتا تھا، اس کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ چار برس پہلے اس کی شادی ایک بڑے ساہوکار سے ہوئی تھی، لیکن اب تک وہ اولاد کے لئے ترس رہی تھی اور اس کا شوہر دوسری شادی پر تلا ہوا تھا۔

ادھر یہ پریشان تھی، آخر ایک بوڑھی عورت نے اسے یہ نسخہ بتایا تھا کہ کالی گائے کے سر پہ پانی کا مٹکا رکھ کر قبرستان میں اشنان کرے، اور وہاں سے ایک پراٹھا پکا کر لا، اور کسی اولاد والی عورت کو کھلا دے، تو اس کے بچے مر جائیں گے، اور تیرے گھر اولاد ہو گی' —— میں نے یہ سنا، تو قہقہہ مار کر ہنسا، اس وقت گھنیوں سے لدی ہوئی وہ عورت آگ کی روشنی میں بہت حسین دکھائی دے رہی تھی، میں نے آگے بڑھ کر اس کے رخسار کو چھوا، وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ کیسی نرم جلد تھی اس کے چہرے کی، اور کس قدر بھولی صورت تھی اس کی —— !

اس نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے، کہ میں ایک شریف گھرانے کی عورت ہوں"!

میں نے ہنس کر کہا "مجھے معلوم ہے کہ تو شریف عورت ہے، لیکن اے نیک بی بی! میں بھی بھلے خاندان کا آدمی ہوں، پرائی استری کی طرف بری نیت سے دیکھنا پاپ سمجھتا ہوں، گورو کا دیا کھاتا ہوں، انتہائی مجبوری کے سوا کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ اس لئے تو خاطر جمع رکھ. . . . لیکن یہ بات سن لے، کہ تو نے جو طریقہ اولاد حاصل کرنے کا اختیار کیا ہے، یہ بہت بڑا پاپ ہے۔ کسی کا برا چاہنا بھلے آدمی کا کام نہیں ہے، بڑے بڑے رشیوں، گوروؤں، نبیوں، غرض کسی نے بھی اولاد حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں بتایا، جو تو اختیار کر رہی ہے۔

یہ کہہ کر میں نے کچھ داڑھی کو سنوارا، کچھ پگڑی کو درست کیا، انگوچھے سے

منہ اور بازوؤں کی گرد پونچھی ۔ ۔ ۔ ۔ اندر کھٹی میں خاصا گڈیل جوان تھا ۔ ۔
وہ مسکرا دی ــــ"

بابا ننگا سنگھ خاموش ہو گئے۔ ہم نے کہا "بابا جی! اس کے بعد تم نے کبھی ملنے کی کوشش کی ــــ؟"

"ہاں، لیکن پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ ۔ ۔ معلوم ہوتا ہے کہ پھر اسے میری کوئی ضرورت ہی نہیں رہی ہوگی۔ ۔ ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے خفا ہو گئی ہو؟"

"کیا تم نے کوئی خفگی کی بات کی تھی ــ؟"

"نہیں، اسے میری کوئی حرکت ناپسند نہیں تھی، البتہ جب وہ جانے لگی تو میں نے اس کا کنٹھا پکڑ لیا۔ وہ حیران سی رہ گئی۔ بولی ــــ "تمہارا مطلب"
میں نے جواب دیا، کہ اس سے پہلے تو میرا کوئی مطلب ہی نہیں تھا، میرا اصل مطلب یہی ہے، اس نے کہا کہ اکیلی جان کر میرے زیوروں پر ہاتھ ڈال رہے ہو۔ میں نے جواب دیا "چلو گاؤں میں جتنے آدمیوں کے سامنے کہو، تمہارے زیورات اتار لوں۔" اسے میری یہ تجویز پسند نہیں آئی چنانچہ اس نے سارے زیورات میرے حوالے کر دیئے۔ ۔ ۔ "

یہ کہہ کر بابا جی نے سر جھکا لیا، اور پھر جیسے گم ہو گئے۔ ایک بزرگ بولے "دیکھا، ایسی پاپی ہوتی ہیں عورتیں ۔ ۔ ۔ ؟"

یہ سن کر میں دل میں سوچنے لگا۔ مار دن گھٹنا پھوٹے آنکھ، اس قصے کو کیا ہی نشان دار اخلاقی نتیجہ نکالا گیا ہے، سب لوگ آپس میں عورتوں کی بدمعاشی اور ان کی چالاکی پر رائے زنی کرنے لگے، لیکن بابا جی آنکھیں نیم وا

گئے چپ چاپ بیٹھے رہے۔

"واہگورو! واہگورو!!" ان کے لب ہلے۔

میں نے انہیں افسردہ دیکھ کر پوچھا — "باباجی! آپ نے جو اس عورت کے زیورات اتار لئے۔ غالباً آپ کو اسی بات کا دکھ ہو رہا ہے اس وقت —!"

باباجی کے بھاری ہونٹ ہلے، اور انہوں نے میری طرف پرنم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سرد آہ کھینچی اور بولے — "نہیں مجھے اس کا دکھ نہیں، لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ پچاس برس گذرنے کو آئے۔ واہگورو اکال پرکھ نے مجھے ایسا موقع پھر کبھی نہیں بخشا —"

آشیانہ

کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی رُوزی رُوزی اون کا سویٹر بدن سے کچھ اس طرح چپکا ہوا تھا کہ مجھے بار بار اوڑھنی کو سینے پر ڈالنا پڑ رہا تھا۔

اس دوران میں ممکن ہے کہ میرا چہرہ بھی گلابی ہو گیا ہو۔ میں نے دبی دبی نظروں سے دوسری لڑکیوں کے کپڑوں کا جائزہ لیا کہ کہیں میرا لباس اس موقعے کے لئے ضرورت سے زیادہ شوخ تو نہیں ہے۔ لیکن سب لڑکیاں خوب سج دھج کر آئی تھیں۔ ان میں سے ایک نوخیز حسین کمسن لڑکی چھوٹے موزے پہنے جو اس کی سڈول پنڈلیوں تک بھی نہیں پہنچتے تھے ایسے کھلنڈرے پن کا اظہار کر رہی تھی جیسے وہ انٹرویو کیلئے نہیں کلب میں پنگ پانگ کے لئے آئی ہو۔

موسم سرما کی نہایت خوشگوار صبح تھی۔

بڑے بڑے ستونوں والی عمارت کے برآمدے میں بچھی ہوئی طویل بنچوں پر ہم

سب لڑکیاں بیٹھی تھیں بعض آپس میں چہل کر رہی تھیں۔ لیکن میں سب سے الگ تھلگ دُبیا دھوپ رمائے بیٹھی تھی۔ میری آنکھیں کبھی برآمدے کے آگے پھیلے ہوئے مخملیں گھاس کے لان پر پھیلنے لگتیں اور کبھی اونچی اور گھنی باڑھ میں، اڑنگا لگاتے آہنی پھاٹک کو تاکنے لگتیں۔

"وہ عیسائی لڑکی سلیکٹ ہو جائے گی۔" آواز آئی

"کیوں؟"

"کیسی طرحدار ہے وہ۔"

دوسری نے تامل کیا اور پھر کہا۔ "یہ بھی اچھی ہے۔"

"کون؟"

"گلابی سویٹر والی۔"

میں شرما سمٹ اور لرز کر رہ گئی۔ توبہ! ایسی شرم!!

ذہنی کوفت سے بچنے کے لئے میں نے کلائی پر بندھی ہوئی رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ دس بجنے کو تھے۔

لڑکیاں آپس میں کہہ رہی تھیں۔ نہ جانے کون انٹرویو لے گا۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سرکاری دفتر تو ہے نہیں کہ وقت کی پابندی کی جائے۔

"ہائے تیرا جی تو چاہتا ہوگا کہ فوراً پی۔ اے بنائی جاؤں۔"

اس قسم کی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بغل والا دروازہ کھلا اور تنگ فراک اور الجھے بالوں والی ایک لڑکی نے آواز دی

"مس پربھا مصرا۔"

مس پربھا مصرا پہلے تو بدک کر یوں چونکیں جیسے وہاں سے گٹ بھاگ کر سیدھی گھر پر دم لیں گی۔ لیکن بغیر صحیح حالات کا احساس ہونے پر دروازے کی جانب بڑھیں اور چق کی اوٹ میں غائب ہو گئیں جب لوٹیں تو بغیر رُکے پھاٹک کا رُخ کیا۔ ایک طرار لڑکی نے آواز دی "حضور! انٹرویو ختم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تماشہ ختم اور پیسہ ہضم، ابھی تشریف رکھئے۔"

جب وہ جھینپ کر بنچ پر بیٹھ گئیں تو لڑکیوں نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ لڑکیاں باری باری بلائی جانے لگی۔ تعداد میں کل گیارہ لڑکیاں تھیں۔ میرا نمبر آٹھواں تھا۔

اپنا نام پکارے جانے پر میں سنبھل کر اٹھی اور ایک چھوٹی سی فائل بغل میں دابے چق اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔

بھاری بھرکم آفس ٹیبل کے پیچھے اکہرے بدن اور گورے رنگ کا تقریباً چھبیس سالہ شخص سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی پتلی پتلی اجلی انگلیاں اس کے گھنے بالوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ اس نے میری جانب دیکھے بغیر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی اس کے ہاتھ کے پیچھے چھپا ہوا چہرہ دیکھ نہ سکی۔

کمرہ طویل تھا۔ دو بڑی کھڑکیوں پر رنگین پردے جو اب ٹیا سے ہو گئے تھے، لٹک رہے تھے۔ ایک گوشے میں چھوٹا سا پیانو دھرا تھا۔ اس کے اسٹینڈ پر میوزک کی کتاب کھلی پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ روکھے سوکھے بالوں والی لڑکی پیانو بجانا سیکھ رہی تھی۔ کیونکہ اس نے بلاتامل "گاڈ سیو دی کنگ"

ٹھٹا نا شروع کر دیا۔

"نام؟"

بتا دیا گیا۔

"عمر؟"

"بیس برس۔"

"تعلیم؟"

"ایف، اے، پتا جی کی وفات کے باعث آگے نہ پڑھ سکی۔"

"شادی شدہ؟"

"جی نہیں۔"

اب اس نے اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ پھر منہ پھیر لیا۔

"والدہ ساتھ رہتی ہیں؟"

"جی نہیں، میں یہاں مسز اسمتھ لاج میں تنہا رہتی ہوں۔ نوکری کر کے ماں اور ایک چھوٹے بھائی کے گزارے کے لئے روپے بھیجتی ہوں ہر ماہ۔"

"تعلیم معمولی ہے۔" اس نے بے حس آواز میں کہا۔

"جی مجھے پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ناکہ . . . . ٹائپ اور شارٹ ہینڈ جانتی ہوں۔ دو تین جگہ کام بھی کر چکی ہوں۔ چند نظمیں اور افسانے . . . ۔ یہ کہہ کر میں نے بغل سے فائل نکالی۔

"آپ جا سکتی ہیں۔"

میں ہکا بکا رہ گئی۔ یہ انٹرویو تھا کہ مذاق؟

برہم ہو کر میں واپس دروازے کی جانب بڑھی ___ "گاڈ سیو دی کنگ" اب
بھی دھیمے سروں میں بج رہا تھا

ہر چند مجھے ملازمت کی سخت ضرورت تھی لیکن اس ناخوشگوار انٹرویو کی یاد کو
میں نے پہلے ہی دن بھلا دیا اور ایک مرتبہ پھر اخبار کے کالموں میں نوکری کے اشتہارات
تلاش کرنے لگی۔
دوپہر کے وقت لاج کے برآمدے میں کپڑے کی آرام کرسی پر نیم دراز میں اپنے
خیالات میں محو تھی۔ دُور لان پر لڑکیوں کے بیڈمنٹن کھیلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
ابھی اتنا میں ڈاکیہ چٹھی لایا۔ پڑھنے پر معلوم ہوا کہ مجھے وہیں نوکری مل گئی ہے
اور دوسرے روز دفتر حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔
بوکھلاہٹ میں مجھ سے نہ جانے کیا حرکت ہو گئی کہ جینی نے دور ہی سے ریکٹ گھما کر
پوچھا "کوئی خیریت تو ہے نا؟"
"او ہاں ہاں .... بالکل بالکل"۔
یہ کہہ کر میں نے کمرے میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔
اول تو مجھے ملازمت ملنے کی اُمید تک نہیں تھی۔ دوسرے میں یہ ملازمت کرنا
بھی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس موقع پر میرے لئے ایک سو پچیس روپے ماہوار کوئی
معمولی رقم نہیں تھی۔ سوچا کوئی پابندی تو ہے نہیں، بہتر کام ملنے پر فوراً چھوڑ دوں گی
.... چنانچہ دوسرے روز ڈیوٹی پر پہنچ گئی۔
وہی انٹرویو والا کمرہ تھا اور ایک چھوٹے کتے اور "گاڈ سیو دی کنگ"

مجانے والی لڑکی کے سوا وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔

میں دستانے اتارے بغیر کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ لڑکی کی عمر بمشکل تیرہ برس ہو گی۔ قد ضرور لانبا تھا۔ لمبوترہ چہرہ۔ خدوخال مناسب۔ پتلی پتلی ٹانگیں بدن سپاٹ۔

ہماری آنکھیں ملیں تو پہلے تو ہیں خوب باچھیں پھیلا کر مسکرائی۔ پھر سنبھل کر بزرگانہ انداز میں پوچھا "یہیں رہتی ہو"

"ہاں — جی"

"پڑھتی ہو"

"ہاں — جی"

"یہ —" میں نے خالی کرسی کی جانب اشارہ کر کے پوچھا "آپ کے . . . . رشتہ دار ہوتے ہیں"

"نہیں — جی"

لڑکی کی چھوٹی بحر میں باتیں سن کر کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ آگے کچھ سوال کروں۔ لیکن اس نے خود ہی بتا دیا "کرایہ دار ہیں"

یہ کہہ کر اس نے پیانو کے ایک سُر پر زور سے انگلی ماری جس کی آواز دیر تک فضا میں لرزاں رہی . . . .

"آپ آگئیں" مالک نے بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر پھرتی سے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر فرمایا "ہر روز تھوڑا سا تحریری اور ٹائپ کا کام ہوا کرے گا۔ اس کے بعد آپ چاہیں تو جا سکیں گی"

تھوڑا سا کام پھر چھٹی اور پھر ہر ماہ ایک سو پچیس روپے!! معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں شہزادی ثریا جبیں ہوں اور حضرت الف لیلیٰ والے ہارون الرشید۔۔۔

"میری جان و دل کی ملکہ" اس نے کہا

میرا دل اچھل کر حلق میں آن رہا۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی نہا کر چلا آ رہا تھا۔ چہرہ تر و تازہ تھا اور کالے اور گھنے خمدار بال خاصے دلکش دکھائی دے رہے تھے۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ زہر گھول رہے تھے۔ دو لمحے میں اس نے سر اٹھایا اور خشک و بے کیف آواز میں پوچھا۔

"لکھ چکیں آپ؟"

"جی لکھ چکی ہوں" میں نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

"میری جان و دل کی ملکہ!

اس طرح مخاطب کئے جانے پر آپ کو حیرت تو ضرور ہوگی اور شاید آپ خفا بھی ہوں۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ میں بزدل ہوں۔ دل کی کیفیت مردانہ وار زبانی عرض نہ کر سکا۔ اس لئے خط لکھ رہا ہوں۔ آپ کو انکار کرنا تھا اور انکار ہی کرنا ہوگا۔ اس لئے جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے آپ کو میرا طریق کار رد تو نہیں کر سکتا۔۔۔ بھلا میں ہی اظہار عقیدت کرنے سے کیوں رہ جاؤں"

یہ ایک طویل محبت نامہ تھا جسے لکھتے لکھتے میرے پسینے چھوٹ چھوٹ گئے۔ خدا خدا کر کے یہ ختم ہوا اور جب چھٹی پا کر چھوٹ آئی تو اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا۔

عجیب بات تھی۔ شاید مجھ سے اظہار عشق کیا جا رہا تھا۔ لیکن نہیں۔۔۔ زیادہ

پڑھا لکھا اور بھلے خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ ممکن ہے اس کی سچ مچ کوئی مجبوری ہو
سارا دن سوچتی رہی کہ پھر جاؤں یا نہ جاؤں۔ بالآخر طے کیا کہ میری بلا سے مجھے
تنخواہ سے غرض ہے۔

تین دن تک اُن کی شکل دکھائی نہیں دی معلوم ہوا بہت مصروف ہیں۔
البتہ ان کے چند انگریزی کے سرٹیفکیٹ ٹائپ کرنے پڑے۔ چوتھے روز صورت
نظر آئی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی بولے "جانِ بہار!

میں نے پھر ٹھٹک کر اُن کی جانب دیکھا۔

"لکھ چکیں؟" انہوں نے خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی — بس" میں نے جلدی سے قلم گھسیٹا۔

"جانِ بہار! — تمہارا پیغام مجھ تک پہنچ گیا ہے۔ میرے جسم کا رواں رواں
تمہارا شکر گزار ہے۔ تپتے ہوئے ریگستانوں سے بچا کر تم نے مجھے اپنی سرمئی آنکھوں
کی گھنی پلکوں کے سائے تلے پناہ دی ہے ...."

اس محبت نامے کا مضمون بھی طویل تھا

چٹھی ختم ہونے پر انہوں نے کرخت لہجے میں پوچھا: "لکھ چکیں؟"

"جی" میں نے مرعوب ہو کر جواب دیا۔

اس رات بستر پر لیٹے لیٹے میں دیر تک اس موضوع پر غور کرتی رہی۔ آخر اس میں
راز کیا تھا۔ یہ محبت نامے مجھ سے کیوں لکھوائے جا رہے تھے۔ میں اس کی ملازمہ تھی
اس لئے میرے لئے شکایت کی جگہ تو نہیں تھی لیکن اپنی عشق بازی کے خطوط لکھواتے
وقت انہیں اس بات کو محسوس تو کرنا چاہئے کہ ایک کنواری لڑکی اس قسم کی کھری

رازونیاز کی باتیں لکھنے سے قدرتاً جھجک اور شرم محسوس کرتی ہے۔

اس ادھیڑبن میں مجھے چیخوف کی ایک کہانی یاد آگئی جس میں ایک عورت فرضی عشاق کو خطوط لکھا کر اپنے دل کی رومانی کیفیت کی تسکین کر لیا کرتی تھی... وہاں ایک عورت کا معاملہ تھا۔ یہاں ایک مرد تھا... مجھے اپنے مالک سے ہمدردی سی ہو گئی۔

دو تین خط میں نے ہمدردی کے جذبے کے تحت لکھ ڈالے۔

ایک روز خط کے دوران میں انہوں نے لکھوایا

"... تمہاری سانس میں مولسری کی خوشبو آوارہ پھرتی ہے۔ تمہارے بال کشمیر کے کھیتوں میں اُگنے والے زعفران کی مانند ہیں۔ تمہارے رخساروں پر گلاب کھلتے ہیں۔ تمہارے ہونٹ ..." غرض اس طرح محبوبہ کا سراپا بیان کر دیا۔ لیکن یہ الفاظ اس قدر درومندانہ انداز اور رازدارانہ مدھم آواز میں کہے گئے کہ مجھے خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب کچھ مجھے کہا جا رہا ہے... پہلے کبھی یہ خیال اس شدت کے ساتھ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

میرے دل پر وجد سا رہنے لگا۔ چلتے پھرتے، کھاتے پیتے ہنستے بولتے دل میں دبی دبی سی آواز سنائی دے جاتی "وہ مجھے پیار کرتا ہے۔" اور متضاد جذبات کے تحت کبھی ان خیالات پر میں جھنجلا اُٹھتی اور کبھی ڈھیلی پڑ جاتی۔

یہ سب باتیں میرے ذہن کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھیں۔ میں اعلانیہ اُن کا اعتراف کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

انہیں خطوط کے ذریعے سے مجھے ان کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم

ہوگیا اور بعض اوقات محسوس ہونے لگتا جیسے مجھے اُن سے نامعلوم سا لگاؤ بھی ہے۔ لیکن ان باتوں سے کیا حاصل، ممکن ہے وہ مجھ سے چھیڑ خانی کر رہے ہوں یا ممکن ہے اُن کی کوئی محبوبہ پہلے ہی موجود ہو — اس خیال سے میں کچھ افسردہ ہو گئی۔

ایک روز انہوں نے لکھوایا۔ . . . "مجھے ملازمت ملنے کی خاصی امید ہے۔ اگر میری اُمید بر آئی تو پھر مجھے یقین ہے کہ تم اِدھر اُدھر ملازمت کرنے کے عوض ایک معزز مرد کی بیوی بننا پسند کرو گی . . . "

یہاں پہنچ کر میرا ہاتھ رُک گیا۔ گال تمتما اُٹھے۔ جی میں آئی کہ رائٹنگ پیڈ حضرت کے منہ پہ دے ماروں . . . مگر اس کا چہرہ پتھر کے مانند بے حس اور جامد تھا۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ فوراً ملازمت ترک کر دوں گی۔

گھر پہنچی تو گئی رات تک سوچتی رہی . . . ماں کی باتیں یاد آئیں کہ بیٹی! اگر تیرا ایک بھائی ہوتا تو باپ کے بعد تیری زندگی بھی سدھر جاتی اور میری مٹی بھی ٹھکانے لگ جاتی۔ میں نے کہا، ماں! میں آپ کے لئے کماؤں گی۔ ماں بولی۔ نوجوان بیٹی کی کمائی بڑی خطرناک چیز ہے ہمارے سماج میں . . .

صبح ہونے تک میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بلا چون و چرا کئے بروقت دفتر دفتر پہنچ گئی . . . لیکن مسلسل چار دن تک جناب کی صورت دکھائی نہیں دی۔ البتہ چند فضول کاغذ ٹائپ کرنے کو مل جاتے تھے۔

پانچویں دن صورت دکھائی دی۔ حسبِ عادت کچھ بولنے کے بجائے چپ ہو کر بیٹھ گئے میں بھی حسبِ معمول سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مسلسل سکوت سے گھبرا کر میں نے کن انکھیوں سے

میز پر دھرے ہوئے گورے مردانہ ہاتھ کی جانب دیکھا۔ میں اس ہاتھ سے کافی مانوس ہو چکی تھی۔

بالآخر انہوں نے پھر سکوت کو توڑا۔

"آپ کا مہینہ پورا ہو چکا ہے۔ میں نے خود ملازمت اختیار کر لی ہے۔ میں یہاں سے آج ہی چلا جاؤں گا۔ آپ اپنی تنخواہ لیتی جائیے گا۔"

میں چپ رہی۔

"میری گڑیا" انہوں نے کہا۔

میں نے چپ چاپ لکھنا شروع کر دیا۔

"میری گڑیا" انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اداس مت ہو۔ اب ہم ایک دوسرے کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے . . . ."

اس طرح وہ [illegible] ری ہمدردی اور پیار کے الفاظ لکھواتے [illegible] گئے۔ آخر یہ خط ختم ہو گیا۔

انہوں نے نوٹوں کا پلندہ بڑھا دیا جسے میں نے [illegible] نہیں۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور تھوڑے تامل کے بعد بولے "اچھا گڈ بائی"

وہ اندر چلے گئے ـــ اور میرا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ سچ مچ ان [illegible] کی ہیروئن کوئی اور لڑکی تھی۔

میں ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ روکھے بالوں والی لڑکی نے آ کر کہا: "کہتے ہیں کہ اب آپ جا سکتی ہیں۔"

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈی اٹھائی اور لڑکھڑاتی ہوئی قدموں سے

سے باہر نکل آئی۔ . . . تو یہ خواب تھا!

میں نے ہزار دل کڑا کیا لیکن دوپہر کا کھانا نہ کھا سکی اور پھر میرے قدم خواہ مخواہ اپنے دفتر کی جانب بڑھنے لگے۔ بہانہ معقول تھا۔ مہینہ بھر کام کرنے کے بعد سرٹیفکیٹ لینے کا حق تو پہنچتا تھا مجھے۔

ڈگمگاتے قدموں سے دروازے کے نزدیک جا کر دستک دی۔ کوئی سننے والا نہیں تھا۔ دوبارہ، سہ بارہ دستک دینے پر دروازہ کھلا اور روکھے بالوں اور سپاٹ جسم والی لڑکی کی صورت ایک بار پھر دکھائی دی۔ ناک چڑھا کر بولی۔ "آپ؟"

"ہاں — ان سے کام ہے ذرا . . . "

"وہ تو چلے گئے۔"

میرا دل بیٹھ گیا۔ "سامان بھی لے گئے۔"

"ہاں۔"

میں لوٹی تو مجھے اپنے ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی تلخ اور دردناک مسکراہٹ کا احساس ہوا۔ ساری شام ادھر اُدھر گشت کرنے میں گزار دی۔ تھک گئی تو پارک میں کچھی ہری بنچ پر جا بیٹھی۔

نہ جانے کب تک بیٹھی رہی۔ لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ ہر چہار جانب تاریکی پھیل گئی ہے اور چند کالجیٹ بالوں کو کھینچ کر پیشانی پر ڈالے بزعم خود دلیپ کمار بنے میرے اردگرد پھیرے بدل رہے ہیں تو میں نے گھر کا رخ کیا۔

مسز ہمت لارج، کوٹھی کی شکل کی عمارت تھی۔ میرا کمرہ پچھواڑے کی جانب تھا۔ سب لڑکیاں اپنے اپنے کمروں میں دبکی پڑی تھیں سردی کے مارے۔

جب میں نے تالا کھولنے کو چابی بڑھائی تو دیکھا کہ تالا ٹوٹا پڑا ہے۔ میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

قریب تھا کہ میری چیخ نکل جائے کہ کمرے میں برقی روشنی دکھائی دی۔ جرأت سے کام لے کر میں آگے بڑھی۔ جھانک کر دیکھا تو انہیں حضرت کو سوٹ کیس اور بستر سمیت کرسی پر براجمان پایا۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ پورا کھول دیا اور تعجب سے پوچھا "آپ گئے نہیں؟"

اس نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"جاتا کیسے، میرے پاس کرائے تک کو پیسے نہیں بچے"۔

میں نڈھال ہو کر دروازے کے قریب ہی کھڑی رہ گئی۔

اُس نے پہلی بار مسکراتے ہوئے پوچھا "کرایہ دے دو گی نا"؟

میری آنکھیں پُرآب ہو گئیں اور میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں ہکلا کر جواب دیا۔

"ہاں ——"

کالے کوس

چھوٹا سا قافلہ، جو تین عورتوں اور ایک مرد پر مشتمل تھا، دم لینے کے لئے کنوئیں کے قریب ڈیرا ڈالے تھا۔

وہ لوگ مسلمان تھے — اور وہ دن اس سرزمین کو آزادی ملنے کے دن تھے جسے آج کل پاکستان اور ہندوستان کہتے ہیں۔

مرد، ۳۲ یا ۳۳ برس کا گرانڈیل شخص تھا۔ سر پہ چھوٹی سی پگڑی سے دو چار بل . . . گلے میں کرتہ، اس کے نیچے چوڑی نیلی دھاری کا تہبند — ناک نقشے میں کوئی عیب نہیں تھا۔ ڈاڑھی استرے کی یورش سے کئی دنوں سے بے نیاز تھی۔ مونچھیں خوب بڑی بڑی، کبوتر کے پروں کی مانند، نیچے کو گری ہوئیں۔ آنکھیں، متجسس اور تیز جن میں اب تھکن کے آثار ہویدا تھے۔ جسم کے پھیلے ہوئے ڈھانچے۔ لمبی لمبی باہوں اور طویل ٹانگوں کے باوجود وہ موٹا نہیں تھا۔ اس کے بدن کی پرورش میں ڈنٹر، بیٹھک،

اور باداموں کا ہاتھ نہیں بلکہ اس کے جسم کے ریشے ریشے کی پرورش گیہوں یا مکی کے آٹے اور ساگ بھات پر ہوئی تھی۔ اس کا نام غلام محمد عرف گاماں تھا ــــ وہ اچھا آدمی نہیں تھا ــ اس میں ایک ہی اچھی بات تھی، وہ یہ کہ اسے نیک ہونے کا دعوےٰ نہیں تھا۔ یہ چیز اس کے چہرے ہی سے ظاہر تھی۔

تین عورتیں ــــ ایک بوڑھی، ایک جوان اور ایک نوخیز، بالترتیب اس کی ماں بیوی اور بہن تھیں۔

بوڑھی پانچوں نمازیں پڑھ پڑھ کر سارے ہندوؤں خصوصاً سکھوں کے نیست و نابود ہو جانے کی دعائیں مانگا کرتی تھی سوائے پھلور سنگھ کے ــــ پھلور سنگھ عرف پھلورا اس کے بیٹے کا دوست تھا۔

بیوی کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ سیدھے سادے خد و خال ــــ شادی کو آٹھ برس گزر چکے تھے لیکن ایک بلونگڑا تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ گامے کے دوست پرمعنی انداز سے اسے کہنیوں سے ٹہوکے دے کے پوچھتے "کہو استاد! آخر ماجرا کیا ہے؟" ــــ اس پر گاماں اچھا انسان نہ ہونے کے باوجود لمحہ بھر کے لئے آسمان کی جانب دیکھتا اور کہتا ــــ "جو اللہ کی مرضی!"

"ہاں بھئی آڑے وقت میں اللہ کے سوا اور کون کام آتا ہے!"

اس کی بہن عائشاں حسین اور نازک اندام تھی۔ اس اعتبار سے وہ گامے سے بہت مختلف تھی ــ اس کی بابت گامے نے اڑتی ہوئی خبر سنی تھی کہ وہ گاؤں کے ایک چھوکرے اللہ دتے کو میٹھی نظروں سے دیکھتی ہے اور اللہ دتہ بھی اس کے فراق میں سرد آہیں بھرتا ہے ــ گامے نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب کبھی وہ انہیں

اکٹھا دیکھ پائے گا تو گنڈاسے سے ان کے سر اڑا دے گا۔ لیکن باوجود کوشش کے گامے کو اس افواہ کی صداقت کا ثبوت نہیں مل سکا۔

چار ناخوش انسانوں کا یہ خانماں برباد قافلہ پیادہ پا پاکستان کو جا رہا تھا۔ ان کی کہانی دوسرے لاکھوں مسلمانوں کی کہانی تھی جو مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب کو جانے کے لئے مجبور کئے گئے تھے۔

گاماں — لٹیرا بھی تھا اور قاتل بھی۔ بدمعاش بھی تھا اور ڈاکو بھی — لیکن ان سب برائیوں کے باوجود وہ کسان تھا . . . . ہل چلانا اور بیج بونا اس کا آبائی پیشہ تھا۔

ملک کی تقسیم کے بعد دفعتہً ساری خدائی ان کی دشمن ہو گئی۔ گھر کی چار دیواری تک انہیں بھینچ کر مار ڈالنے کی دھمکیاں دینے لگی۔ وہ دھرتی جو پہلے بجا سرماں کے تھی۔ اب گرم ہو کر اس قدر تپ گئی تھی کہ اس پر اس کے بچوں کا چلنا پھرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ زمین جو پہلے ان کا پسینہ جذب کر کے سونا اگلتی تھی، اب ان کا خون پی کر بھی مطمئن نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک روز گامے نے گھر آکر کہا: "اب ہمیں جانا ہی ہو گا۔"

سامان ؟ ؟

اس پر وہ تلخ ہنسی ہنسا اور اس نے تینوں عورتوں کو بکریوں کے مانند گھر سے باہر ہانک دیا۔

اس کے بعد خونیں نظارے، آگ، دہشت، بھوک اور پیاس — مسلسل۔

بھلور سنگھ گامے کا دوست تھا۔ بڑے کاموں میں دونوں ساتھی رہے تھے۔

مل کر انہوں نے اچھا کام کبھی نہیں کیا تھا۔ بھلور سنگھ نے مشورہ دیا کہ ان کا کسی بڑے قافلے کے ہمراہ جانا خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ گاما نے سب کچھ بھلورے پر چھوڑ دیا اور وہ انہیں راتوں رات چوری چھپے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پہنچا دیتا۔ دن کے وقت وہ لوگ آرام کرتے اور رات ہوتے ہی پھر سفر شروع کر دیتے۔

ایک رات بھلورے کے آنے میں کچھ دیر ہو گئی تو مالک مکان جو ڈرپوک تھا۔ ان سے کہنے لگا بھئی! آج رات حملے کا سخت خطرہ ہے۔ ان کا وہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ ورنہ وہ خود بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور اسے بھی پھنسا دیں گے۔

گاؤں سے باہر بھی جان کا خطرہ کم نہیں تھا لیکن مجبوری کے عالم میں گاماں اللہ کا نام لے کر تینوں عورتوں سمیت وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

ہر چند گاماں مضبوط انسان تھا۔ اسے اپنے زور بازو پر بھروسہ بھی تھا لیکن مسلح ہجوم کا مقابلہ کرنا اس کی قوت سے باہر تھا اور پھر عورتوں کا ساتھ تھا!

انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ دن کے وقت کھیتوں، جھاڑیوں یا کسی اندھے کنوئیں میں چھپ جاتے اور رات بھیگ جانے پر چل کھڑے ہوتے۔

انہیں بھلور سنگھ سے جدا ہوئے دو راتیں گزر چکی تھیں اور تیسری گزر رہی تھی۔

رات بھیگ چکی تھی لیکن انہوں نے ابھی سفر جاری نہیں کیا تھا۔

چاندنی رات تھی لیکن آسمان پر ہلکا سا غبار چھایا ہوا تھا اس لئے چاندنی بہت اداس دکھائی دے رہی تھی۔

اس وقت وہ ایک ایسے کنوئیں کے پاس بیٹھے تھے جو ایک مدت سے ویران تھا۔ کنوئیں کی منڈھ گر چکی تھی۔ دو کچی دیواریں اس امر کی گواہ تھیں کہ کبھی یہاں

بھی رہٹ کی رون رون سنائی دیتی ہوگی۔ شاید الغوزوں کی تانیں بھی اٹھتی ہوں گی اور چنچل کنواریوں کے نقرئی قہقہے بھی فضا میں گونجتے ہوں ۔۔۔۔

یہ مقام سطح زمین سے قدرے بلند تھا۔ گاماں سر اٹھا کر دور دور تک نگاہ دوڑا رہا تھا۔ وہ اندازاً مغرب کی جانب بڑھ رہے تھے لیکن انہیں اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں اور پاکستان کی حدود سے کتنی دور ہیں۔

وہ قریب قریب نڈھال ہو چکے تھے۔ کاش بھلورے کا ساتھ نہ چھوٹتا تو شاید اب تک وہ منزل مقصود تک پہنچ گئے ہوتے۔

بوڑھی ماں کے ڈھیلے ڈھالے چہرے میں جھانکتی ہوئی بے رونق آنکھوں سے حیرت اور درماندگی کا اظہار ہوتا تھا۔ اپنی طویل زندگی میں اس نے اس قسم کے واقعات دیکھے نہ سنے تھے ۔۔۔۔ بیوی، بھوک، مسلسل پریشانی اور عزت و آبرو کے خوف سے بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کا سر ڈھلک کر دیوار سے ٹک گیا تھا۔

۔۔۔ عاشاں، وہ نسبتاً تازہ دم تھی۔ ایک تو کمسن عمر کا تقاضا تھا اور پھر شاید اسے خطرے کی اہمیت اور نوعیت، کا پورا پورا احساس بھی نہیں تھا۔ اس کے بوجھل بالوں نے جھک کر اس کے چہرے کے بہت بڑے حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ البتہ اس کے نازک لب، ترشی ہوئی حسین ناک اور گھنی بھنویں صاف دکھائی دے رہی تھیں ۔۔۔ پھیکی چاندنی نے اس کی صورت کو خوابناک بنا دیا تھا۔

بیٹھے بیٹھے گاماں سوچنے لگا۔ ممکن ہے۔ عاشاں اور اللہ دتے والی بات درست ہو ۔۔۔ اب کے اس قسم کے خیال سے وہ ناخوش نہیں ہوا ۔۔۔۔ ننھی منھی بھولی بھالی فاختہ سی بہن کبھی کبھار اچٹتی ہوئی نظروں سے بھائی کی جانب دیکھ لیتی اور پھر

آنکھیں جھپکا لیتی۔ ۔ ۔ وہ بچپن ہی سے بجائی سے سخت ڈرتی تھی۔ تاہم وہ اکھڑ بجائی کی سلامتی کے پیارے پیارے سوز بھرے گیت گایا کرتی۔

دفعتہً ہوا چلنے لگی۔ پیپل کی پتیوں نے تالیاں بجا بجا کر گاما کو چونکا دیا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بوجھل آواز میں بولا۔ "اب ہمیں چلنا چاہیئے۔"

عورتیں کچھ تامل کے بعد گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ انہیں کدھر جانا ہے۔ سب لوگ بوجھل قدموں سے ایک سمت کو چل دیئے۔

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ کنوئیں سے کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ گاما کے قدم رک گئے۔ عورتیں بھی رک گئیں۔

زمین ناہموار تھی۔ دور دور تک آبادی کا کوئی نشان نہیں ملتا تھا اور پھر آبادی سے انہیں کیا سروکار؟ ان کے جسم تھک کر چور ہو چکے تھے۔ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ مارے بھوک کے انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کلیجہ کسی بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہو۔

گاما کھوئی کھوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ قریب ہی اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ وہ بھی سنسان پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا مدت سے اسے یونہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ ۔ ۔ حدِ نگاہ تک کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ان کے حق میں یہ بات اچھی تھی، لیکن تکلیف دہ بات یہ تھی کہ منزلِ مقصود کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ابھی غالباً انہیں ان گنت کوسوں کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ ان گنت کوس! اس کے ذہن میں الجھن سی پیدا ہونے لگی۔ اس نے گھوم کر عورتوں کی جانب دیکھا۔ انہیں دیکھ کر اسے بڑا

رحم آیا۔ یہ معصوم، بے گناہ، سادہ لوح صورتیں!

پھر اس نے کھیت کی مینڈھ پر بیٹھتے ہوئے کہا: "آؤ تھوڑی دیر آرام کرلیں۔"

وہ سب ایک لفظ تک کہے بغیر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے اتنا بھی تو نہیں کہا کہ ابھی تو ہم دو فرلانگ بھی نہیں چلیں، آرام کی کیا ضرورت ہے۔

کھیتوں کے سلسلے پھیلتے ہوئے افق میں گم ہو رہے تھے، جہاں آسمان تلپتی ہوئی زمین کے لب چومتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ہر جانب بار بار نظر دوڑائی اور پھر زیر لب بڑبڑایا: "نہ معلوم پاکستان کہاں ہے!"

بوڑھی ماں نے آسمان کی جانب نظر اٹھا کر کہا: "اللہ! ہمیں ملت کی سرزمین تک جلد پہنچا دے۔"

وہ عفت مآب عورتیں اپنی آبرو کے لئے فکر مند ہو رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ایک مرتبہ وہ آبرومندی کے ساتھ پاکستان کی سرزمین تک پہنچ جائیں۔ خواہ وہاں پہنچتے ہی ان کو موت آجائے۔ انہیں اپنی جانیں ایسی پیاری نہیں تھیں۔

گامے نے تاروں سے نظر ہٹا کر دونوں ہاتھوں میں کھیت کی بھربھری مٹی کو اٹھایا اور اسے بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔ اس نے اسے دبا کر اس کے لمس کو محسوس کیا۔ اس نے ہوا کو سونگھا۔ طول و عریض جال کے مانند پھیلی ہوئی کھیتیوں کی بلند مینڈھوں پر نگاہ دوڑائی جو ایک دوسری کو کاٹتی چھانٹتی افق تک پھیل گئی تھیں۔ . . .
لیکن گامے کی نگاہیں پاکستان کی زمین، پاکستان کی مٹی، پاکستان کے کھیتوں اور پاکستان کی جھاڑیوں کی متلاشی تھیں۔

فضا معلوم تھی لیکن وہاں اس قدر سکون اور امن تھا کہ ایک مرتبہ تو ان عورتوں

کو بھی یقین سا ہونے لگا کہ کالی کملی والا ضرور انہیں باعزت تمام منزلِ مقصود تک . . .
دفعتاً ایک جھٹکے کے ساتھ گاماں چوکنا ہو گیا۔ اس نے مضبوط مچھلیوں والا بازو حفاظت کے انداز سے عورتوں کے آگے پھیلا دیا۔ دوسرا ہاتھ چشم زدن میں چھوی تک پہنچ گیا۔ اس کے طاقتور بازوؤں کے پٹھے پھڑ پھڑانے لگے۔ اس کی متجسس آنکھیں بھٹے کی جانب ایک نقطے پر جم گئیں۔

آخر ہے کیا ؟ . . . لیکن یہ سوال عورتوں کے لبوں تک نہیں آسکا۔

اب گاما عظیم الجثہ اصیل مرغ کے مانند بازو پھیلائے قدم زمین میں گاڑ گاڑ کر آگے کو بڑھتے ہوئے دھیرے سے بولا " اس بھٹے کے پیچھے ضرور آدمی چھپے بیٹھے ہیں "

اتنے میں ایک شخص کی جھلک دکھائی دی۔ عورتوں نے سوچا کہ اب اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل نہیں ہو سکتی۔

چند لمحوں بعد ٹوٹی پھوٹی اینٹوں اور مٹی کے ٹیلوں کے پیچھے سے ایک آدمی نمودار ہوا . . . وہ سکھ تھا۔

وہ تن تنہا آگے بڑھنے لگا۔ وہ بھی گامے کے مانند لمبا تڑنگا شخص تھا۔ حرکات و سکنات سے وہ بھی شریف انسان دکھائی نہیں دیتا تھا . . . اس کے پیچھے . . . اس کے پیچھے اور کوئی نہیں تھا۔ شاید اس کے ساتھی بھٹے کے پیچھے چھپے بیٹھے تھے۔

وہ قدم بقدم آگے بڑھ رہا تھا۔

گاماں رک گیا۔ دھندلی روشنی میں وہ سایہ قریب سے قریب تر آتا گیا۔ یہاں تک

کہ گاسے کے اعصاب کا تناؤ نقطۂ عروج تک پہنچ کر دفعتہً صفر پہ آ گیا۔ غالباً ۔ ۔ ۔ ۔
نہیں یقیناً ۔۔۔ نووارد پھلورا تھا۔

اور پھر نسبتاً بلند نعروں سے انہوں نے ایک دوسرے کا استقبال کیا۔

آتے ہی پھلورے نے پہلے عورتوں کا جائزہ لیا۔ سب کو صحیح سلامت پاکر بولا
"شکر ہے! شکر ہے!!"

گاسے نے مسکرا کر کہا۔ "ہم سب سلامت ہیں۔"

"لیکن تم لوگ تنہا کیوں چلے آئے تھے۔ میرا انتظار کیوں نہیں کیا تم نے۔ ۔ ۔"

گاسے نے سارا قصہ کہہ سنایا۔

اس پر پھلورے نے غل مچا کر کہا۔ "یہ تو تمہیں گھر سے نکالنے والے کی انتہائی حماقت تھی اور تمہاری بھی بیوقوفی تھی۔ افوہ! وہاں پہنچ کر میں بہت پریشان تھا۔ یہ ڈر تھا کہ کچھ خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ لیکن تمہیں بآسانی چھپایا جا سکتا تھا۔ اس دن سے تمہاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ یہی فکر تھی کہ کہیں شادیوں کے بھینٹ نہ چڑھ جائیں۔"

ماں بولی "بیٹا! اللہ کے فضل سے ہمارا بال تک بیکا نہیں ہوا۔ لیکن ہمارے یہ دن تو بہت ہی مصیبت میں کٹے ہیں۔ ہمیں تو یہ امید بھی نہیں رہی تھی کہ تم ہمیں دوبارہ ملو گے۔ ۔ ۔"

"واہ جی واہ" پھلورے نے اور شور مچا کر کہا۔ "بھلا تمہارے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا ہی کیوں ہوئے۔ دیکھو نا! تمہارے پیروں کے نشانات دیکھ کر یہاں تک آن پہنچا ہوں۔"

فضا میں دونوں قبر شریف مردوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اور اس چاندنی رات میں

چہل پہل نظر آنے لگی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ عورتوں نے بڑے اطمینان کا سانس لیا جیسے اب ان کی مدد پہ پوری فوج پہنچ گئی ہو۔۔۔ بھلورا جو اس بڑھیا کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوا باتیں کئے جا رہا تھا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہو چکیں تو گامے نے کہا "یار! ہم تو اٹکل پچو چلے آئے ہیں۔ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔۔۔؟"

یہ کہہ کر وہ خود ہی رک گیا اور آنکھیں سکیڑ کر دور دور تک نگاہیں دوڑانے لگا کہ شاید کہیں پاکستان کی سرزمین دکھائی دے۔

اس پر بھلورے نے گامے کو ایک بازو میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ادئے گامیاں! اب تو تم پاکستان پہنچ چکے ہو۔ تم کیا سمجھے بیٹھے تھے۔۔۔ کہ وہاں پہنچنے کے لئے دریا پہاڑ پھاندنے پڑیں گے؟"

گاماں ہکا بکا رہ گیا۔ ہکلا کر بولا "سچ؟۔۔۔ کہاں ہے پاکستان؟"

یہ کہہ کر وہ پھر آنکھیں سکیڑ کر افق کی جانب دیکھنے لگا

عورتوں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کی لہریں دوڑنے لگیں۔

بھلورے نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ رہے پاکستان کے کھیت۔" سب لوگ بھلورے کے ساتھ ساتھ تیز تیز قدم اٹھا کر چلنے لگے۔ بمشکل ایک فرلانگ دور پہنچ کر بھلورا رک گیا۔ پھر ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا "تو اب یہاں سے پاکستان کے کھیت شروع ہو جاتے ہیں۔ تم سیدھے چلے جاؤ۔ کہیں پولیس یا فوج کی چوکی تک پہنچ جاؤ گے یا کسی گاؤں میں جا پہنچو گے۔۔۔۔ اب نہیں کوئی خطرہ نہیں۔۔۔"

عورتوں نے جنگلی چکوریوں کی طرح اپنی رفتار تیز کر دی۔ گاماں وہ کھیت

تو تیر کی سی تیزی کے ساتھ پار کر گیا اور پھر رکا۔ تینوں عورتیں لپکتی ہوئی اس کے پیچھے چلی آرہی تھیں۔ تیز چلنے کے باعث وہ ہانپنے لگی تھیں۔

گامے کی باچھوں میں سے ہنسی پھوٹی پڑتی تھی۔ گھوم کر کہنے لگا۔ "اماں! ہم پاکستان پہنچ گئے ہیں۔"

معصوم عورتوں نے رک کر نظریں ادھر ادھر دوڑائیں اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

گامے نے قدرے توقف کے بعد جھک کر دونوں ہاتھوں میں کھیت کی بھربھری مٹی بھر لی اور اسے اپنے چہرے کے قریب لے آیا۔ چند لمحوں تک اسے غور سے دیکھتا رہا۔ دبا کر اس کے لمس کو محسوس کیا، ہوا کو سونگھا، پھر سر گھما کر طویل و عریض جال کی مانند پھیلی ہوئی کھیتیوں کی پینڈھوں پر نگاہ دوڑائی جو ایک دوسرے کو کاٹتی چھانٹتی افق تک چلی گئی تھیں ......

اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔

پھر اسے احساس ہوا کہ پھلورا اس کے ساتھ نہیں ہے ـــــ پھلورا دو کھیت پرے دھندلی چاندنی میں اڑیل ٹٹو کی طرح زمین پر پاؤں جمائے کھڑا تھا۔

چند لمحوں تک وہ سب چپ چاپ اس کی جانب دیکھتے رہے۔

بلند و بالا پھلور سنگھ کی ڈھیلی ڈھالی پگڑی کے شملے ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس کی طویل لاٹھی کی برنجی شام اس کے داہنے کان کی لو کو چوم رہی تھی۔

عمر رسیدہ ماں نے پھلورے کی طرف دیکھا اور پھر پس منظر میں چھٹکے ہوئے ستاروں پر نظر دوڑا کر دل میں کہنے لگی۔ میں پانچوں وقت نماز کے بعد اللہ سے اس

شخص کے حق میں دعا مانگا کرے گی۔

سادہ لوح عورت یہ بھول گئی کہ کیا اس ایک شخص کے حق میں دعا مانگنے پر شانِ کریمی سب کے گناہ معاف کر دے گی؟

الوداع کہنے کے لئے گاماں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا اپنے دوست کی جانب بڑھا — اس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے — وہ جانتا تھا کہ چھلوار دو کھیت پرے کیوں رُک گیا ہے۔

جب دونوں قریب قریب کھڑے ہوئے تو قد و قامت اور ڈیل ڈول میں دونوں برابر تھے۔

چھلورے کے پُرخشونت چہرے پر بھدی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی ۔۔۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو "گامے! تم سرزمینِ پاکستان سے مجھے ملنے کے لئے واپس آئے ہو؟"

گامے نے اپنے بلند قد کو اور بھی بلند کیا اور ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے کھڑے ہوئے کڑیل کسان سے آنکھیں ملائیں۔ اس کی گھنی مونچھیں متحرک ہوئیں۔ اس نے چھلورے کا چوڑا چکلا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر ۔۔۔ جیسے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے بھرپور مردانہ آواز میں جواب دیا۔

"آہو چھلوریا!"

لمحے

سوم کا دن تھا۔

یوں تو میں اپنے دوستوں کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ دوستوں کی صورت تک نہ دکھائی دے اور میں محض اپنے لئے ہی ہو کر رہ جاؤں۔ میرے دوستوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لئے مجھے ایسے دن بھی میسر آجاتے ہیں۔

جس روز کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہ اسی قسم کا دن تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ پیشتر اس کے کہ کوئی دوست میرے مکان پر پہنچ کر "اما کانت! اما کانت!" کے نعرے لگاتا میں چلّے سے فارغ ہو کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

نہ بیوی، نہ بچے، نہ ملازمت نہ کاروبار، نہ خوشی نہ غمی، عجب رندانہ کیفیت میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ میری بیکاری سے گھر والوں کی ناخوشی کے باعث دل پر اداسی چھائی رہتی تھی۔ کوئی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے دماغ ہلکا رہتا تھا۔ اپنی بیوی نہ

ہونے کے سبب سے ذہن پر رومانیت کا تسلط تھا۔

بس اسٹینڈ پر پہنچ کر دیکھا کہ کناٹ پلیس جانے کے لئے بس تیار کھڑی ہے۔ اندر اکا دکا مسافر بیٹھے ہیں، میں نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر جیب میں سے "کیپسٹن" کی ڈبیا نکالی اور بڑے اطمینان سے ایک سگریٹ کو سہلاتا رہا، پھر اسے ہونٹوں میں دبایا اور سلگا کر طویل کش لیا۔ بالآخر کوٹ کے کالر درست کرتا ہوا بس کے اندر داخل ہو گیا۔

آٹھ بجے تھے۔ بھلا سردی کے موسم میں کسی کو کیا پڑی تھی کہ گھر کی گرم فضا سے نکل کر باہر کو اٹھ جاتے۔ چنانچہ بس میں ایک عجیب سکون طاری تھا۔ چند لوگ ایک دوسرے سے پرے پرے بیٹھے دھیرے دھیرے باتیں کرنے میں محو تھے۔

میں نے پہلے تو عورتوں اور لڑکیوں کا جائزہ لیا۔ تین لڑکیاں تھیں اور دو عورتیں۔

لڑکیاں گوری تھیں۔ دو دو چوٹیاں، آنکھیں بڑی نہ چھوٹی، باتیں میٹھی نہ پھیکی ــــ لیکن گال ــ اُف توبہ ــــ اس قدر بیہودہ گال!! ہڈیاں ابھری ہوئیں اور گہری گہری لکیریں جو ہنستے وقت اور گہری ہو جاتی تھیں ــــ اب دوسری عورت کی جانب دیکھا ــــ ہرے رام! وہ تو صورت سے بالکل آیا لگی۔ شاید سچ مچ کی آیا ہو۔ اسی بات سے مجھے خیال آیا کہ ہم لوگ بچوں کے لئے کس قدر بدصورت آیائیں مقرر کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عمر بھر ہمارے بچوں کی جمالیاتی حس پنپنے نہیں پاتی ــــ خیر اب ایک عورت کا جائزہ لینا باقی تھا۔ وہ میری جانب پیٹھ موڑے بیٹھی تھی اس کے کندھے پر ننھے بچے کا سر ٹکا تھا اور ایک بچی سامنے کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ گویا

وہ کم از کم دو بچوں کی ماں تھی۔

دل پر مایوسی کا جذبہ طاری ہونے لگا۔ بیس پچیس منٹ کا یہ سفر یونہی کٹ جائے گا۔ دل بہلا دینے کو کوئی حسین صورت تک دکھائی نہ دے گی۔ کیا یہ سفر جماہیاں لیتے ہی بتانا پڑے گا۔

سوچا — اگر دو بچوں کی ماں بدصورت ہے تو اپنی بہنوں سے بڑھ کر کیا ہو گی۔ یہی نا کہ ان کے برابر ہی یا ذرا بہتر۔ آخر یہی طے پایا کہ اس خاتون کے عین پیچھے والی سیٹ پر ڈیرا جمایا جائے۔

پچھلی سیٹ پر ٹھیک سے بیٹھ کر میں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بالوں کی ترجمانی اور پھر انتظار کرنے لگا کہ وہ ذرا ادھر ادھر گھوم کر دیکھے تو صورت کا جائزہ لیا جائے۔

لیکن وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر سامنے کی جانب منہ کئے چپکی بیٹھی رہی یہاں تک کہ بس چل دی۔

مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ بارے کنڈکٹر نے آ کر دام طلب کئے ٹکٹ لیتے وقت خیال آیا کہ کاش اس خاتون سے تھوڑی بہت بات چیت ہو چکی ہوتی تو اس کے ٹکٹوں کے دام دے کر اچھے خاصے مراسم پیدا کئے جا سکتے تھے۔

جب اس کی باری آئی تو اس نے منہ پھیر کر دیکھا۔ رُخِ روشن کا جلوہ دکھائی دیا۔ دل دھک سے رہ گیا۔

وہ واقعی بہت حسین تھی۔ تارا سی آنکھیں، نازک لب، اور درخشاں پیشانی — خلافِ اُمید اس عورت کو حسین پا کر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اس سے گفتگو کیونکر شروع کی جائے۔ کوئی موضوع مناسب

رہے گا موسم؟ . . . . لیکن ہندوستان میں ابھی موسم کے موضوع پر گفتگو کا آغاز کرنا خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس عورت سے یہ کہنا کہ آہا! کیا ہی خوشگوار موسم ہے محض بیکار ہوگا۔ سینما، ایکٹر، ایکٹریسیں، بسیں، موٹریں . . . . نہیں، نہیں، یہ باتیں مہمل ہیں . . . . اتنے میں عورت کے شانے کے ساتھ لگے ہوئے ننھے بچے نے آنکھیں کھولیں اور حیرت و استعجاب سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بڑا پیارا بچہ تھا۔ میں نے اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی تو اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ پھر میں نے دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو ہلکے ہلکے سہلانا شروع کیا۔ تو وہ ہنسنے لگا ___ میں جانتا تھا کہ اس کی ماں کو اس بات کا علم ہو چکا ہے۔

بچے کے کانوں کے پیچھے داد کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جرأت سے کام لے کر پوچھا۔

"کیوں جی! ننھے کے کانوں کے پیچھے داد ہو رہا ہے . . . "

"جی ___ ہاں . . . . "

"تو کیا آپ اس کا علاج نہیں کرائیں گے؟"

"علاج تو ہو رہا ہے . . . . "

"کیا ہومیو پیتھی علاج کرا رہی ہیں؟"

"جی نہیں، ہے تو ایلو پیتھی۔"

"ایک ڈاکٹر ہیں رچی رام۔ ہومیو پیتھی علاج کرتے ہیں، خصوصاً بچوں کے علاج میں تو انہیں مہارت حاصل ہے۔ اگر یہ علاج مؤثر ثابت نہ ہوا تو ان سے رجوع کیجیے گا۔"

"بہتر۔"

"بہت ہی پیارا بچہ ہے۔" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

عورت نے بچے کو شانے سے ہٹا کر کھڑکی کے ساتھ پیٹھ لگالی۔ اب اس کا رخ قریب قریب میری جانب تھا۔ اس نے بچے کو زانو پر بٹھا کر دیکھنا شروع کیا کہ وہ واقعی حسین ہے یا نہیں۔ پھر جیسے دل ہی دل میں اس نے میرے قول کی تائید کرتے ہوئے میٹھی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"آپ کو بچوں سے خاصا لگاؤ ہے۔ کیا آپ کے بھی بچے ہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے قدرے جھینپ کر کہا۔ "ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"کیوں شادی نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟"

"یونہی۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہی، ابھی بے کار ہوں۔ جب تک آمدنی کی معقول صورت نہ ہو۔ دل میں شادی کا خیال بھی نہیں آسکتا۔"

"لیکن آپ بیکار کیوں ہیں؟"

میں اس جرح سے گھبرا گیا تھا۔ "میں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد پشاور میں کاروبار شروع کیا تھا۔ آمدنی کی صورت نظر آنے لگی تو فسادات شروع ہوگئے اور مجھے ادھر بھاگنا پڑا۔ . . . اب نئے سرے سے کام کرنے کا خیال ہے۔"

عورت کی آنکھوں میں اداسی کی جھلک دکھائی دی۔ اس وقت وہ کچھ کھوئی کھوئی نظر آرہی تھی۔ میں موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے حسین چہرے کے خدوخال کا

بغور جائزہ لینے لگا ــــ کیا وہ میری خاطر اداس تھی ؟ ایک لمحے کے لئے ہی سہی ! ــــ کاش! مجھے بھی ایسی ہی موہنی بیوی مل جائے۔

کہتے ہیں کہ عورت مرد کے دلی جذبات کو بہت جلد پہچان لیتی ہے۔ عورت نے نظریں جھکائیں اور پھر تدرے تامل کے بعد نہ معلوم کیوں ــــ بڑی بچی کی جانب اشارہ کرکے مسکرا کر بولی "یہ میری بیٹی ہے"

"آؤ بیٹی! میرے قریب آؤ . . . " میں نے ہاتھ پھیلائے۔ وہ مارے شرم کے آگے نہیں بڑھی تو میں نے خود ہی بڑھ کر اُسے گود میں بٹھا لیا۔ "آہا ہا! . . . بڑی اچھی ہے ہماری بے بی . . . اچھا تو تم پڑھتی ہو کیا ؟"

لیکن وہ بڑے اہتمام کے ساتھ شرماتی رہی

عورت بولی "بتاؤ نا بے بی! تم سے کئے مرتبہ کہا ہے کہ یونہی مت شرمایا کرو"

میں نے سوچا، کس قدر مہذب ہے یہ عورت۔ اس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی اور خاصی سلجھی ہوئی ہے۔

ماں کے سرزنش کرنے پر بیٹی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا پڑھا ہے بھئی ہمیں بھی سناؤ . . . تم تو بہت اچھی بے بی ہو۔ تمہیں تو پڑھا لکھا یاد ہوگا سارا، بولو یاد ہے ؟"

"ہاں جی" بے بی نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر بھرپور نظروں سے میری جانب دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس بات کا اقبال کرنے میں اسے بہت فخر محسوس ہو رہا ہے

"اچھا بھئی پھر سناؤ نا! کیا پڑھا ہے تم نے ؟"

"اے، بی، سی، وائی، زیڈ"

اس پر ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنسے۔ میں اور وہ عورت۔ ہم دونوں جو ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ لیکن ہمارے قہقہوں کی ملی جلی آواز سے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی فلم کے ہیرو اور ہیروئن کوئی سحر انگیز ڈوئیٹ گا رہے ہوں۔

عورت نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے کہا: "اری بڑے بی! تجھے اے' بی' سی' ابھی تک یاد نہیں ہوئی۔ سی کے بعد ایک دم وائی زیڈ؟"

اب ہماری ملاقات قابلِ اطمینان درجے تک آن پہنچی تھی۔ اب بیشتر خدشات دور ہو چکے تھے۔ ہم دو بہت اچھے واقف کاروں بلکہ دوستوں کی طرح گفتگو کرنے لگے۔

بیس یا پچیس منٹ کے سفر میں زیادہ باتیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن اگر احساسات کو چھیڑیں تو لمحہ بھر میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ایک میٹھی نظر تھی کہ زندگی کے ان لمحوں کو رنگین بناتی چلی گئی۔ اس کی آواز میں ایسا لوچ اور رسیلاپن تھا کہ مدتوں کانوں میں شہد سا گھلتا رہا۔

ادھر ادھر کی باتوں میں ہم اس قدر محو تھے کہ ارد گرد کی کچھ خبر نہیں رہی تھی —
جب میں نے جنگل میں شیر کے فرضی شکار کی کہانی سنائی اور جھوٹوں ہی کہہ دیا کہ میں نے شیر کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر گولی چلائی تھی تو عورت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت سے بولی۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ شیر کا شکار مچان پہ بیٹھ کر کیا جاتا ہے"۔

"جی ہاں" میں نے بے پروائی سے سگرٹ کا بچا ہوا ٹکڑا ہوا میں پھینکتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن کہنہ مشق شکاری مچان پر کبھی نہیں بیٹھتے ہیں"۔

وہ سچ مچ میری بات پر ایمان لے آئی۔ باتوں باتوں میں مجھے خیال آیا کہ مرد کے دل میں عورت کی کشش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورت کے سامنے وہ دل کھول کر جھوٹ بول سکتا ہے اور عورت بھی ہر دم جھوٹ سننے کے لئے تیار رہتی ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار عورت بھی بالآخر اسی مرد کو پسند کرتی ہے۔ جس کے جھوٹ پہ وہ اعتبار کر سکے۔

عورت طفلانہ انداز سے کئی باتیں پوچھتی رہی اور میں بڑی توجہ سے ان کے جواب دیتا رہا ــــ گناہ و ثواب، پیار، محبت، عشق و حسن اور شرافت و خباثت کی گھلی ملی سی یہ ملاقات کس قدر دلکش اور جان لیوا تھی ــــ اس سہانی صبح کو دو اجنبی مسافروں کی مختصر سی ملاقات، تاریخ عالم کا کس قدر اہم واقعہ!!

عشق کی منزل تو کیا آتی ــــ البتہ بس کی منزل قریب آ رہی تھی۔

بے بی ابھی تک میری گود میں بیٹھی تھی۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ کام نکل جانے کے بعد بے بی کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ میں نے مجوب ہو کر بے بی کی بغلوں کو گدگدایا

"ارے بے بی! تم تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں ــــ کیا تم ہم سے خفا ہو؟"

وہ چپ رہی۔

"بولو ــــ بے بی!"

"ناہیں" بے بی نے انکار کے طور پر سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام؟"

"ہاں!"

"سول نامان؟"

"سلطانہ" عورت نے کہا

مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا علم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔ سلطانہ کی بغلوں کو گدگداتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے۔ میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیا آپ مسلمان ہیں؟"

"جی" یہ کہہ کر عورت نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"نہیں کچھ نہیں" میں ہنس دیا۔ "مجھے تعجب ہوا کیونکہ بظاہر۔۔۔"

پھر قدرے بھدی سی خاموشی طاری ہو گئی

بات کچھ بھی نہیں تھی ۔۔۔ میں نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا۔

"فساد کے دنوں میں آپ دہلی ہی میں تھیں؟"

"جی ہاں ہم سب یہیں تھے"

میرے دل کو نہ معلوم کیا ہونے لگا۔ میں نے رکی رکی آواز میں پوچھا۔ "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

عورت نے قدرے سکوت کیا۔ "بس کچھ نہ پوچھئے۔ مالی نقصان بہت ہوا، جانیں بچ گئیں۔ یہی غنیمت سمجھئے۔ کناٹ پلیس میں ہماری دکان لٹ گئی۔ مکان میں فسادی گھس آئے۔۔۔ لیکن پیشتر اس کے کہ کوئی نقصان ہوتا پولیس آگئی۔۔۔"

میرا سر جھک گیا۔۔۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اسٹینڈ پر پہنچ کر بس رک گئی۔

اس خیال سے کہ عورت تنہا ہے اور بچے دو، شاید اسے میری مدد کی ضرورت ہو

میں نے اپنی سیٹ سے اٹھنے میں تامل کیا لیکن عورت کے ہلکے پن سے روشن ہوا کہ میری مدد درکار نہیں ہے۔ چنانچہ میں شریف مرد کی طرح اٹھ کر چل دیا۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے یونہی گھوم کر دیکھا کہ وہ عورت اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کے قدم اکھڑے اکھڑے دکھائی دیتے تھے وہ قدرے لنگڑا کر چل رہی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ اگر اس کی ٹانگ میں یہ نقص نہ ہوتا تو وہ قدم قدم پہ فتنے جگاتی ایسی حسین عورت اور یہ عیب!

دفعتاً ہماری نظریں ملیں۔۔۔ غالباً وہ سمجھے بیٹھی تھی میں چلا گیا ہوں۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے پا کر وہ پریشان سی ہو گئی جیسے کہہ رہی ہو "آخر تم نے سب مجھے لنگڑا کر چلتے ہوئے دیکھ لیا نا؟"

محجوب ہو کر اس نے اپنا گلابی ہوتا ہوا چہرہ جیسے جھکا لیا اور پھر جیسے روٹھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں اسے منانے کے لئے آگے بڑھا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا "معزز خاتون! تم بہت حسین ہو۔ تم حسن کی پتلی ہو، تم کیا جانو میں ان چند دلفریب لمحوں کے لئے تمہارا کس قدر شکرگزار ہوں"

۔۔۔۔ اور پھر میں نے قدرے بلند آواز میں کہا "معاف کیجئے گا۔۔۔ آپ کچھ پریشان سی نظر آتی ہیں۔ کیا آپ کو کہیں آگے جانا ہے۔ تانگہ لاؤں؟ ۔۔۔۔ یا آپ کو کسی کا انتظار ہے؟"

اس نے سر پہ دوپٹہ سنوارتے ہوئے جواب دیا "جی جانا تو قریب ہی ہے

"۔۔۔ وہ نہیں آتے۔۔۔ ملازم کو بھیج دیتے، ملازم کو تو آنا ہی چاہیے تھا۔۔۔"

میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کو گود میں اٹھا لیا اور بولا: "چلئے میں آپ کو چھوڑ آؤں"

وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ ہو لی۔

ابھی ہم پندرہ بیس قدم ہی چلے ہوں گے کہ وہ بول اٹھی: "لیجئے وہ لڑکا۔۔۔ ہمارا نوکر چلا آرہا ہے۔"

ہم رک گئے۔ میں نے جھجکتے ہوئے ٹانگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا: "کیا پیدائشی نقص ہے؟"

اس نے قدرے تامل کیا۔ پھر اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولی: "جی نہیں! — جب فسادیوں نے ہمارے مکان پر حملہ کیا تو ایک سور بیر نے لاٹھی گھما کر ماری تھی۔۔۔"

میرا دل بھنچنے لگا۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے بچی کو نوکر کی طرف بڑھایا۔۔۔ میری پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے جیب میں رومال ٹٹولنے لگا۔

رخصت کے موقعے پر میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ چنانچہ میں کچھ اس انداز سے دو قدم پیچھے ہٹا جیسے وہ قدیم بابلیوں کی حسین شہزادی ہو۔ میری آنکھیں جھک کر اس کے قدموں پر جم گئیں۔ میں نے تصور ہی تصور میں اس کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

پھر اٹھتی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب ان آنکھوں میں وہ روکھا پن تھا نہ سختی اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مہربان ہوتی ہوئی کسی خودسر ملکہ

کی طرح کہہ رہی ہے" مابدولت خوش ہوئے . . . . مابدولت نے نہ صرف تمہیں بلکہ تمہاری ساری قوم کو معاف کیا۔"

ایک مرتبہ پھر ہم نے ایک دوسرے کی جانب شکرگزار نظروں سے دیکھا۔ اور پھر ہم ایک دوسرے سے دور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ بالآخر ایک دوسرے کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہوگئے۔

ویبلی، ۴۸

شہر کا وہ حصہ جسے پہلے واقعی شہر کا حصہ کہا جا سکتا تھا۔ اب بری طرح برباد ہو چکا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے مکانات دور سے دیکھنے والوں کو بالکل غیر آباد کھنڈر دکھائی دیتے تھے اور اگر ان خستہ حال گلیوں میں مغربی پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کی ریل پیل نہ ہوتی تو شاید دن کے وقت بھی انسان کو وہاں جاتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا۔

کچھ مدت پہلے یہاں کے اصل باشندوں یعنی مسلمانوں کو بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا جو کیفیت ان پر گذری تھی، اس کی داستان ان کھنڈروں کی زبانی سنی جا سکتی تھی۔ فسادات کے بعد جب کہ اصل باشندے ہجرت کر گئے تھے اور ابھی شرنارتھی ان کی بجائے نہیں بسے تھے اس بستی پہ عجب کس مپرسی کی حالت طاری تھی۔ مکان گرائے گئے تھے یا جلا دئے گئے تھے، الغرض ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ مکانوں کے بغیر دروازوں کی چوکھٹیں گویا حیرت سے منہ کھولے کبھی واپس نہ

آنے والے بکینوں کی راہ تک رہی تھیں۔ گرد آلود آسمان میں گدھ منڈلاتے تھے کھجلی کے مارے ہوئے کتے کونے کھدرے سونگھتے پھرتے تھے اور بھدلی بھٹکی گائیں اینٹوں کے ڈھیر میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھیں۔

اس عالمگیر بربادی میں اگر ایک طرف ایک قوم کے مکانات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا تو دوسری جانب دوسری اقوام کے اکا دکا مکانات صحیح و سالم کھڑے تھے۔ انہیں مکانوں میں سے ایک سردار بدھ سنگھ کا مکان بھی تھا۔

اس قدر اچھے نام والے حضرت بڑے بے تکے ڈیل ڈول کے مالک تھے۔ پست قد، کدو سا سر، چھوٹی چھوٹی مجسّس آنکھیں، فربہ بدن، طویل لہراتی ہوئی داڑھی۔ صبح و شام پاٹھ کرتے، مالا جپتے، یوں تو مالا ہر وقت کلائی سے لپٹی رہتی لیکن علی الصبح جب وہ سکھ منی صاحب کا طویل پاٹھ کرنے لگتے تھے تو گھر کے افراد کی نیند اکھڑ جاتی۔ آپ گوردوارے میں بھی پاٹھ کرواتے رہتے تھے۔ دوسروں کو بھی پاٹھ کی تلقین کرتے تھے۔

فسادات کے زمانے کے قصے بڑے دردناک لہجے میں دہراتے تھے، کہتے یہ ساری آبادی مسلمانوں کی تھی۔ بس آبادی کے ایک سرے پر ہم لوگوں کے مکانات تھے۔ اسی لئے ان دنوں انہیں اپنا مکان چھوڑ کر ہندو محلے میں جانا پڑا۔ شہر میں ان کے کئی اور مکانات بھی تھے لیکن وہ سب کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان دنوں انہیں خاصی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔

ادھر جب پانسہ پلٹا تو انہوں نے خوف کے مارے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کی ہزاروں کی جائدادیں کوڑیوں کے مول خرید لیں اور پھر دولت مند شرنارتھیوں کے

ہاتھ زیادہ سے زیادہ داموں پر بیچ کر جی کھول کر منافع کمایا۔ پاٹھوں کی شدت اور بڑھی اور ان کا چہرہ نورِ معرفت سے دمک اٹھا۔

دور تک پھیلے ہوئے کھنڈروں کے ایک سرے پر کھڑے ہوئے چند صحیح و سالم مکانات عجب مضحکہ خیز منظر پیش کرتے تھے۔ ان میں سب سے اچھا مکان بدھ سنگھ کا تھا۔ دو منزلے مکان کا نچلا حصہ انہوں نے کرائے پر اٹھا دیا تھا اور اوپر والی منزل پر ان کی اپنی رہائش تھی۔ ان کے گھر کے قریب ہی ریل کا پل تھا۔ شب و روز ریل گاڑیاں ادھر سے گذرا کرتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر انجن کی سیٹیوں اور گاڑی کی گڑگڑاہٹ کا شور اس قدر شدید ہوتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

شرنارتھیوں نے گھبراہٹ میں جو کام سامنے آیا شروع کر دیا۔ پے در پے مصائب جھیلنے کے باعث ان کے حواس قائم نہیں رہے تھے۔ بعض لوگوں کے عزیز مر کھپ گئے تھے، بعض یتیم یا بے سہارا رہ گئے تھے۔ اس قسم کے بے شمار خاندانوں میں سے ایک خاندان بساکھا سنگھ کا بھی تھا۔

بساکھا سنگھ مغربی پنجاب کے ضلع لائل پور کا ایک معمولی زمیندار تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے اور تین لڑکیاں۔ وہ خود سیاہی مائل گندمی رنگ کا دراز قد اور مضبوط انسان تھا۔ اس کے ہاتھ پہ ہمیشہ ہل کی ہتھی تھامنے کے لئے بنے تھے۔ اس کی شادی چھوٹی عمر ہی میں ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ ابھی سینتیس برس کا تھا اور اس کا بڑا لڑکا انیس برس کا ہو چکا تھا۔ اس سے چھوٹا لڑکا سترہ برس کا۔ لڑکیوں میں سب سے بڑی پندرہ برس کی تھی چھوٹی بہنیں بھی چار پانچ برس تک جوان ہوا جاتی تھیں۔

پہلے پہل اپنے گھروں سے نکل کر انہیں کیمپ میں رہنا پڑا۔ نہ کچھ کھانے کو

نہ پینے کو۔ نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا۔ اور نہ سر چھپانے کو کٹیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ ہر دم جان کا خوف دامن گیر رہتا تھا۔ زندگی کا پل پل گذارنا بے حد تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ یہ قافلہ عجب بے سروسامانی کی حالت میں مشرقی پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ بچے، بوڑھے عورتیں اور مرد تھکان زدہ قدموں کے ساتھ بھوک پیاس سے تھکے ہارے جانیں ہتھیلی پر دھرے منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ راستے میں فسادیوں کے ہجوم بڑھ بڑھ کر حملے کرتے تھے۔ قافلے میں کئی بہادر آدمی بھی تھے جو موقعہ پڑنے پر بڑی بے جگری سے لڑتے تھے لیکن بھوک اور پیاس کے مارے ہوؤں کا لڑنا بھڑنا بھی کیا تھا۔

بعض اوقات تاریک راتوں کو روکھی سوکھی کھا کر لوگ کھیتوں کی مینڈھوں پر ہی کروٹ بدل کر اونگھنے لگتے۔ جابجا سلگتی ہوئی آگ میں سے چنگاریوں کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتیں۔ کوئی آنکھوں سے اندھی بڑھیا پوپلے منہ سے لرزتی ہوئی بے سُری آواز میں ست بدر گانے لگتی تو دفعتاً شور و غوغا بلند ہوتا۔ فسادی شب خون مارتے۔ وہ بلا کھٹکے ڈیرے کے اندر در آتے۔ مشعلوں کی مدھم روشنی میں تیزی سے بڑھتے اور اچکتے ہوئے سائے دکھائی دیتے۔ افراتفری مچ جاتی۔ جب حملہ آور بچی کچی گٹھڑیاں اور پوٹلیاں چھین لینے کی کوشش کرتے تو بعض عورتوں کی آہ و بکا سے آسمان گونج اٹھتا لیکن تارے چپ چاپ آنکھیں جھپکا جھپکا کر تماشا دیکھا کرتے۔ مذہبی نعروں، مار دو، کاٹ دو کا شور اور پہرے دار سپاہیوں کی بندوقوں کی تڑاتڑ کی صدائیں رفتہ رفتہ مدھم پڑ جاتیں۔ مجبور و معذور کراہتی ہوئی عورتیں اور زخمی انسانوں کے سِسکتے ہوئے چہرے باقی رہ جاتے۔ یہ قافلہ پکے ہوئے پھوڑے کے مانند تھا جسے بار بار جس کے زخم ہرے کئے جاتے تھے اور جو سدا رِستا رہتا تھا۔

بساکھا سنگھ نے خود بھی مرقعہ پڑنے پر لڑنے بھڑنے سے گریز نہیں کیا۔ اسے اور اس کے دونوں لڑکوں کو بھی متعدد زخم آچکے تھے۔ بالآخر جب وہ ہندیونین کے حدود میں داخل ہوئے تو ان کے دم میں دم آیا۔ وہاں انہیں دودھ اور جلیبیاں کھانے کو ملیں۔ آلو کچوریوں سے بھی تواضع ہوئی۔ اس وقت انہیں اس امر کی بے حد خوشی تھی کہ اب وہ آرام کی نیند سو سکیں گے۔ اب ان کا کوئی دشمن شبخون نہیں مارے گا۔ اب ان کی بہو بیٹیوں کی عزت و عفت کوئی نہیں لوٹے گا۔ اب ان کی جان و مال کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔

ہندیونین کے حدود کے اندر داخل ہوتے ہی قافلہ تسبیح کے دانوں کے مانند بکھرنے لگا۔ کچھ لوگ راستے میں جو شہر پڑتے وہاں رک جاتے۔ فرار شدہ مسلمانوں کے مکانوں پر قبضے ہونے لگے۔ بساکھا سنگھ نے بھی بدھ سنگھ کے پڑوس میں ایک بوسیدہ مکان میں ڈیرا جما دیا۔ یہ مکان دراصل اس قدر بُری حالت میں تھا کہ اس وقت تک کسی کو اس پر قبضہ جمانے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ چونکہ اور کوئی مکان خالی نہیں تھا اس لئے بساکھا سنگھ نے اسے غنیمت جانا۔

یہ عجیب قسم کی بستی تھی۔ لٹے ہوئے بدنصیب لوگوں کے ترک کردہ مکانوں میں تباہ حال، بدنصیب اور بے خانماں انسان آباد ہو رہے تھے۔ تاریخ عالم میں انسانوں کے دو گروہوں نے ایک دوسرے سے اس قدر خوفناک مذاق کبھی نہیں کیا ہوگا۔

انسانی جسم کی ہڈیوں کا ڈھانچ ہیبت ناک اور عبرت ناک شے ہے لیکن جلی پھنکی برباد شدہ بستی کا منظر بھی کچھ کم دہشتناک اور عبرت انگیز نہیں ہے۔

اونچی نیچی ناہموار غلیظ گلیوں میں سُتے ہوئے چہروں والے نحیف و لاچار انسان

حیران وشششدر در بدر گھوما کرتے تھے۔ یہ بستی دن کے کسی لمحے میں بھی دل خوش کن منظر پیش نہیں کرتی تھی۔ رات کی خوابناک روشنی میں وہ ایک طویل و عریض قبرستان کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ صبح کے وقت جب سورج کی تیز روشنی تاریکی کی چادر چاک کر دیتی تو یہ بستی زبانِ حال سے "عبرت! عبرت!" پکارنے لگتی تھی۔ سارا سارا دن بھٹکے بھٹکے لوگ ادھر ادھر گھوما کرتے۔ کتے بھونکتے، مریل بلیاں ہڈیاں بھنبھوڑتیں اور مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ شام کے وقت تنور اور چولھے روشن ہو جاتے۔ پہلے تو دھوئیں کی پتلی پتلی لکیریں اوپر کو اٹھنے لگتیں اور پھر دھوئیں کے ستون بن بن کر بوجھل بادلوں کے مانند آسمان کے اس سرے سے اس سرے تک پھیل جاتے۔ اس پھیلی پھیلی سیاہی تلے وہ بستی اور بھی حقیر اور بے کیف نظر آنے لگتی۔

پہلے پہل بساکھا سنگھ نے واہگورو کا ہزار ہزار شکر ادا کیا۔ آخر یہ اکال پرکھ کی عنایت ہی تو تھی کہ وہ اپنے سارے کنبے سمیت ساری مشکلات میں سے بخیر و عافیت نکل آیا تھا۔ رفتہ رفتہ روزی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ کنبے کا پیٹ پالنے کا سوال پیشِ نظر رہنے لگا۔ یوں تو ہر شخص کے لئے جما جمایا کام چھوٹ جانے کے بعد نئے سرے سے کام شروع کرنا بہت ہی مشکل مسئلہ تھا لیکن بساکھا سنگھ جیسے انسانوں کے لئے جو پہلے کھیتی باڑی کرتے تھے اور جو کسی بھی دوسرے ہنر سے واقف نہیں تھے یہ مسئلہ قریب قریب ناقابلِ حل ہو کر رہ گیا تھا اور پھر بغیر پونجی کے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ نوبت مزدوری تک آن پہنچی۔ اس کے باوجود گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ جان پہچان والوں کے سامنے اس قسم کا کام کرنے میں دقت بھی پیش آتی تھی۔ کیونکہ پہلے وہ ان کے روبرو خاصی عزت اور آبرو کی زندگی بسر

کیا کرتا تھا۔ القصہ اس طرح زندگی کی گاڑی چرخ چوں کرتی ہوئی گھسٹتی چلی جا رہی تھی
بستی میں پہنچتے ہی گوردوارے میں سردار بدھ سنگھ سے اس کی ملاقات ہوئی۔
یونہی بدھ سنگھ کو اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ شام کے وقت بساکھا سنگھ
ان کے ہاں چلا جاتا اور انہیں ان مصائب کے قصے سناتا جو انہیں راستے میں
جھیلنے پڑتے تھے۔ بساکھا سنگھ کے دل میں اک موہوم سی امید تھی کہ بدھ سنگھ سے
ضرور اسے کچھ نہ کچھ فیض پہنچے گا۔ اسی لئے اس نے اس کے ہاں آمد و رفت جاری
رکھی۔

بساکھا سنگھ کے دل میں بدھ سنگھ کے لئے بڑا احترام تھا۔ ایک تو بدھ سنگھ
صورت ہی سے بڑا گورکھ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وہ چوڑی پیشانی، روشن آنکھیں،
پُرنور لانبی داڑھی جس کے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے، پریم رس میں ڈوبی ہوئی اس
کی وہ میٹھی میٹھی باتیں اور اس پر طرّہ یہ کہ صبح و شام پاٹھ کیا کرتا تھا۔ بظاہر یوں معلوم
ہوتا تھا کہ اسے دُنیا کے موہ مایا کے جال سے مطلقاً کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ
بساکھا سنگھ کے مصائب کا حال بڑے دھیان سے سنتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر
کئے گئے مظالم کا حال سن سن کر اس کا دل موم کے مانند پگھلا جا رہا ہے۔ اس پر
بساکھا سنگھ کا دل بھر آتا اور وہ گلوگیر آواز میں اپنے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا ذکر
کرتا۔ جہاں ہر سال لکھو کھا سنہری بالیاں ہوا میں جھوما کرتی تھیں۔ وہ گندم کے ان
ذخیروں کا ذکر کرتا جو اس کے مکان کے اندر بھڑولوں میں ٹھسا ٹھس بھرے رہتے
تھے۔ اپنے بیلوں، اپنی بھوری اور کالی بھینسوں، اپنے مکان غرض ہر شے کی کہانی
سناتا۔ بظاہر بدھ سنگھ بہت متاثر نظر آتا تھا۔ وہ شخص جس کی بابت کہا جاتا تھا کہ اس

کے پاس لاکھوں روپیہ نقد موجود ہے۔ مکان ہیں، کارخانے ہیں۔ لیکن بساکھا سنگھ کی باتیں سننے کے بعد وہ بڑی متین صورت بنا کر سر ہلاتا اور کہتا "بساکھا سنگھ جی پاٹھ کیا کرو۔"

چنانچہ بساکھا سنگھ نے خوب پاٹھ کرنے شروع کر دیئے۔ خود بھی کئے اور بیوی بچوں سے بھی کروائے۔ لیکن جب ان کا کچھ نتیجہ نہ نکلتا تو بساکھا سنگھ کہتا "سردار صاحب جی! دیکھئے جوان لڑکیوں کا بھی دل پر کس قدر بوجھ ہوتا ہے۔ سنتو بڑی ہو گئی ہے۔ اوپر سے کلجگ کا خیال کیجئے۔ میرے پاس تین چار سو روپیہ بھی ہو تو میں کسی نہ کسی طرح بڑی لڑکی کے بوجھ سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

"واہگورو! واہگورو!! جب سنتا جواب دیتا" بساکھا سنگھ جی نام جپا کرو۔ نام میں بڑی شکتی ہے۔

بساکھا سنگھ نے نام جپنا شروع کر دیا۔ خوب جی بھر کر نام جپا۔ یہاں تک کہ ایک مالا بھی خرید ڈالی۔ ہر وقت انگلیوں میں منکے گھومتے رہتے تھے۔ ایک پہر رات باقی ہوتی کہ وہ جاگ اٹھتا، اشنان کرتا اور پھر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر مالا جپنے لگتا ——— سارا دن کام کاج کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ بیٹے الگ خوار ہوتے تھے۔ لیکن نتیجہ وہی صفر کا صفر۔

بساکھا سنگھ کہتا "مہاراج جی! اگر میرے پاس کہیں سے پانچ سو روپیہ بھی آجائے تو کوئی چھوٹی موٹی دکان ہی کھول ڈالوں۔"

جواب ملتا "بساکھا سنگھ جی! گوردوارے جایا کرو۔ سارے پریوار کو لے جایا کرو۔ گورو کے گھر میں کیا نہیں ہے جو مانگو سو ملے گا۔ گورو کے گھر میں کسی شے کی

کمی نہیں ہے خالصہ جی! ـــ لیکن شردھا شرط ہے۔ بغیر شردھا کے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اجی بابا ابھیکھ سنگھ جی کہہ گئے ہیں کہ شردھا ضرور پھل لاتی ہے۔ خواہ یہ پھل دو، چار، دس، بیس، پچاس برس کے بعد ہی کیوں نہ ملے۔ . . لیکن شردھا کا پھل ملنا ضرور ہے۔ . . "

چنانچہ اب گوردوارے کا طواف ہونے لگا۔ اس کی بیوی اس کی ان حرکات سے پریشان ہو گئی۔ ایک روز لبھا کھا سنگھ نے آنکھیں موند کر بڑے پریم سے کہا "سنتو کی ماں! شردھا کا پھل ضرور ملتا ہے۔ خواہ دو، چار، دس، بیس یا پچاس برس کے بعد ہی ملے۔ . . "

یہ سن کر دکھوں کی ماری عورت نے دفعتاً اپنی میلی میلی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ پہلے چند لمحوں تک تو اس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکل سکا۔ پھر بمشکل رُک رُک کر گلوگیر آواز میں بولی "۔ . . . دس، بیس، پچاس برس؟ . . . " اور پھر اس کی کانپتی ہوئی آواز بند ہو گئی۔ سر میں جنبش پیدا ہوئی اور اس کے ہونٹ لرز کر اور نتھنے پھڑک کر رہ گئے۔ . . .

اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ کیا سنتو اور اس کی بہنیں چالیس پچاس برس تک شردھا کے پھل کا انتظار کر سکتی تھیں۔ کیا اس کے نوخیز لڑکے شردھا کے پھل کے انتظار میں بوڑھے نہ ہو جائیں گے۔ کیا دنیا کے کسی انسان کی اتنی بساط بھی ہے کہ وہ دس، بیس، چالیس . . . .

لبھا کھا سنگھ کے دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی۔

اس رات چراغ کی مدھم روشنی میں وہ ٹانگیں سمیٹے، زانوؤں پر گھٹنیاں رکھ کر بیٹھا رہا۔

کے کلوپچے میں لئے دیوار سے پیٹھ لگائے اپنے خیالات میں دیر تک گم رہا۔ اس کی گھنی بھنوؤں تلے سیاہ پتلیاں بڑے تجسس سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ چراغ کی تھرتھراتی لو میں گھر کے افراد متحرک سایوں کے مانند دکھائی دیتے تھے۔ تاحدِ نگاہ رات کی دھواں دھواں سی فضا میں ٹوٹتے پھوٹتے مکانات کے سلسلے عجب ہیبت ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ جس مکان میں خود وہ مقیم تھا اس کا بیشتر حصہ گر چکا تھا۔ غالباً فسادیوں نے ہی اسے آگ لگائی ہوگی۔ دیواریں اور چھت کی کڑیاں کچھ جل جانے کے باعث اور کچھ دھواں لگنے کی وجہ سے بالکل سیاہ پڑ گئی تھیں کہ مکینوں کو ہر وقت ان کے گر جانے کا خطرہ لاحق رہتا۔ اس روز آٹے کی عدم موجودگی میں کھچڑی پکائی گئی تھی اور گھر کے سب لوگ اسی پہ اکتفا کرنے پر مجبور تھے۔ اس کی اوپر تلے کی تین لڑکیاں، وہ انہیں ٹکٹکی باندھ کر کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے اس نے انہیں پہلے کبھی نہ دیکھا ہو — یہ صورتیں کیسی ہیں، کون ہیں، کہاں سے آئیں اور سب سے اہم سوال یہ تھا کہ وہ جائیں گی کہاں۔ ساس کے دونوں بیٹے ننگے سر بیٹھے کھچڑی کھا رہے تھے، بار بار نوالے کے لئے منہ پھاڑتے تھے۔ ان کے جوڑوں میں سے نکل کر اوپر کو لہراتے ہوئے بالوں کے گچھے مرغ کی کلغی کے مانند دکھائی دیتے تھے۔ وہ مسلسل منہ ہلائے جا رہے تھے۔ بساکھا سنگھ پر عجب بے حسی طاری تھی جیسے اس کا اس ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے وہ سب سے ارفع اور الگ بیٹھا اس دنیا کے کھیل دیکھ رہا ہو لیکن وہ زیادہ دیر تک اس خوابناک کیفیت میں گم نہیں رہ سکا۔ اسے جلد ہی اس امر کا احساس ہو گیا کہ یہ سب کچھ خواب نہیں تھا اور نہ وہ ان سے الگ تھا۔

کس قدر عجیب بات تھی۔ کاٹے کوسوں تک پھیلی ہوئی زمین پر گیہوں کے سنہرے خوشوں سے لدے ہوئے پودے کھڑے تھے۔ یہ وسیع آسمان تلے وا اگورو اکال پرکھ کی وسیع زمین موجود تھی۔ لیکن اس کے بندوں کو نہ کھانے کو اناج ملتا تھا اور نہ سر چھپانے کو جگہ میسر آتی تھی ــــ تعجب! بدھ سنگھ کے پاس اس قدر روپیہ ہے، مکان ہیں کارخانے ہیں۔ بے فکری ہے۔ آنند ہے......

دوسرے روز شام کے وقت بساکھا سنگھ بستی میں بے مہار گھومتا پھر رہا تھا۔ اس کا ذہن عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ گھریلو پریشانیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان کا کوئی حل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ فسادات سے پہلے اسے کبھی گہرا غور اور فکر کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ وہ دو بھائی تھے اور ایک بہن۔ ان کے باپ کو ان سب سے بڑی محبت تھی۔ لڑکپن اور آغازِ جوانی کا زمانہ اس نے بڑی بے فکری سے گذارا تھا۔ کھیل کود، گیت اور الغوزوں اور عشق و محبت کے سوا اس نے اور کسی چیز کے متعلق سوچا ہی نہ تھا۔

جب وہ جوان ہو گیا تو بے فکری کے باعث جب اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے چوروں اور ڈاکوؤں سے یارانہ گانٹھا۔ دو تین برس اسی قسم کے مشاغل میں گذر گئے۔ جب باپ نے دیکھا کہ بیٹا سیدھے راستے سے بھٹک کر اپنی زندگی خراب کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس نے اس کی شادی کر دی۔ ازدواجی زندگی کے بندھن کچھ ایسے مضبوط ثابت ہوئے کہ ذمہ دار انسانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔

شادی کے بعد بال بچے بھی ہوئے۔ جیون کے دشوار گذار اتار چڑھاؤ سے ہو کر بھی گذرنا پڑا۔ لیکن اسے آج تک ایسا تلخ تجربہ حاصل نہیں ہوا تھا کہ انسان پیٹ کی

روٹی اور تن کے کپڑے کے لئے ایمان داری سے کام کرنا چاہیے تو اسے کام
ملتا ہی نہ تھا۔ جدید معاشی پیچیدگیاں اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھیں۔ اسے یہ
سب چیزیں قطعاً غیر فطری دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن اس کا ذہن ان مسائل کا خاطر خواہ
حل پیش کرنے سے قاصر تھا۔

وہ کوچہ بہ کوچہ گھومتا پھرا۔ گندی گندی گلیاں جہاں رکے ہوئے پانی کی نالیوں میں
سے سخت بدبو اٹھتی تھی کہ دماغ پھٹا جاتا تھا۔ جا بجا گلی سڑی سبزیوں، پیاز کے
چھلکوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر دکھائی دیتے تھے۔ اونچی نیچی گلیوں میں جا بجا
ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی اینٹیں، مٹی، چونا اور روڑی پھیلی ہوئی تھی۔ مٹیالے رنگ
کی بھدی اور گندی دیواریں طبیعت کو اور زیادہ پراگندہ کر دیتی تھیں۔ پھٹے پرانے
کپڑے لٹکائے چھوٹے بڑے ننگے بچے چیختے اور چلاتے ہوئے ایک دوسرے کے
پیچھے بھاگ رہے تھے۔ مکانوں میں زیادہ تعداد ایسے مکانوں کی تھی جن کے
دروازے تک جل گئے تھے۔ ان کے اندر صحن کے مناظر صاف دکھائی
دیتے تھے۔ ڈھیلی رسیوں والی چارپائیاں، ان پر بیٹھی ہوئی میلے کچیلے دوپٹوں کے
مکھیاں اڑاتی ہوئی عورتیں اور ان کے بھوک سے بلکتے ہوئے بچے جو چیخ چیخ کر ماؤں
کی چھاتیوں کو ٹٹولتے تھے، حالانکہ ان چھاتیوں میں اب دودھ کہاں رہ گیا تھا۔ بعض
ہلکی ہلکی آنچ پر تین تین دنوں کی باسی روٹیاں ابالی جا رہی تھیں۔

گھوم پھر کر بابا لکھا سنگھ بدھ سنگھ کے مکان کے آگے پہنچ کر رک گیا۔
شام کے وقت بدھ سنگھ کے درشن کرنا —— اس کے معمول میں داخل تھا۔
بدھ سنگھ کو (جسے گھر میں بڑے سردار جی کے نام سے پکارا جاتا تھا) گوربانی کی

باتیں کرنے اور دیاکھیان دینے کا بڑا چسکا تھا۔ چنانچہ وہ اس قسم کے لوگوں سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا جو اس کی روحانیت کے قائل ہو کر اس کی باتیں انہماک سے سننا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ گرنتھ صاحب میں سے شلوک پڑھے جاتے اور گیان اور معرفت کے دریا بہائے جاتے۔

اس نے ڈیوڑھی میں سے اوپر کو جاتی ہوئی کشادہ اور صاف ستھری سیڑھیوں کی جانب دیکھا جو ابھی ابھی دھوئی گئی تھیں۔ سیڑھیوں کے اوپر والے دروازے میں سے افق میں چمکتے ہوئے سورج کی تیز روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ نور کا دریا تھا کہ نچلی سیڑھیوں تک بہتا چلا آ رہا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

ملازم کی زبانی معلوم ہوا کہ بڑے سردار جی گھر ہی میں ہیں۔ وہ قدم بہ قدم سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اوپر کے دروازے کے دائیں جانب سارا خاندان رہتا تھا اور بائیں طرف کا حصہ جو دو کمروں اور ایک صحن پر مشتمل تھا بڑے سردار صاحب کے لئے مخصوص تھا۔ بڑے حصے سے چھوٹے حصے تک ایک چوڑا راستہ تھا جس کے دونوں جانب پھولوں کے گملے دھرے تھے۔

بلاکی سنگھ اوپر پہنچا تو اس وقت سردار صاحب صحن میں چھوٹے سے پوآسن بچھائے براجمان تھے۔ قریب ہی چوکی پر پانی کا لوٹا اور انگوچھا دھرا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی پاٹھ سے فارغ ہوئے ہیں ـــــ سورج افق تک پہنچ چکا تھا اور بادل کا ایک ٹکڑا اسے اپنے دامن میں چھپا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ آگے بڑھا تو سردار صاحب نے پاؤں کی آہٹ پا کر پیچھے کی جانب گھوم کر

دیکھا۔ اس نے ست سری اکال کا نعرہ بلند کیا۔ سردار صاحب کی مونچھوں تلے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "آئیے آئیے بساکھا سنگھ جی، کہیے کیا حال ہے؟"

"کرپا ہے — اپنی کہیے۔"

بڑے سردار صاحب نے سر پر لپٹی ہوئی چھوٹی سی دستار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ابھی ابھی رہراس کا پاٹھ کیا ہے . . . . ذرا سامنے کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔"

منظر؟

بساکھا سنگھ نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اسے کوئی ایسا منظر دکھائی نہیں دیا جس سے وہ بھی لطف اندوز ہو سکتا۔ گرد آلود فضا میں خستہ حال جلے بھنے مکانوں کے سلسلے اور ان کی نیم تاریک غلیظ گلیوں میں حقیر کیڑوں کے مانند رینگنے والے دکھی انسانوں میں سے کوئی بھی ایسا منظر پیش نہیں کرتا تھا جس سے لطف اٹھایا جا سکے — سچ مچ بڑوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔

وہ اور قریب پہنچا تو سردار صاحب نے کمال مہربانی سے چوکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "گڑوی اور انگوچھا منڈیر پر رکھ کر چوکی پر بیٹھ جائیے۔"

بساکھا سنگھ نے حکم کی تعمیل کی۔

اس نے اپنے گرد سے اٹے ہوئے بوسیدہ جوتوں کی جانب چھپی نظروں سے دیکھا اور گرد آلود ٹخنوں کو تہبند کے پلوؤں سے ڈھانپتے ہوئے پاؤں سمیٹ لیے۔

"واہگورو! واہگورو!" سردار صاحب کی گھنی مونچھوں میں سے آواز نکلی۔ "دیکھیے

سردار صاحب! کرتار کی لیلا بھی کیسی نیاری ہے . . . . میں دن رات سوچا کرتا ہوں کہ آخر یہ جگ مایا ہی تو ہے۔ یہ مکان، یہ زمین، یہ آرام بھوگنے کے سب سامان ایک روز دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ دھنیہ ہیں وہ لوگ جو روکھی سوکھی کھا کر بھی واہگورو کے نام کا سمرن کرتے ہیں۔ سورگ بھی تو اکال پرکھ نے ایسے ہی لوگوں کے لئے بنایا ہے۔ ہم لوگ تو گنہگار ہیں، پاپی ہیں۔ ہے واہگورو ہے واہگورو . . .‘‘

اس کے بعد انہوں نے ایک گورو بھگت کی کتھا سنائی۔ وہ سادھو تھا۔ رام نام کا پیاسا۔ اس کا جی چاہا کہ کھیر کھائے۔ عقل نے کہا۔ مورکھ! تو سادھو ہے سنیاسی ہے، تجھے ان چیزوں سے کیا تعلق؟ من نہیں مانا تو اس نے اپنے پریمی کے گھر جا کر کھیر کھائی۔ اتنی کھائی اتنی کھائی کہ من بس بس پکار اٹھا لیکن اب بس کہاں۔ سادھو تو من کو سبق سکھانا چاہتا تھا . . .

یہ کتھا سنا کر بڑے سردار صاحب نے مسکین صورت بنائی اور آنکھیں مٹکا کر آسمان کی جانب دیکھا جو اس وقت خون کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

پہلے جب بساکھا سنگھ ان کی یہ باتیں سنتا تو اس پر وجد طاری ہو جاتا تھا لیکن آج اسے یہ باتیں بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں اور پھر سردار صاحب کی زبانی وہ اور بھی انوکھی معلوم ہوتی تھیں۔ بساکھا سنگھ پر یہ راز تو اب کھلا تھا کہ خالی پیٹ طویل پاٹھ کرنا تو رہا ایک طرف، انسان کے منہ سے ایک شبد ’واہگورو‘ تک نکلنا ناممکن ہے۔ اسے خیال آیا کہ اس شخص کے ماحول کے اجلے پن میں ہزار ہا غریبوں کی تمناؤں کے خون کی سرخی بڑی چابک دستی سے چھپا دی گئی ہے۔

بڑے سردار صاحب کی باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔
دھوئیں کے ستون بستی سے اوپر اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ یکجا ہو کر بوجھل بادلوں کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ مکان کے بڑے جتھے کی جانب سے سفید اور اُجلی دیواروں کے سلسلوں میں سے ہنسنے، کھیلتے، بولتے، چہکتے بچوں اور عورتوں کی نقرئی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔
دفعتہً سردار صاحب بولے "آئیے لبا کھا سنگھ جی اندر چلیں۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔"
سردار جی کمرے کی طرف بڑھے۔ ان کے پیچھے چلتے ہوئے لبا کھا سنگھ نے گھوم کر دیکھا کہ افق پر غروب ہوتے ہوئے سورج کے سر پر بدلیوں کے چند ٹکڑے پھیل رہے ہیں اور خون سے لتھڑی ہوئی سنگین کی طرح آفتاب کی ایک طویل کرن حیالے آسمان کے سینے کے پار ہو گئی ہے۔
دو کمروں میں سے ایک میں گورو گرنتھ صاحب کا پرکاش کیا گیا تھا۔ اس کمرے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ گورو گرنتھ صاحب اونچے چبوترے پر رنگین رومالوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے آگے دری پر بچھے ہوئے رومال کے دامن میں چند رنگین پھول دکھائی دے رہے تھے۔ مکھیاں جھلنے کی چوری کے سفید بال گھوڑے کی ایال کی طرح ایک جانب کو لٹکے ہوئے تھے۔ دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے گلدان اور ان میں باسی گھاس میں چند پھول اڑسے دکھائی دے رہے تھے۔ چونکہ بجلی ابھی وہاں نہیں آئی تھی۔ اس لئے ایک چھوٹا سا خوبصورت لیمپ چوکی پہ دھرا تھا۔

بڑے سردار صاحب کا کمرا بھی بڑا تھا۔ فرش پر دری اور دری پر دو چھوٹے چھوٹے پرانے غالیچے بچھے تھے۔ سردار صاحب اُجلے بستر پر بیٹھ گئے۔ سرہانے کے قریب رکھی ہوئی تپائی پر ایک بہت بڑا اور خوبصورت نیل کا لمپ روشن تھا۔

بساکھا سنگھ کے لئے وہی جانا پہچانا ماحول تھا۔ ایک طرف دیوار پر گورو نانک صاحب کی بڑی سی تصویر تھی جس میں وہ نام جپتے ہوئے دکھلائے گئے تھے۔ "انکھیں بھگتی رس میں ڈوبی ہوئیں، ہاتھ میں مالا، نام خماری نانکا چڑھی رہے دن رین۔" انہوں نے لوگوں کی گاڑھی کمائی کا روپیہ نہیں کھایا تھا بلکہ انہوں نے سچا سودا کیا تھا جس پر باپ نے انہیں بری طرح پیٹا تھا۔ مذہبی واقعات کے متعلق اور بھی کئی تصاویر لگی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل رکھی تھی جس پر کنگھے، برش، تیل کی شیشیاں سب بے ترتیبی سے دھری تھیں۔ ایک جانب فرش پر چند زرد رنگ کی کوڑیاں بکھری پڑی تھیں غالباً بچے انہیں وہاں بھول گئے تھے۔

سردار جی نے گاؤ تکیہ بغل میں دبایا اور قریب کی الماری میں سے سبز رنگ کی جلد والی ایک موٹی سی کتاب نکالی۔ اس میں مختلف بھگتوں کا کلام مع تشریح کے درج تھا۔ سردار جی نے بڑے انہماک سے کلام سنانا شروع کیا۔ بساکھا سنگھ کرسی پر بھونڈے انداز میں بیٹھا بظاہر سن رہا تھا لیکن درحقیقت اس کا ان چیزوں میں دھیان نہیں تھا بلکہ بعض اوقات خود سردار صاحب بھی پڑوس کے کمہار کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ میں سطر بھول کر کہیں اور جا پڑتے تھے۔

بالآخر یہ پروگرام ختم ہو گیا تو سردار صاحب نے کتاب بند کر کے تپائی پر رکھ دی۔ آسمان پر اکا دکا تارے جھلملانے لگے تھے۔

دفعتہً سردار صاحب بولے۔ "آج ہم نے ایک پستول خریدا ہے۔"

"پستول؟" بساکھا سنگھ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں۔" یہ کہہ کر سردار صاحب الماری کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"وہ کیوں؟" بساکھا سنگھ نے تعجب سے پوچھا۔

سردار صاحب نے قدرے تامل کیا اور پھر ایک چپٹا ڈبہ نکال کر لائے۔ "دیکھئے نا آج کل زمانہ بڑا خراب ہے۔ دنیا میں کسی کا کوئی دھرم ایمان ہی نہیں رہا۔ ہم یہاں رہتے تو ہیں لیکن ہمیشہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں ادھر ادھر کے اچکوں میں سے کوئی گھر میں گھس آئے تو کیا ہو۔ واہگورو۔ . . . واہگورو۔ . . آج کل تو لوگ خواہ مخواہ ہاتھاپائی پر اتر آتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے پستول کی جھلک دکھائی۔ بساکھا سنگھ نے دیسی ساخت کے پستول تو دیکھے تھے لیکن اس قدر اچھا پستول دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

سردار صاحب کہنے لگے۔ "یہ ویبلے کمپنی کا بنا ہوا ہے۔ بہت اچھی کمپنی ہے۔ اسٹینڈرڈ چیز ہے۔ . . آٹومیٹک ہے۔ . . اڑتیس بور (Bore 38) ہے۔"

بساکھا سنگھ چپ چاپ پستول کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"آپ جانتے ہی ہیں آج کل زمانہ خراب ہے، کبھی وقت بے وقت ادھر ادھر آنا جانا پڑتا ہے۔ رات کو بھی اسے تکئے کے نیچے رکھ کر سویا جائے تو خاصی بے فکری سی محسوس ہوتی ہے۔"

بساکھا سنگھ نے گردن قدرے آگے بڑھا کر پوچھا۔ "کیوں جی اس کی قیمت کیا

ہو گی ؟"

سردار صاحب نے لاپروائی سے کہا: "یہ تو سستا ہی مل گیا۔ اجی آج کل یہ چیز بالکل نایاب ہو گئی ہے۔ مجھے تو چودہ سو روپے میں مل گیا ہے۔"

"چودہ سو؟ . . . یعنی ایک ہزار چار سو ہیں . . ." یہ کہتے کہتے بساکھا سنگھ کا حلق خشک ہو گیا اور اس کی آواز بھی بھنبھس کر رہ گئی۔

"یہ دیکھئے . . . . . ادھر سے کارتوسوں کی میگزین اندر داخل کی جاتی ہے۔ آٹھ کارتوس ہوتے ہیں ایک میگزین میں۔ اسے ادھر کو ہٹایا اور اس کو اس طرف دبایا . . . بس اب تیار ہے . . . . . یکے بعد دیگرے آٹھ گولیاں چل سکتی ہیں۔"

بساکھا سنگھ نے دیکھنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سردار صاحب نے پستول اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا: "خیال رہے بھرا ہوا ہے۔ گھوڑا دبانے کی کسر ہے . . . انگلی لبلبی سے دور ہی رہے . . . ."

اس لوہے کے سرد ہتھیار کو پکڑتے وقت پہلے تو بساکھا سنگھ کا ہاتھ کپکپایا اور پھر اس نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اسے ادھر ادھر گھما کر دیکھا۔ پھر رفتہ رفتہ مٹھی میں لے کر انگلی لبلبی پر رکھ دی۔

سردار صاحب نے اک دم ہاتھ آگے بڑھایا: "ارے چل نہ جائے . . . ."

بساکھا سنگھ نے پستول والا ہاتھ فوراً پیچھے ہٹا لیا اور پھر اس نے دھیرے دھیرے سر اوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ پیدا ہو کر رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔ اس کی آنکھیں راکھ کی طرح سیاہ اور بے کیف دکھائی دے رہی تھیں۔

سردار صاحب پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے سر پر چھوٹی ململ کی زرد سی دستار لپٹی ہوئی

تھی۔ داڑھی لٹک رہی تھی۔ آنکھوں سے سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت ہویدا تھی۔ انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "خاموش کیوں ہو، کیا تم سوچ رہے ہو کہ اگر اس وقت تمہارے دشمن تمہارے سامنے ہو تو تم انہیں چنوں کی طرح بھون ڈالو؟"

"کون دشمن؟" بساکھا سنگھ نے بے رس آواز میں پوچھا اور پھر وہ سمجھ گیا کہ سردار صاحب کے اس اشارے کا کیا مطلب ہے۔

وہ اٹھ کر کرسی سے الگ کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھاری آواز میں کہنا شروع کیا۔ "صبح سے شام تک اپنی پیشانی سے ایڑی تک پسینہ بہانے والا کوئی شخص بھی میرا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اب مذہب صرف دو رہ گئے ہیں۔ ایک دوسروں کا خون چوسنے اور انہیں لوٹنے والوں کا مذہب اور دوسرا اپنا خون دینے والوں اور لٹنے والوں کا مذہب۔ اس کے علاوہ اور کوئی مذہب نہیں ہے۔ آپ سمجھے۔ . . . آپ نہ معلوم کون سے گیان دھیان کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ . . وہ باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں۔ . . . شاید اس لئے کہ میں بھوکا ہوں، میرے بچے بھوکے ہیں، میری بیوی بھوکی ہے۔ . . . میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لئے ترستا ہوں۔ . . ."

پھر وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ اس نے دوبارہ چودہ سو روپے والے پستول کی طرف دیکھا اور نظریں سردارجی کی نظروں سے ملائیں۔

سردارجی ہڑبڑا کر چارپائی سے اٹھ بیٹھے۔ تپائی کو دھکا لگا اور لیمپ نیچے گر پڑا . . . تیل بہہ نکلا اور غالیچے کو آگ لگ گئی۔

بڑے سردار صاحب کے لئے باہر جانے کا راستہ بالکل بند تھا۔ راستے میں لمبا تڑنگا بسا کھا سانڈ کھڑا تھا۔ اس کے چوڑے شانے، مضبوط ٹانگیں، مچھلیوں والے بھرپور بازو، تنی ہوئی گردن، چوڑے چکلے ہاتھ۔۔۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بدن میں نسوں کی بجائے فولاد کی تاریں کھینچ دی گئی ہیں۔۔۔ مضبوط، مغرور، اٹل — بڑے سردار صاحب دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی، پلپلا پیٹ نیچے اوپر ہو رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑی تھیں۔ وہ اس قدر دہشت زدہ ہو چکے تھے کہ خشک حلق میں سے کوئی آواز تک نہیں نکل پاتی تھی۔ وہ بت بنے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اجڈ کسان کی طرف دیکھ رہے تھے۔۔۔۔

دفعتہً شور سا بپا ہو گیا۔ کہاروں کے گدھے زور زور سے ہنہنانے لگے۔ ادھر سے ریل گاڑی گڑگڑاہٹ کا شور مچاتی پل پر سے گزر رہی تھی اور ادھر انجن اپنے پھیپھڑے سے بیک جنبش پینوں کی صدائیں فضا میں بکھیر رہا تھا۔۔۔ تمام بیچ کی بجھی ہوئی آگ لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔۔۔

تعمیر

بوسیدہ ہونے میں دھنسے دھنسے اس نے سگرٹ کا ایک طویل کش لینے کے بعد منہ کھولا تو گہرے سرمئی رنگ کے دھوئیں کا کلبلاتا اور بل کھاتا ہوا بادل باہر نکل کر فضا میں پھیلنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے آگے سے دھوئیں کا پردہ ہٹ گیا اور دیوار پر لگی ہوئی بڑے سائز اور پرانے ڈھنگ کی رنگین تصویر صاف نظر آنے لگی۔

آج کل اس قسم کی تصویروں کا رواج نہیں تھا لیکن لالہ جی کے گمنام ہوٹل کے سنسان کمرے میں اور کس چیز کی توقع کی جا سکتی تھی؟ تصویر میں پرانے زمانے کے کسی مہاراجہ کے رنگ محل کا اندرونی منظر دکھایا گیا تھا۔ نوجوان رانی سکھیوں کے ہمراہ نیلے پانی کے تالاب کے کنارے کھڑی تھی۔

ہائے کس قدر دل گداز منظر تھا یہ!

وہ مہوش رانی جس پر بھولے سے نگاہ ڈالنے والے شخص کی آنکھیں نکلوا دی جاتی ہوں گی — اور پھر اس دل ربا کے محل کا یہ حصہ خاص جہاں بلا اجازت شاید کوئی پرندہ بھی پر مارنے کی جرأت تک نہیں کرتا ہوگا — ان سب پر طرہ یہ کہ عین غسل کا سماں . . . ایک سے ایک بڑھ کر مہ جبین . . . ان میں سے مکمل طور پر عریاں ابھی کوئی بھی نہیں تھی۔ کپڑے اتارنے کے سارے مراحل ابھی طے نہیں ہونے پائے تھے . . . .

- آگئی ؟

وہ چونکا — نہیں یونہی کھٹکا ہوا تھا۔

کوئی نہیں، کوئی نہیں — دلِ زار اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔

صاف چاندنی رات تھی۔ انہیں اس وقت تک پہنچ جانا چاہئے تھا۔ خیر! شراب کا خمار ابھی باقی تھا۔ اس لئے وہ اپنے ذہن کو بے خیالی کے عالم میں ڈگمگانے کی اجازت دے سکتا تھا۔

تمہ ور والے تالاب میں گہرے سبز رنگ کی کائی کے تودے پانی میں بکھرے رہتے تھے۔ ان تودوں میں سے گزرتے ہوئے ہنس ادھر ادھر تیرتے پھرتے تھے۔ عورتیں چکنے اور رندانہ فرش پر اس انداز سے کھڑی تھیں جیسے لمحہ بھر میں وہ اپنے نپٹے کھچے کپڑے بس اتار پھینکیں گی اور پھر خوشرنگ نیلے پانی کی تہوں میں سے لو دیتے ہوئے ان کے برہنہ بدن کیا ہی حسین سماں پیدا کریں گے۔

آگئی ؟

اس نے کچھ [illegible]

"جی ہاں"۔

ملازم کی زبانی یہ جواب سن کر اس نے خاص بے چینی کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ سگرٹ کا کش لیتے ہوئے نگاہ دروازے پر گاڑ دی۔

لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کا لباس بھڑکدار ضرور تھا لیکن اس میں کوئی کشش نہیں تھی، نہ اس کی وجہ سے لڑکی کے حسن میں اضافہ ہوا تھا۔ لڑکی کا رنگ سانولا، خدوخال معمولی لیکن بحیثیت مجموعی صورت دلکش اور بدن نوخیز و عطر بیز تھا۔

نووارد جیبو کرمی دیدہ دانستہ اس انداز سے کھڑی ہو گئی کہ سر سے پاؤں تک بخوبی اس کو دیکھا جا سکے۔ گاہک نے بظاہر نیم وا آنکھوں لیکن حقیقتاً متجسس نگاہوں سے لڑکی کی صورت کا جائزہ لیا۔ سنولائے ہوئے رنگ پر نوخیز خون نے عجب نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی ہموار اور تنی ہوئی جلد دیکھ کر وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اندر سے کیسی ہوگی۔

چنانچہ اس نے لڑکی سے نگاہ ہٹا کر اس کے ہمراہ کھڑے ہوئے مرد کی جانب دیکھا۔ پھر اس سے بھی نگاہیں پھیر لیں اور کھڑکی میں سے نظر آنے والے آسمان میں روئی کے گالوں کے مانند بادلوں کی ٹکڑیوں پر نظر جما دی۔ وہ ٹکڑیاں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے بے کنار سمندر میں برف کے تودے اٹکھیلیاں کر رہے ہوں۔

قدرے تامل کے بعد اس نے سگرٹ کی راکھ جھاڑی اور لڑکی کے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا "رات بھر رہنا ہوگا"۔

لڑکی کے ساتھی کی مونچھیں گھوم گر اس کے بھینچے ہوئے لبوں میں گھسی ہوئی تھیں۔ اس نے بات کا جواب دینے کے لئے منہ کھولا تو مونچھیں ہوا کے زور سے متحرک

ہو گئیں جیسے کنکھجورا رینگنے کو ہو۔ لیکن گاہک نے یہ تماشہ نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں آسمان پر جمی تھیں۔

اثبات میں جواب پاکر اس نے گردن گھمائے بغیر دریافت کیا۔ "ریٹ کیا ہے؟"

"ریٹ تو — خیر پچاس روپے پر معاملہ طے ہو جائے گا۔"

"پچیس۔"

اس نے قدرے تامل کیا۔ "یہ بہت کم ہے۔ . . ."

"نہیں — بس ٹھیک ہے — تم زیادہ طلب کرتے ہو۔"

"اجی واہ . . . لوگ رات بھر کا دو دو سو بھی خرچ کر ڈالتے ہیں۔"

"مال مال کی قیمت ہے۔"

لڑکی نڈھال سی ہو گئی تھی — اس نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا

"تم بیٹھ جاؤ۔" ساتھی بولا

"چاہو تو جا سکتے ہو تم لوگ۔" گاہک نے کہا

لڑکی کرسی پر بیٹھ چکی تھی لیکن اُٹھنے کے لئے پر بھی تول رہی تھی۔

اس کا ساتھی عجب کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ دیر تک بے تکی سی خاموشی طاری رہی۔ آخر اس نے غیر مستحکم آواز میں کہا۔ "آپ ہمیں کچھ زیادہ دے دیجئے۔ ہم لوگ شریف ہیں . . . لیکن رفیوجی ہیں . . . کیا کریں کیا نہ کریں۔"

"میں بھی رفیوجی ہوں۔"

اب لڑکی کا ساتھی بالکل "دم بخود" ہو کر رہ گیا۔

ادھر سگرٹ کے تیز تیز کش لگائے گئے۔ پھر اس کی ٹھوٹی پھینک دی گئی۔ آواز گونجی "تیس دے سکوں گا۔ بس۔ اب تم ـــ یا تم دونوں جا سکتے ہو۔"

گاہک کی فیصلہ کن بات سن کر مرد نے لڑکی کی جانب دیکھا لیکن دونوں کی نظریں مل نہیں سکیں۔ کیونکہ لڑکی کے چہرے بلکہ سارے بدن پر بے حسی طاری تھی۔ اس کے پپوٹے جھکے ہوئے تھے۔ یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ اپنی خوش وضع چھوٹی چھاتیوں کے ابھار بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

بالآخر ساتھی نے بے کیف آواز میں کہا "اچھا میں چلا جاتا ہوں"۔

دس دس کے تین نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیئے گئے اور وہ اپنے پیچھے دروازے کو بھیڑتا ہوا سست قدموں سے روانہ ہو گیا۔

وہاں اب وہ دونوں رہ گئے تھے۔

مرد نے نیا سگرٹ سلگایا اور لڑکی کی جانب متوجہ ہوئے بغیر بڑے انہماک سے کش پر کش لینے لگا۔ سودے بازی کے معاملوں سے اسے خاص کوفت محسوس ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کوفت کا غبار اس کے دل سے دور ہو جائے تو وہ لڑکی کی جانب متوجہ ہو۔

کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔

دفعتہً عجیب شور بلند ہوا ـــ پھر سکوت ٹوٹ گئی ـــ اور چند لمحوں کے بعد اسے اس بات کا احساس ہوا کہ لڑکی نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت تک وہ کسی نہ دب سکنے والے درد کو زور زور سے باندھے رہی تھی لیکن بالآخر لاوا بہہ نکلا۔

لڑکی کی اس حرکت سے اسے سخت کوفت ہوئی لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ بلکہ اطمینان سے سگرٹ پیتا رہا۔ ایک ختم ہوتا تو وہ اسی سے دوسرا سلگا لیتا۔

لڑکی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی جیسے وہ اپنا کلیجہ پگھلا کر آنسوؤں کے ذریعے سے بہا دے گی۔ بالآخر رونے کی شدت میں کمی ہونے لگی . . . . اور پھر — رفتہ رفتہ رونا دھونا ختم ہو گیا۔ اب صرف ہچکیاں باقی رہ گئی تھیں۔

وہ کرسی سے اٹھا۔ اس اثنا میں لڑکی کمرے کے ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی تھی اور اپنی ہچکیوں میں دبی ہوئی تھی۔ مرد ٹانگیں لٹکا کر پلنگ پہ نیم دراز ہو گیا۔ سر کے نیچے پروں والا تکیہ دبا لیا۔ دھواں کبھی منہ سے اور کبھی نتھنوں سے نکالنے میں مشغول رہا . . . . اور خوابناک نظروں سے سانولی سلونی لونڈیا کو دیکھتا رہا۔ اب وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہچکیاں لیتی تھی لیکن اس قدر گہری اور جھنجھوڑ دینے والی کہ ہر ہچکی پر وہ سر سے پاؤں تک لرز جاتی تھی۔

اس نے لڑکی کی دھلی دھلائی آنکھوں، نمی سے بوجھل پلکوں اور لو دیتے ہوئے ہونٹوں کی جانب دیکھا — ان دونوں کو یوں محسوس ہوا کہ اس سکوت میں گفتگو کئے بغیر بھی وہ ایک دوسرے سے واقف اور مانوس ہو گئے ہیں . . . لڑکی کے گالوں پہ آنسوؤں کی چوڑی اور بھدی لکیریں اسے قطعاً پسند نہیں آئیں . . . . اور آنسو ٹپ ٹپ کر کے اس کے لباس پہ بھی گرتے رہے تھے۔

مرد نے بستر میں پڑے پڑے ایک تولئے کی گیند بنا کر لڑکی کی جانب پھینکی اور غیر جذباتی آواز میں کہا "لو آنسو پونچھ ڈالو . . . لباس بھی خراب کر لیا ہے تم نے . . . گالوں پہ پھیلے ہوئے آنسوؤں کو تھپتھپا کر خشک کر ڈالو۔ پوڈر بالکل صاف

ہو جائے۔ . . . یقیناً یہ دیکھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوئی کہ تم نے پوڈر منہ پہ تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے تمہارے ذوق کی پاکیزگی کا ثبوت ملتا ہے۔"

حالانکہ اس کی آواز قطعاً غیر جذباتی تھی لیکن نہ معلوم اس میں کیا کشش تھی کہ لڑکی نے چپ چاپ اس کی ہدایت کے مطابق چہرہ صاف کر ڈالا۔

آنسو پونچھ لینے کے بعد اس نے مرد کی جانب یوں دیکھا جیسے جاننا چاہتی ہو کہ اب میں کیسی دکھائی دیتی ہوں۔ لیکن مرد بے حس و حرکت اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بھڑکدار اور بے ہودہ لباس کے باوجود اس کے بدن کی رعنائی عیاں تھی۔ ہاتھ پاؤں مضبوط، کشیدہ قامت، لمبی اور لچک دار گردن اور پھر سانولا رنگ عجب بہار دکھا رہا تھا۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟" مرد نے بات شروع کی۔

"سترہ برس۔"

"کیا تم گاؤں کی رہنے والی ہو؟"

"جی ہاں لیکن شہر میں پڑھتی رہی ہوں۔"

"اچھا تم پڑھی لکھی بھی ہو؟"

"جی۔"

"کہاں تک؟"

"دسویں میں تھی کہ . . . ."

"فسادات شروع ہو گئے۔"

"نہیں ـــــ شادی ہو گئی تھی۔"

"اچھا تو پھر تم اپنے شوہر کے ساتھ رہنے لگیں۔"

"یہی تین چار مہینے ___ پھر فساد شروع ہو گئے۔"

"اور تمہارے پتی . . . ؟"

"مارے گئے . . . سب مارے گئے . . . صرف میں بچ گئی یا بچا لی گئی۔ وہاں میری عزت کئی بار خراب کی گئی۔ بالآخر ادھر لائی گئی لیکن جن کا سہارا لیا انہوں نے پیشہ کروانے پر مجبور کر دیا۔"

تھوڑے سکوت کے بعد مرد نے کہنا شروع کیا۔ "میری عمر تیس برس کی ہے۔ تقسیم سے پہلے میں سیالکوٹ میں کاروبار کرتا تھا۔ میں کوئی خاندانی رئیس نہیں تھا لیکن اچھا خاصہ گذارا ہو رہا تھا۔ بیوی اور دو بچے بھی تھے ___ اب کوئی نہیں اور نہ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ ہے۔ جب کبھی مشکل میں تیس روپے جمع ہو جاتے ہیں تو عورت کی شکل دیکھنی نصیب ہوتی ہے۔ میری صورت کی بابت تمہارا کیا خیال ہے . . . میرے بال بہت ملائم ہیں لیکن جب صبح برش کرتا ہوں تو کنپٹیوں سے چند بال نکل آتے ہیں۔ میرا رنگ صاف تھا لیکن اب چہرے پر مٹی سا غبار چھایا رہتا ہے۔ آنکھیں بڑی تو نہیں تھیں لیکن ان میں وہ چمک بھی باقی نہیں رہی۔ تم جانتی ہی ہو کہ تفکرات اور بے قاعدہ رہن سہن سے انسان کی صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے . . . ."

"ہاں ___ لیکن آپ اچھے آدمی ہیں۔" لڑکی نے طفلانہ انداز سے کہا

"اچھا آدمی ؟ ___ بس ؟ ارے دوسری عورتیں تو میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتی تھیں اور تم مجھے محض اچھا آدمی ہی کہتی ہو۔"

اسے لڑکی اس وقت بہت بھلی دکھائی دی۔ جب وہ اس سوال کے جواب میں اس کی جانب دیکھے بغیر دل کش انداز میں قدرے ہنستے ہوئے سر کو جنبش دے کر صرف لمبی سی مترنم "ہوں" کر کے رہ گئی۔

مرد نے لیٹے لیٹے پوچھا "یہ دھندا کب سے کر رہی ہو اور . . . میرا مطلب ہے کہ کب سے کروایا جا رہا ہے . . . ."

اس پر لڑکی کا منہ بھبھ لینے لگا۔ پھر سے اس کے رٹنے کے امکانات پیدا ہونے لگے . . . بولی "ایک مہینے سے" اور پھر جیسے اس کی آواز بھرّا کر رہ گئی۔

مرد نے عجلت سے کہا "دیکھو بھئی! باوجودیکہ تم یہاں ــــ دھندے کے سلسلے میں آئی ہو یا لائی گئی ہو . . . اور میں حیوانی جذبے کے تحت آیا ہوں . . . یا لایا گیا ہوں . . . . تاہم ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم شریف لوگ ہیں . . . ."

یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب ہنسی لڑکی کے لبوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی ہے۔ وہ جھنجلا کر بولی "لیکن اب میں بے حد تنگ آ گئی ہوں۔ ہر روز جب میری بابت سودے بازی ہوتی ہے . . . تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں اس قدر گہرے کھڈ میں گر چکی ہوں یا گرا دی گئی ہوں کہ اب میرا یہاں سے نکلنا ناممکن ہے . . . . آپ . . . . آپ پھر بھی شریف ہیں لیکن عورت کی حیثیت سے . . . ."

"نہیں . . . کیا نام ہے تمہارا . . . میں تم سے زیادہ شریف نہیں ہوں۔

اگر ہوتا تو تمہیں اور تم ایسی لاکھوں لڑکیوں کو یہ پیشہ اختیار کرنا نہ پڑتا۔"

یہ کہہ کر اس نے کمرے میں اِدھر اُدھر بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس وقت لڑکی کرسی پر بیٹھی تھی۔

وہ ٹہلتا رہا۔۔۔ چند منٹ کے بعد اس نے پھر لڑکی کی جانب دیکھا کہ وہ سر نیہوڑائے نظریں فرش پر گاڑے ہے اور عمیق غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

"تم کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ چپ رہی۔

"تم چپ کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔" لڑکی نے بے کیف آواز میں جواب دیا۔ "یونہی۔ بیتے دنوں کو یاد کر رہی ہوں۔ اپنی زندگی کا وہ آغاز اور یہ انجام دیکھ کر دل ڈوبا جاتا ہے۔"

"۔۔۔ اور شاید اسی سلسلے میں تم یہ بھی سوچ رہی ہو کہ یہ سب قتل و غارت اس لئے ہوا کیونکہ سب کے سروں پر شیطان کا سایہ مسلط تھا۔"

"جی ہاں۔"

"لیکن یہ غلط ہے۔"

لڑکی نے قدرے متعجب ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

چندے تامل کے بعد مرد نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا۔ "درحقیقت یہ سب کچھ نیکی کی خاطر پیش آیا ہے۔ مرنے والے نیکی کی راہ میں مرے ہیں اور مارنے والوں نے اللہ ہو اکبر، بم بم بھولے اور ست سری اکال کے نعروں کے شور میں قتل کئے ہیں۔ مجھے تو اس میں ناپاکی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ یہ درست ہے

کہ قتل ہوتے وقت مرنے والوں کو تکلیف ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن اب . . . اب تو وہ لوگ یقیناً بہشت میں حور و غلماں سے دل بہلا رہے ہوں گے یا سورگ میں گوکل کے کنھیا کی بنسری کی لے پر مسرور و شاداں ہوتے ہوں گے۔ یا ان کی روحیں ننھے ننھے رنگین پرندوں کے روپ میں سورگ کے سرسبز و شاداب درختوں کے پانی کے چشموں پر جھکی ہوئی نازک شاخوں پر جھولا جھولتی ہوں گی . . . . سمجھیں۔"

لڑکی نے انکار کے طور پہ سر ہلا دیا۔

مرد نے پھر تامل کیا — اور کہا "بات سیدھی سادی ہے۔ قاتلوں اور لٹیروں کی نیتیں صاف تھیں۔ طرفین نے ایک دوسرے کو انسان نہیں شیطان سمجھ کر قتل کیا ہے۔ یعنی کسی مسلمان نے کسی بھی ہندو یا سکھ کو خدا کا نیک بندہ سمجھ کر قتل نہیں کیا۔ کیونکہ خدا کے کسی بھی نیک بندے کو جان سے مارنے کے لئے بُرے سے بُرا مسلمان بھی راضی نہیں ہو سکتا اور یہی بات ادھر بھی صادق آتی ہے۔ تم کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہم لوگ . . . یعنی ہندو، سکھ اور مسلمان — وحشی نہیں ہیں۔ ہم سب نیک انسان ہیں۔ روز ازل سے سچائی اور محض سچائی کے متلاشی اور پرستار ہیں۔ بلکہ نیکی اور بدی کے معاملے میں ہماری معصومیت کا یہ حال ہے کہ ہم بڑے اطمینان سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں — اے بھولی اور نادان لڑکی! سمجھ لے اور مت بھول کہ نیکی کی راہیں بے حد دشوار ہیں . . . "

"میں خاک نہیں سمجھی۔"

مرد ٹھٹک گیا۔ وہ ایک دوسرے کی جانب خاموش نظروں سے تکتے رہے۔ پھر لڑکی بولی، "اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ یہ بھی نیکی کی راہ ہے . . . "

"ہاں" مرد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

لڑکی لاچار ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگی

مرد نے اس کی دلی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا "لیکن تم یہ خیال بھی تو کرو کہ اب تم گھریلو عورت کی زندگی کیونکر بسر کر سکتی ہو؟"

دفعتہً اسے وہ اجنبی مرد یاد آ گئے جنہوں نے فسادات کے دنوں میں بار بار اس کی عزت لوٹی تھی اور پھر ہم قوم مردوں کا کارواں آنکھوں تلے سے گزرنے لگا۔ جنہوں نے اس کے واپس لائے جانے پر اسے تباہ کیا تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر وہ رو پڑی ۔ ۔ ۔ پھوٹ پڑی۔

"یہ بات مجھے قطعاً پسند نہیں ہے ۔ ۔ ۔" مرد نے نرم لہجے میں احتجاج کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "تم پڑھی لکھی سمجھدار اور نیک لڑکی ہو۔ ذرا اس بات کا خیال بھی تو کرو کہ میں نے تیس تیس روپے اس غرض سے نہیں خرچ کئے ہیں کہ تم میرے روبرو بیٹھی رات بھر روتی رہو۔"

اس پر لڑکی فوراً چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں میں جو آنسو اُبل آئے تھے۔ وہ بھی قطرے بن کر نہیں ٹپک سکے بلکہ پلکوں ہی میں اُلجھ کر اور لرز کر رہ گئے۔

مرد نے اسی لہجے میں سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "تم آزاد اور آرام دہ زندگی کی عادی ہو چکی ہو۔ اب گھر کا کام کاج کرنا شاید موافق نہ آئے۔ کہاں یہ عیش و عشرت اور کہاں کسی غریب جھونپڑے کی محدود چار دیواری ۔ ۔ ۔ کہاں یہ رنگین بھڑکدار لباس اور کہاں ۔ ۔ ۔ ۔"

معاً دونوں کی نظریں ملیں۔ لڑکی جنگلی بلّی کے مانند بپھری بیٹھی تھی۔ اس کی

آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں ۔ ۔ ۔ مرد چُپ ہو گیا۔ دفعتاً لڑکی کے ہاتھ اٹھے اور اس نے وحشیانہ انداز سے گریبان چاک کر ڈالا اور قمیص تار تار کر ڈالی اور پھر شاید اسے رونا آنے لگا لیکن وہ ہٹ دھرمی سے آنسو پی کر شدید جنبش دے کر اور ہونٹ سختی سے بھینچ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

اس کے بدن کا اوپر کا حصہ عریاں ہو چکا تھا۔ اس نے انگیا نہیں پہن رکھی تھی۔ شاید اس کی چھاتیاں انگیا کی ضرورت سے بے نیاز تھیں جو ڈھیلا ڈھالا کپڑا اس نے سینہ پر باندھ رکھا تھا وہ خود بخود ڈھلک گیا۔

مرد نے اٹھ کر اس کے چیتھڑوں سے ہی اس کے بدن کو ڈھانپ دیا اور خود ذرا پرے ہٹ کر پوچھا "کیا اب میں تم کو چوم سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں؟" لڑکی نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

وہ اس کے قریب پہنچا۔ اس نے اس کے پریشان بالوں کو سنوارا اور دھیرے دھیرے دوستانہ انداز سے اس کے گرم رخساروں اور گھنے بالوں پر چمکارنے کے انداز سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس کا لڑکی کے دل پر خوشگوار اثر ہوا۔ قریب کی تپائی پر دھرے ہوئے آئینے میں دونوں کی نظریں ملیں۔ لڑکی نے آہستہ سے کہا "میری اس مانگ میں سندھور پڑ چکا ہے ایک مرتبہ۔"

"شاید پھر پڑے" مرد نے غیر جذباتی آواز میں جواب دیا۔

اس بات کا لڑکی کے دل پر اور بھی خوشگوار اثر ہوا۔ اس کے چہرے سے خشونت کے آثار زائل ہونے لگے تو مرد نے اس کے بال پرے ہٹا کر ٹھلنے کی جانب گردن کے نچلے حصے کی سب سے زیادہ پھڑکتی ہوئی رگ پر ہونٹ

رکھ دیئے۔

لڑکی کو لذت اور گدگدی کا احساس ہوا۔

"لو میں ذرا دروازہ بند کر دوں" یہ کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھا۔ تو لڑکی نے اس کی جانب دیکھے بغیر خوشگوار لہجے میں کہا: "آج جس مقام کا آپ نے بوسہ لیا ہے اسے پہلے کبھی کسی نے نہیں چوما۔۔۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرے بدن کا یہ حصہ بالکل کنوارا ہے، بے عیب اور پاک ہے۔۔۔"

آواز آئی "شاید اب تمہارے بدن کے کسی بھی حصے کو کوئی اور مرد نہیں چھو سکے گا" اب کے مرد کی آواز میں جذبات کی ہلکی سی لرزش موجود تھی۔

لڑکی نے دفعتاً گھوم کر اس کی جانب دیکھا لیکن وہ اس وقت چٹخنی چڑھا رہا تھا۔ اس کے سر کے بال قدرے بڑھے ہوئے تھے اور انہوں نے بڑھ کر اس کے نکھرے رنگ کی گردن کے کچھ حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ دروازہ بند کر کے فوراً لوٹ آئے۔۔۔ لیکن نہ معلوم مرد نے کیوں تامل کیا۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی کہ خود اس کے بدن کی طاقت بھی زائل ہو چکی ہے اور وہ کرسی سے اٹھ نہیں سکتی۔۔۔ لیکن اس نے نقاہت کے عالم میں بکمال بہ اخلاص مرد کے سر کے پچھلے حصے کو دیکھا اور اس کے دل نے سوال کیا "کیا اس ساری غلاظت اور سڑاند کے باوجود جو میرے بدن میں داخل ہو چکی ہے۔ کیا ان سب بدمعاشیوں کے باوجود جو میرے جسم کے ساتھ کی جا چکی ہیں کیا اب۔۔۔"

تب مرد نے سر گھمایا اور لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے بھرپور نظروں

دیکھا۔ اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ پھیلنے لگی جیسے وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہا ہو: اسے بھولی اور ناداں لڑکی! سمجھ لے اور مت بھول کہ ان ساری زیادتیوں، غلاظتوں، بدمعاشیوں سے تیری معصومیتیں اور نکھر آئی ہیں۔۔۔"

پھر وہ اس کی جانب قدم بقدم بڑھنے لگا۔ اب کے لڑکی اپنے آنسو نہیں روک سکی۔ وہ پھر زور زور سے رونے لگی۔ مرد نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ شدتِ جذبات سے لرزتے ہوئے شانوں کو ہلا کر بلند تر آواز میں روتے ہوئے چلائی: "نہیں میں ضرور روؤں گی۔" مرد چپکے سے آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس نے پھر ایک سگریٹ سلگایا اور کمال اطمینان سے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

لڑکی بدستور روتی رہی لیکن مرد کو اس کے رونے سے کوفت محسوس نہیں ہو رہی تھی کیونکہ اب وہ اس چیز کو قطعاً ہمدردانہ نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا۔

ایک معمولی لڑکی

۱

ایک جھلک — فضا میں جھلملاتی ہوئی تیز سرخ رنگ کی اوڑھنی کی صرف ایک جھلک لمحہ بھر کو دکھائی دی اور پھر وہ ... نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کیلاش نے بغیر کسی خیال کے ادھر دیکھا تھا۔ پہلے سیڑھیوں پر سے کسی کی دھم سے اترنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھایا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اترتا ہے اور پھر اس کا قیاس بھی صحیح ثابت ہوا۔

کھڑکی سے نگاہ ہٹا کر کیلاش نے گھڑی کی طرف دیکھا جس کی سیکنڈ والی لمبی سوئی اس تیزی سے حرکت کرتی دکھائی دے رہی تھی کہ اس پر نگاہ جم نہیں سکتی تھی۔ جونہی اس کی نظر سوئی پر پڑی۔ وہ لہراتی ہوئی رنگین اوڑھنی کے مانند آگے بڑھ گئی۔

یہ ادشا کا خاص انداز تھا۔ معاً شعلے کی لپک کی طرح دکھائی دیتی اور چشم زدن میں روپوش ہو جاتی۔ وہ اس سے پردہ نہیں کرتی تھی اور نہ اس سے ملنے میں کوئی چیز مانع تھی۔ یہ محض ایک انداز تھا۔ اس کی بے ضرری عادت تھی لیکن دفعتہً اس طرح اوجھل ہو جانے سے کسی قدر بے چینی بلکہ بعض اوقات بوکھلاہٹ کا اظہار ہوتا تھا۔

کیلاش کو اس کی یہ عادت قطعاً پسند نہ تھی۔ بلکہ چند مرتبہ اسے اس امر کا احساس ہوا تھا لیکن پھر اس نے خود ہی اپنے آپ کو ڈانٹا کہ آخر یہ کیا حرکت ہے۔ اس کی پسند یا ناپسند کا یہاں سوال ہی کب پیدا ہوتا تھا۔ ان سے ان کا کوئی رشتہ نہیں واسطہ نہیں تھا۔ محض والدین کے تعلقات تھے جن کی بنا پر وہ ان کے ہاں عارضی طور سے ٹھہرا ہوا تھا۔

اس کی نگاہیں قمیص کی تلاش میں تھیں۔ خیال آیا شاید سوٹ کیس میں ہو۔ سارا سوٹ کیس تہ و بالا کر ڈالا لیکن قمیص کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ حالانکہ اسے یاد تھا کہ اس نے اس ریٹ پر ایک قمیص لانڈری سے دھلوائی تھی اور اسے یہ بھی اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اس قمیص کو گھر پر لایا بھی تھا۔

اسے غصہ آنے لگا۔ کس قدر پھوہڑ ہیں اس گھر کی۔ انہیں اتنا ہوش بھی نہیں ہے کہ کسی کی چیزیں سنبھال کر قرینے سے رکھ دیا کریں۔۔۔ پھر اسے اپنے آپ پر تاؤ آنے لگا کہ آخر اسے اس بات کا کیا حق تھا کہ وہ گھر والوں سے ان چیزوں کی توقع رکھے۔ وہ اس کے غلام تو نہیں ہیں یا اس کا دیا تو نہیں کھاتے کہ چوبیسوں گھنٹے اس کے گرد منڈلاتے پھریں۔ نہ جانے میں اپنے آپ کو اتنی اہمیت کیوں دیتا ہوں۔ ایسے بھی لوگ ہو سکتے ہیں جو خواہ مخواہ اپنے آپ کو خاص ہستی سمجھنے

لگتے ہیں اور ہمیشہ اس امر کی توقع رکھتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی انہی کی باتیں سنتے رہیں۔ توبہ!

یہ سوچتے ہوئے اس نے تکان زدہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ فی الحقیقت کمرے کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی عظیم دیو چیختا چنگھاڑتا ادھر سے ہو کر گزرا ہو۔ چیزیں بے ترتیبی کی حالت میں بکھری پڑی تھیں۔ فرش پر نئے پرانے جوتے، ٹوٹے پھوٹے کھلونے، بوٹ پالش کی ڈبیاں، برش، چارپائیوں پر میلے کچیلے کپڑے، ازاربند، کھانے کے برتن، رسیوں پہ بے تحاشہ کریز کی پتلونیں، تڑی مڑی نکٹائیاں، چھتریاں اور بھنبھناتی ہوئی بے پناہ مکھیاں، کرسیوں پر اخبارات، رسالے، کتابیں، دواتیں، قلم ہولڈر، وغیرہ۔ گندگی پھیلانے میں اس کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا کیونکہ سامان کا بہت بڑا حصہ اس کی ملکیت تھا اور وہ وہاں اس بے تکے پن اور بے ڈھنگے پن سے رہ رہا تھا جیسے وہ اس کا اپنا مکان ہو، جیسے یہاں بھی اس کی ماں اور اپنی بہن موجود ہوں جو اپنے اکلوتے بیٹے یا اکلوتے بھائی کی ناز برداریوں ہی میں جٹی رہتی تھیں۔

اس نے دل ہی دل میں جھلا کر کہا کہ یہ سب کچھ درست ہی سہی لیکن سوال تو یہ ہے کہ اب میں کیا کروں۔ میں یہاں ملازمت کی تلاش میں آیا ہوں کوئی تفریح کی غرض سے نہیں آیا کہ اپنا گھر ہی میں بیٹھا رہوں۔ آخر قمیص کو گھر کی عورتوں میں سے ہی تو کہیں رکھا ہوگا۔ ان سے دریافت کون کرے۔ چچی (وہ شرما جی کی بیوی کو چچی اور شرما جی کو چچا کہا کرتا تھا) نہ جانے کہاں ہیں۔ بچے ناسمجھ ہیں اور جو بڑی ہیں وہ تو دوپٹہ اڑاتی گھوما کرتی ہیں۔ بات کرنے سے یوں جان بچاتی ہیں جیسے ہم ان کے کان ہی کتر لیں گے۔ نہ کام کی نہ کاج کی بس پیلے دھے کے لال دوپٹہ . . . .

کبھی گیت کا بول گنگنانے لگا۔

لال دوپٹہ لا دے موہے

لال دوپٹہ لا دے

اس اثنا میں اوشا بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے وہی لال چندریا اوڑھ رکھی تھی۔ کیلاش نے گھبرا کر نہ صرف گنگنانا بند کر دیا بلکہ اس بوکھلاہٹ میں وہ نئی قمیص کی بابت بھی کچھ نہ پوچھ سکا۔ اس وقت تو وہ جھینپ کر بغلیں جھانکنے لگا۔ جانے بیچاری اوشا نے دل میں کیا سمجھا ہوگا۔ افسوس تو یہ تھا کہ لال دوپٹہ اور وہ بیہودہ گیت اسے کیونکر یاد آ گیا اور اگر یاد آ ہی گیا تھا تو پھر اسے گانے کیا ضرورت آن پڑی تھی۔ مگر اوشا نے گیت سنا نہیں ہوگا۔ اس کے الفاظ اس نے صحیح تو نہیں سمجھے یا بھی ہو سکتا ہے اس نے بول سن لئے ہوں اور پھر کسی غلط فہمی سے تخت گھر والوں کو بتا دے تو اس کی شامت ہی آ جائے اور اگر اس کی تاتاجی کو چل جائے تو افوہ کس قدر شرمندگی اٹھانی پڑے۔ اسے کہتے ہیں گناہ بے لذت۔

ہندوستان میں عورت بھی عجیب مخلوق ہے اور یہ اوشا تو عجیب تر ہے۔ کوئی اس سے پوچھے کہ بھئی تم اس قدر اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہو۔ تکلف کا کون سا مقام ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ آپ صورت کے لحاظ سے نہ حور ہیں نہ پری۔ رنگ تقریباً یہی مائل گندمی ہے۔ آنکھیں اچھی ہیں۔ ناک تقریباً چپٹی ہے۔ ہونٹ شاید رسیلے ہوں لیکن بظاہر موٹے دکھائی دیتے ہیں۔ دانت منہ سے باہر تو نکلے ہوئے نہیں ہیں اور یوں سفید سفید دانتوں کی لڑی بڑی نہ سہی لیکن حجم میں بڑے ہی ہیں۔ ہاتھ پاؤں کی ساخت بھی نازک نہیں ہے۔ بال کسی حد تک گھنے لیکن لمبائی میں بہت کم ہیں۔ چوٹی

چوہیا کی دم کی طرح بھدے پن سے لٹکتی رہتی ہے . . . لیکن مجھے ان چیزوں سے کیا غرض۔ لعنت ہے گیت کے اس بول پہ۔ قمیص کا اتا پتہ دریافت کرنے کا سنہرا موقعہ ہاتھ سے جاتا رہا۔

اتنے میں چھوٹے بچے ریل گاڑی کا کھیل کھیلتے پیچھے سے ایک دوسرے کی قمیص پکڑے ہوئے لمبی بل کھاتی ہوئی قطار کی صورت میں اندر داخل ہوئے اور چھک چھک کرتے سیٹیاں بجاتے ادھر اُدھر کے چکر کاٹنے لگے۔ ایک آدھ بار کیلاش کے ارد گرد بھی گھومے۔ یوں تو ان کی گاڑی بہت جلد باہر چلی گئی لیکن انہوں نے اس کا رہا سہا موڈ بھی خراب کر دیا۔

محض اس کی خوش قسمتی تھی کہ اوشا تھوڑی دیر بعد پھر وہاں آنکلی۔ وہ اس کی جانب بہت کم دیکھتی تھی۔ ہمیشہ رُخ پھیر کر کھڑی ہو جاتی اور بات چیت میں تو اس نے کبھی پہل کی ہی نہیں تھی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو بات چیت ہی کب تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس نے کوئی بات پوچھ لی اور اس نے بمشکل تمام اس کا جواب دے دیا اور وہ بھی اس قدر مدھم آواز میں گویا کہ جیسے جان نکلی جا رہی ہو۔

اوشا ایک رسالے کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ آتے ہی اس کے قریب حسب معمول اس کی جانب پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو گئی اور پھر معاً مڑی تو کیلاش نے ہمت کر کے پوچھا۔ "میں نے کہا . . . میری ایک قمیص تھی . . . لانڈری سے لایا تھا . . . نہ جانے کہاں رکھ دی ہے میں نے . . . یا شاید . . . آپ نے دیکھا ہو کہیں . . ."

کیلاش کے کہتے کہتے میں وہ دروازے سے نصف باہر جا چکی تھی۔ پھر پلٹی اور پلنگ پر تہہ کی ہوئی رضائی کے نیچے سے قمیص نکال کر باہر رکھ دی۔ "یہ لیجئے" کیلاش

نے سوچا۔ اب یہ کسے معلوم تھا کہ قمیص رضائی کے نیچے بھی رکھی جاتی ہے۔
ادھر اوشا بھلاوے کی طرح باہر نکل جانے ہی کو تھی کہ کیلاش نے تلخیت آمیز
لہجے میں کہا۔ "اس کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں۔"
اس پر اوشا پھر کمرے کے ایک گوشے کی جانب لپکی۔ ادھر کیلاش نے قمیص
پہن لی اور ادھر اس نے سوئی تاگا لے کر اس کی جانب اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔
کیلاش بازو آگے بڑھاتا بڑھاتا رک گیا کیونکہ اتنے میں اوشا کی مدھم قدرے سہمی
ہوئی سی لیکن واضح آواز سنائی دی۔ "قمیص اتار دیجیے۔"
وہ جلدی میں قمیص پہن چکا تھا لیکن اسے یہ امید نہیں تھی کہ کلائی کے بٹن ٹانکنے
کے لیے اس کی قمیص پھر سے اتروائی جائے گی۔ خیر اس نے قمیص اتار کر اوشا
کی جانب بڑھا دی اور خود پلنگ پر نیم دراز ہو گیا اور گھٹنوں پہ ایک رسالہ کھول کر
رکھ لیا۔
اوشا اس سے بارہ کوس پرے کشادہ دروازے کے عین بیچ میں دہلیز پر بیٹھ کر
بٹن ٹانکنے لگی۔ اس کی جانب اس کی پیٹھ ہی تھی۔ پھر بھی وہ اس کے چہرے کا ایک
رخ دیکھ سکتا تھا لیکن اس نے دل ہی دل میں ناک بھوں چڑھائی "میرے جوتے سے
بھلا مجھے کیا پڑی ہے کہ میں شرمیلی جی کی جانب دیکھوں ہونھ" اسے یہ بات سوچ کر
سخت کوفت ہوتی تھی کہ ایک پنجابن لڑکی ہونے کے باوجود وہ اس قدر گھبرائی سی رہتی
تھی اور خواہ مخواہ دور بھاگتی تھی۔ سچ پوچھیے تو اس میں رکھا ہی کیا تھا۔ نہ کپڑے پہننے کا
سلیقہ نہ بال بنانے کا ڈھنگ نہ بات کرنے کی تمیز اور نہ کام کاج میں ہوشیار۔ یونہی
پھوہڑ کی پھوہڑ۔ اس کا بچپن زیادہ تر گاؤں ہی میں اپنی بوا کے ہاں گذرا تھا۔ کبھی کسی بات

کا ہوش تک نہیں تھا۔ اگر کچھ سوجھتا تھا تو بس یہ کہ بھاگ کر ادھر سے ادھر آ گئیں اور ادھر سے ادھر چلی گئیں۔ کچھ پوچھو تو اول تو چپ رہیں گی اور اگر بولیں گی بھی تو اس قدر مدھم اور باریک آواز میں کہ سننے والے کے پلے خاک بھی نہ پڑے۔ نہ معلوم یہ کہاں کی تہذیب اور کہاں کا تمدن تھا۔

تھوڑے تامل کے بعد اس نے دبی دبی نظروں سے پھر اوشا کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی نظر بازی کا حقیقت میں کوئی رومانٹک پس منظر نہیں تھا لیکن اوشا کا اس سے اس قدر کھنچ کھنچ کر رہنا خواہ مخواہ اسے اس امر پر غور کرنے کے لئے مجبور کر دیتا تھا۔

اوشا بٹن ٹانکنے میں محو تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت تھیں اور ان پر جھکے ہوئے لمبی لمبی پلکوں والے گندم گوں پپوٹے خاصے بھلے دکھائی دیتے تھے۔ اس کی عمر بمشکل پندرہ برس کے قریب ہوگی۔ ہونٹ دراصل موٹے نہیں تھے لیکن گوشت سے پُر تھے۔ ان کی رنگت سرخ نہ تھی لیکن ان پر پروان چڑھتی ہوئی جوانی کا عجیب سحر کن سلونا پن تھا۔ چہرہ گول تھا۔ رخساروں پر پکے ہوئے انگوروں کی سی کیفیت نظر آتی تھی۔ ناک کی بناوٹ آریائی نہیں تھی بلکہ اس کی ساخت کچھ منگول ٹائپ کی تھی لیکن قطعاً منگولی نہیں تھی۔ منہ کے دہانے کے دونوں گوشے بے حد حساس دکھائی دیتے تھے۔ نتھنوں کے نازک پردوں کی پھڑپھڑاہٹ اور سیاہ متجسس آنکھوں کی چمک سے کسی معصوم جنگلی جانور کا سا وحشیانہ پن ہویدا تھا۔ اس کی چکنی ٹھوڑی بالکل گول نہیں تھی بلکہ اس کے بیچوں بیچ نامعلوم سا گڑھا تھا۔ سب سے بری حالت اس کے بالوں کی تھی۔ اس وقت جب کہ اس کا سر تیزی سے سوئی چلاتی

ہوئی گندمی انگلیوں پر جھکا ہوا تھا تو اس کے خشک بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر آن گری تھی اور اس کے ابرو کو چوم رہی تھی۔ اس کے بال حقیقت میں گہرے بھورے رنگ کے تھے لیکن اس خشک لٹ کا رنگ، بوڑھے کی راکھ کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

کیلاش کی عمر چھبیس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ صفاچٹ آفتابی چہرے، تناسب خدوخال اور گورے رنگ کے باعث وہ خاصہ دلکش معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی ماں کی آنکھوں کا تارا اور بہنوں کا دلارا تھا۔ اس کے پتا ذرا سخت مزاج تھے۔ کہتے کہ ماں کے لاڈ نے اسے بگاڑ دیا ہے لیکن وہ باپ کی زد سے باہر ماں اور بہنوں کے جھرمٹ میں بڑے مزے سے زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ شادی پتاجی نے نہیں ہونے دی۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک یہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو جائے اس کی شادی نہیں ہوگی۔ پتاجی کی اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے کیلاش کو ایم۔ اے اور پھر جرنلزم پاس کرنے کے بعد نوکری تلاش کرنی پڑی۔ لاہور میں اس نے سرکاری ملازمت کے لئے درخواست دے رکھی تھی۔ اس سلسلے میں وہ یہاں آیا تھا۔ ابھی اس نے زندگی میں نئی نئی ٹھوکریں کھانی شروع کی تھیں۔

کیلاش کے خیالات کا سلسلہ اوشا سے ہٹ کر کسی اور مسئلہ کی جانب چل نکلا تھا اور وہ قطعاً بھول چکا تھا کہ اس کے خیالات کا سلسلہ دراصل کہاں سے شروع ہوا تھا۔ اتنے میں بلی کی میاؤں کی سی آواز سنائی دی اور اسے احساس ہوا کہ اوشا قمیص آگے بڑھا کر کہہ رہی ہے۔ "لیجئے۔۔۔۔"

پھر چشم زدن میں اوشا پرے جا چکی تھی۔ کیلاش نے اس کے اس پھرتیلے پن

سے مرعوب ہو کر ہکلاتے ہوئے کہا
"ت . . . ت . . . تکلیف تو آپ کو ہوگی گنگن اگر آپ کو معلوم ہو کہ میرے
بوٹ کہاں . . ."
"اوہ" ہلکی سی آواز آئی "وہ تو گلہری پکڑنے والے ٹوکرے کے نیچے رکھے ہیں"
گلہری پکڑنے کا ٹوکرا ——!
ہاں وہ لوگ گلہریاں بھی پکڑا کرتے تھے۔ ایک ٹوکرے کے ذریعے سے لیکن اس
نے اس کی تفصیلات معلوم کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی تھی — کیونکہ ابھی وہ
ملازمت نامی گلہری کا پیچھا کر رہا تھا۔
گلہری پکڑنے کے ٹوکرے کے تلے پڑے پڑے اس کے بوٹوں کی حالت بھی
خراب ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا بغیر پالش کے کام نہیں چلے گا۔ ایک بار پھر اس نے
نگاہیں زدہ نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں لیکن خوش قسمتی سے پالش کرنے کا کل سامان اسے
فوراً نظر آ گیا اور وہ ایک اینٹ پر اطمینان سے بیٹھ کر پالش کرنے لگا۔ وہ خوش
تھا کہ ایسے اوشا کی مدد کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔
اوشا کی روانگی کے چند منٹ بعد اس کے پتاجی آ گئے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اوشا
اس وقت تک وہاں سے جا چکی تھی۔ شرماجی پرانے خیالات کے انسان تھے۔ سردست
وہ لیٹر بکس کے ساتھ داؤ پیچ لڑا رہے تھے۔
ایک نہایت گھٹیا مکروہ اور بھدا ٹین کا بنا ہوا لیٹر بکس ان کے دروازے کے آگے
لٹک رہا تھا۔ اسے اوشا کے پتاجی کے سوا گھر کا کوئی اور فرد ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ لیٹر بکس
کو چھوٹا سا تالا لگا ہوا تھا جابی بارھوں مہینے گم رہتی تھی چنانچہ شرماجی پیتر ے بدل بدل کر

لیٹر بکس کو گھما کر نیچے کا حصہ اُلٹ کر اوپر لے جاتے اور پھر اس کے مُنہ میں انگلیاں ڈال ڈال کر بہ ہزار خرابی چٹھیاں باہر نکالنے میں کامیابی حاصل کرتے تھے۔

لیٹر بکس سے نپٹ کر شرما جی ہانپتے کانپتے مکان کے اندر داخل ہوئے۔

بظاہر شرما جی کی صورت بڑی مردانہ تھی۔ صورت اچھی نہ سہی لیکن مردانہ تیور، مضبوط ہاتھ پاؤں، لمبی لٹکتی ہوئی گھنی مونچھیں، چھوٹی لیکن چمکدار آنکھیں، آواز گرجدار اور بارعب — جسم پولا تھا تو کیا۔ ہنستے تو سننے والے کی جان ہوا ہو جاتی۔ ایک جانب دبدبے کا یہ عالم تھا تو دوسری طرف خوش مزاجی کی یہ کیفیت کہ بات بات پر مُنہ سے پھول جھڑتے تھے۔

پتی دیو کے آنے کی آواز سن کر مریل سی شریمتی جی بھی مکھیاں اڑاتی کسی گوشے سے شکستہ قدموں سے بڑھتی دکھائی دیں۔ آپ عجیب نحوست کا پلندہ واقع ہوئی تھیں۔ کھانا پکانے سینے پرونے اور گھر کے دیگر کاموں میں تو اچھی تھیں لیکن شرما جی کے برعکس عجیب مریل اور اڑیل ٹٹو دکھائی دیتی تھیں۔ ہنسی کھیل اور گانے بجانے سے دلی بیر تھا انہیں۔ خشک مزاجی کا حال یہ تھا کہ دنوں کیا ہفتوں بغیر مسکرائے ہی گذر جاتے۔ کبھی کسی پورنماشی کی رات کو مسکرا دیں تو خیر۔

بیوی کے بھدے پن سے لٹکتے ہوئے ڈھیلے ڈھالے ہونٹ اور کاہلی سے ادھ کھلی شکستہ آنکھوں کو دیکھ کر پتی دیو للکار کر بولے "اجی کہو! خیریت تو ہے؟"

قدرے تامل کے بعد شریمتی جی نے فرمایا "خیریت ہی ہے۔ کیوں آپ کو کیا دکھائی دیتا ہے؟"

شرما جی نے چوٹ کی "اور تو سب کچھ ٹھیک دکھائی دیتا ہے لیکن تم تو یوں چلی آ رہی ہو جیسے کڑکتی گرمی میں پیاسی گیدڑی پانی پینے کے لئے بھٹ سے باہر نکلتی ہے"

اس پر شرمیتی نے خشک ہاتھ کے بھدے سے اشارے سے شوہر کو کیلاش کی موجودگی کا احساس دلایا۔ ادھر یہ بات سن کر کیلاش کی باچھوں سے ہنسی نکلنے سے بال بال رہ گئی۔

کیلاش کی موجودگی کا پتہ چلتے ہی شرما جی اس کی جانب بڑھتے اور حسبِ معمول بنسمکھ لہجے میں بولے "ارے کہو بیٹا! کیا کر رہے ہو؟"

"جی پالش کر رہا ہوں"

"واہ وا . . . واہ وا . . . دیکھو کیسا پیارا بیٹا ہے۔ اپنے بوٹ تک خود پالش کرتا ہے . . . بیٹا! یہ بڑی اچھی عادت ہے۔ اپنے کام آپ کرنے والا انسان بڑا خوش رہتا ہے۔ جب ہم چھوٹے ہوتے تھے تو اپنے کپڑے تک خود دھویا کرتے تھے . . ."

وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر چارپائی پہ بیٹھ گئے اور اپنے بوجھ تلے چرچراتی ہوئی چارپائی کی حالت سے بے خبر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے "نہ جانے آج کل کے چھوکروں کو کیا ہو گیا ہے۔ پڑھتے ہیں چوتھے یا پانچویں درجے میں اور ٹھاٹھ ہوتا ہے رئیسوں ایسا۔ بھلا سوچو کہ ہم بھی اسی میں پڑھتے تھے لیکن سادگی کا یہ حال کہ تن پہ قمیص اور دھوتی اور پاؤں میں کھڑاؤں . . ."

باتیں کرنے میں شرما جی بیدھڑک بولے جاتے تھے۔ بیچارا کیلاش ان کی اکتا دینے والی

گفتگو کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے جان چھڑانے کے لئے شرما جی کی باتوں کی بوچھار میں جلد جلد بوٹ پالش کئے اور پھر پھرتی سے کپڑے پہننے لگا۔

نہ جانے شرما جی کی باتوں کا سلسلہ کہاں سے کہاں جا پہنچتا۔ اگر شریمتی جی ٹوک نہ دیتیں "میں کہتی ہوں باتوں سے چھٹی تو ہیں آپ، کہیں کوئی کام بھی کر ڈالا کریں۔"

"کیا کام؟"

"یہ ہاتھ میں چٹھیاں لئے ہوئے ہو ذرا بتاؤ تو سہی کہ کہاں کہاں سے آئی ہیں یہ۔ میری ممتا آں کی بھی کوئی چٹھی ہے ان میں۔ جب سے بیماری کو روگ لگا ہے بڑی دکھی رہتا ہے میرا دل۔"

شرما جی نے چونک کر خطوط کو دیکھنا شروع کیا۔ "ہاں بھئی ہے تو ممتا آں کی چٹھی ایک۔"

ممتا آں، اوشا کی شادی شدہ بڑی بہن کا نام تھا۔

"اجی تو کھول ذرا پڑھ کے سنا دو نا۔"

شرما جی نے گلا صاف کر کے بڑے اہتمام سے چٹھی پڑھنا شروع کر دی۔ چٹھی کی آواز سن کر بچے بھی آن اکٹھا ہوئے۔ یہ ماتا کی کرپا ہے ان کے بچوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ اوشا سے بڑی ممتا آں اور ایک شادی شدہ بھائی۔ اور اس سے چھوٹی دو بہنیں اور تین بھائی۔ اور شاید دو بچے مر بھی چکے تھے —— بچوں کے ہجوم میں شرما جی بوکھلا گئے اور "ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ ارے" کا شور مچانے لگے۔

"پتا جی، پتا جی، کہاں سے آئی ہے یہ چٹھی؟"

"ارے بھئی تم لوگوں کی بہن کی چٹھی ہے۔"

"کب آئے گی؟"

"معلوم نہیں... اس بیماری کو پھر دورے پڑنے لگے ہیں۔"

"دادی ماں!" شرمیلی جی بے اختیار بول اٹھیں۔

"دادی ماں کیا!" شرما جی نے نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "اس نے تمہیں چند دنوں کے لئے بلایا ہے۔ چلی جاؤ نا۔ تمہارے بن مر جائے گی بیچاری کی۔"

"ہائے کیسے جاؤں گھر کے دھندے چھوڑ کر... پر جانا ہی پڑے گا..."

کیا غضب کی پھرتی ہے میکا تھا اس سے اس طرح ہنگامے میں سے نکل جاتے ہیں بی خیریت تھی۔

۳

شام ہو رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں دکھنے لگی تھیں لیکن وہ دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی بنچ پر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ چیز اسی کے استعمال کی چیز تھی۔ چنانچہ اس نے تکان زدہ انداز میں ایک پاؤں اٹھا کر بنچ پر رکھ دیا اور رومال سے گردن پر چپکتی ہوئی پسینے کی ننھی ننھی بوندوں کو صاف کرنے لگا۔

شروع اپریل کے دن تھے۔ رات کو انسان مکان کے اندر سو سکتا تھا لیکن محض ایک سوتی چادر اوڑھ کر۔ اور دن کو تو خاصی گرمی پڑنے لگی تھی۔ اگر مکان کے اندر بیٹھے رہنا ہو تو غنیمت، ورنہ دھوپ میں لاہور کی سڑکوں پر گھومنا نہایت خوشگوار کام تھا۔

موسم سے قطع نظر یوں بھی وہ دو مہینہ کی آوارہ گردی سے گھبرا اٹھا تھا۔ اس نے

دو تین جگہ غرضی دے رکھی تھی، شاید کہیں مقدر لڑ جائے۔ انگریز کی حکومت تھی بغیر سفارش اور رسوخ کے کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں متعدد بڑے آدمیوں کی کوٹھیوں کا طواف کر چکا تھا۔ والد صاحب کے دوستوں کی سفارشی چٹھیاں لے کر در در کی خاک چھانتا پھرا لیکن اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونے ہی میں نہیں آتا تھا اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔

آج بھی وہ اسی سلسلے میں ساہنی صاحب سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ رات وہ اچھی طرح سے سو نہیں سکا تھا .... صبح خوب اچھی طرح بیست نہا دھو کر اس نے اجلے کپڑے زیب تن کئے۔ ڈرائی کلین کروائی ہوئی فلانیل کی پتلون پہنی، ٹائی کی گرہ احتیاط سے ناٹ لگائی اور بس کے بجائے تانگے پر مسٹر ساہنی کی کوٹھی پر پہنچا۔

مسٹر ساہنی فنانس میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اس کے والد صاحب نے بتایا تھا کہ صاحب موصوف کسی زمانے میں ان کے بڑے گہرے دوستوں میں سے تھے اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ برخوردار کی آسائش کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب اسے اندر بلایا گیا تو دیکھا کہ حضرت ایک چوکی پر بیٹھے ہیں۔ حجامت کا سامان قریب دھرا ہے اور خود نہایت میلی کچیلی دھوتی اور بنیان میں ملبوس دو سکھ دوستوں سے بات چیت میں محو ہیں۔ جب وہ پہنچا۔ تو انہوں نے سرسری نظر سے اس کی جانب دیکھا رسمی طور پر دو ایک فقرے پوچھے تھے اور پھر فوراً اپنے دوستوں کی جانب متوجہ ہو گئے۔

وقت گزرنے لگا۔ ان کی باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ ساہنی صاحب

شیو کئے جا رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ ایک شریف آدمی جو بطورِ خاص صبح کے وقت ان کے ہاں گیا ہے تو کم از کم اس سے اس کے آنے کی وجہ دریافت کر لی جائے۔

کہیں پون گھنٹے کے بعد وہ اصحاب خدا خدا کر کے رخصت ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد ساہنی صاحب بولے "اچھا بیٹھو میں اشنان کر لوں ذرا"

اشنان کر کے آئے تو معلوم ہوا کہ وقت بہت کم ہے۔ انہیں جلد دفتر پہنچنا ہے اور اس سے پیشتر کھانا بھی کھانا ہے۔ اس عجلت میں ساہنی جی نے خشک لہجے میں دریافت کیا "کہو بھئی کیسے آنا ہوا۔۔۔"

اس افراتفری میں کیلاش نے بے کم وکاست اپنے حالات بیان کئے اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ساہنی صاحب کا دھیان اس کی باتوں میں نہیں ہے۔ بالآخر بول اٹھے "بھئی تم کبھو میرے دفتر میں آؤ۔۔۔ آج تو اہم میٹنگ ہے۔ کل بھی مجھے فرصت نہیں ہوگی۔۔۔"

"پرسوں حاضر ہو جاؤں؟" کیلاش نے جلدی سے پوچھ لیا۔ تھوڑے تامل کے بعد زور سے سر ہلا کر بولے "اچھا ہاں۔۔۔ پرسوں آؤ۔۔۔"

"کے بجے؟"

"یہی دس بجے۔۔۔ اوہ سوری آئی مین ساڑھے گیارہ بجے کے قریب آنا"

گفتگو ختم ہو گئی۔ کچھ دیر کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔ کیلاش کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر ساہنی صاحب نے کہا "کوئی فکر کی بات نہیں۔ میں کسی نہ کسی سے کہہ دوں گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔"

حسبِ وعدہ وہ ساہنی صاحب کے دفتر پہنچ کر ان کے کمرے کے دروازے کے آگے چہل قدمی کر رہا تھا۔ پہلے تو ساہنی صاحب اپنے کمرے سے غائب تھے۔ آدھ گھنٹے بعد آئے تو شاید اسے پہچانا نہیں یا بے خیالی میں اس کے سلام کے جواب میں یونہی سر کو جنبش دے کر کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔

کیلاش چٹ پر اپنا نام لکھ کر پہلے ہی سے اندر بھیج چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ بلا ہی لیں گے۔ اسی ادھیڑ بن میں بیس منٹ اور گذر گئے۔

اب اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ کا کام ہو گا لیکن ایک گھنٹہ گذرنے کو تھا اور ابھی بات چیت کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر چپڑاسی سے ملتجیانہ انداز میں کہا "بھئی ذرا دیکھو... صاحب کو یاد دلا دو کہ ہم باہر کھڑے ہیں۔"

چپڑاسی کے جی میں نہ جانے کیا آئی۔ غالباً بابو جی پر رحم آ گیا اس نے صاحب کو اس کی چٹ دوبارہ دکھائی تو حکم ملا "آنے دو۔"

"صاحب بولتے ہیں آنے دو۔" چپڑاسی نے باہر آ کر کہا۔

اس پر کیلاش ایک مرتبہ پھر چوکنا ہو گیا۔ اس نے ایک نگاہ اپنے کپڑوں پر ڈالی اور اندر داخل ہو گیا۔

ساہنی جی نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تکان زدہ لہجے میں پوچھا "ہاں بھئی وہ کیا بات تھی؟"

یہ کہہ کر پیشانی کو دباتے ہوئے انہوں نے منہ پھیر لیا۔

کیلاش نے سارا قصہ دہرایا . . . ساہنی صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "یہ فائل دیکھ لوں چلتے ہیں۔" وہ چپ ہو گیا۔

بیس منٹ اور گذر گئے۔

اس دوران میں کیلاش کمرے کا جائزہ لیتا رہا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں مبادا ساہنی صاحب کی یکسوئی میں فرق آ جائے۔

دفعتہً ساہنی صاحب ہلے، اُٹھے اور دروازے کی جانب چل دیئے۔

کیلاش تذبذب میں تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے اتنے میں آواز سنائی دی۔

"آؤ!"

وہ فوراً اٹھ کر اُن کے پیچھے ہو لیا

اب وہ آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے اترتے گھومتے پھرتے آخر ایک کمرے کے آگے پہنچ کر رُک گئے۔ ساہنی صاحب اندر داخل ہو گئے اور وہ باہر کھڑا رہا۔ لمحہ بعد ساہنی صاحب نے باہر جھانک کر ہلکے تلخ لہجے میں کہا: "آؤ چلے آؤ!"

وہ ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

اندر ایک صاحب بڑی تمکنت سے کرسی پر تشریف فرما تھے۔ معمولی علیک سلیک ہوئی۔

ساہنی صاحب نے بغیر کسی تمہید کے خشک . لہجے میں کہنا شروع کیا "بھئی بھٹ یہ ہمارے دوست کے لڑکے ہیں۔ انہوں نے یہاں . . . کہاں بھئی؟"

"جی! ا— ـ ـ ـ اندر نہیں . . . "

"اے۔ آر میں اپلی کیشن دے رکھی ہے۔۔۔ ار۔۔۔ کیا جاب ہے"۔

"جی، اسکرپٹ رائٹر۔۔۔"

"اسکرپٹ رائٹر کی جاب کے لئے۔۔۔ ذرا تم خیال رکھنا۔۔"

مسٹر بھٹ کے چکنے چپڑے چہرے پہ زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ "اوبس بائی آل مینز۔۔۔"

جس بے دلی سے ساہنی صاحب نے سفارش کی تھی اور جس عجلت سے بھٹ صاحب نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کام ہونے کا نہیں۔

"کیا نام ہے آپ کا" بھٹ نے سوال کیا۔

"میرا نام کیلاش ناتھ کیانی ہے جی"

"کیلاش ناتھ کیانی۔۔" بھٹ صاحب کے منہ سے جلدی سے نکل گیا۔ اس قدر کی غلطی کی دونوں میں سے کسی کو امید نہیں تھی۔

"ایم سوری"۔۔۔ وہ دونوں مسکرائے۔ "اچھا تو میں نام نوٹ کئے لیتا ہوں" کہتے کہتے انہوں نے جیبی بک پر نام نوٹ کر لیا۔

ان سے رخصت ہو کر کیلاش دفتر سے باہر کی جانب لپکا تو وہ خوش تھا اس لئے نہیں کہ اسے کام مل جانے کی امید تھی بلکہ شاید اس لئے کہ ایک تو بھٹ کی غلطی کی وجہ سے تھوڑا ذرا سا کو اور ہو گئی تھی اور دوسرے زیادہ خوشی اسے اس امر کی تھی کہ آخر یہ جنجال بھی کٹ گیا۔ اب وہ آزاد تھا۔ جہاں جی چاہے جا سکتا تھا۔

پہلے تو وہ کھانا کھانا چاہتا تھا۔ بھوک کے مارے اس کا ناک میں دم تھا۔ یہ

دوسرے انگریزی فلم دیکھ کر سارے دن کی کوفت دور کرنا چاہتا تھا۔ اسے خیال آیا نہ جانے فلم کس وقت شروع ہوتا ہے۔ تازہ انگریزی اخبار اس کی بغل میں تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلے اطمینان سے کسی ہوٹل کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر کھانے کا آرڈر دے دوں۔

وہ ٹھنڈی سڑک کی دوکانوں کے آگے سے تیزی سے گزرتا چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً اسے اپنے کندھے پر دباؤ کا احساس ہوا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو ایک ناآشنا شخص کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔

اجنبی لمبے قد کا دبلا پتلا انسان تھا۔ اس کی پھیلی ہوئی مسکراہٹ کے باعث اس کی اونچی ناک کے گوشوں پر متعدد سلوٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے پتلے حساس ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کہو دوست! تم نے مجھے پہچانا نہیں شاید . . ."

کیلاش نے معذرت چاہی۔ "ایم سوری . . . آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں نوتن ہوں۔"

"نوتن . . ." کیلاش نے ذہن پر دباؤ ڈالا۔

"نوتن دی گریٹ۔" اجنبی نے پھر کہا۔

او ہو . . . بڑی مشکل سے یاد تازہ ہوئی۔ دونوں نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ جلدی میں دو چار باتیں ہوئیں۔ کیلاش نے پوچھا "بھئی میں نے تو سنا تھا کہ تم ولایت چلے گئے ہو . . ."

"یہ درست ہے ایک مدت تک میرا قیام انگلینڈ میں رہا اور کچھ عرصے کے لئے

امریکہ بھی گیا تھا۔ اب دو برس سے انڈیا میں ہوں۔"

"دو برس سے۔" کیلاش نے شکایت آمیز لہجے میں پوچھا "یعنی ۱۹۴۳ء سے۔"

"لیکن بھائی کیا کرتا۔ پرانے ساتھی تتر بتر ہو گئے تھے۔ کسی کا پتہ معلوم نہ تھا مجبوراً خاموش رہنا پڑا۔"

کیلاش نے اس کا عذر قبول کر لیا اور ایک مرتبہ پھر اس کا ہاتھ دبایا اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتا نوتن نے کہا "معاف کرنا بھئی اس وقت میں کام سے جا رہا ہوں لیکن اگر تمہیں فرصت ہو تو آج شام کو کہیں اکٹھا بیٹھیں۔ ایک جگ بیت گیا جب ہمارا تمہارا دن رات کا ساتھ تھا۔ بہت کچھ کہنا اور سننا ہے۔ . . ."

"شیور، شیور (SURE, SURE!) . . . اب بتاؤ کہاں ملو گے۔ بھئی گوشۂ تنہائی چاہیے یا کم از کم ایسی جگہ ضرور ہو جہاں غیر مداخلت نہ کر سکے۔"

"یہاں میری جان پہچان کے آدمی بہت کم ہیں۔ مجھے اس بات کا خدشہ نہیں ہے۔"

"یہی حال میرا ہے۔ میں خود نو وارد ہوں . . . اچھا تو وانگا سوٹ کرے گا؟"

"ضرور۔"

"ٹائم؟"

سے سکس (SAY SIX)

"او کے۔"

"آل رائٹ۔ وی میٹ اگین۔ چیریو۔"

"چیبرلیو"

دوست سے رخصت ہو کر کیلاش سیدھا اسٹینڈرڈ ہوٹل پہنچا۔ ہاتھ دھو کر باکس میں جا بیٹھا۔ مینو (MENU) پر نظر دوڑائی۔ بیرا آیا اور آرڈر دیا۔ "ایک ٹوماٹو سوپ گرلڈ چکن۔ امریکن سلاد۔ ون کوتا کافی۔ بالترتیب۔"

سب سے پہلے اس نے اخبار میں میٹنی شو شروع ہونے کا وقت دیکھا۔ تین بجنے میں ابھی پونے دو گھنٹے باقی تھے۔ وہ بڑے آرام سے ایک گھنٹے میں کھانا وانا کھا کر مزے مزے سے کافی پی کر بھی فلم شروع ہونے سے پندرہ منٹ پہلے سینما پہنچ سکتا تھا۔ وہ خوش تھا۔ نوتن سے ملاقات کا اس کے دل پر خوشگوار اثر ہوا تھا۔ مہینوں سے وہ اس نئے شہر میں بے یار و مددگار دھکے کھاتا پھر رہا تھا۔ کم از کم ایک دوست تو ملا۔ اس کے دل میں نوتن کی بابت کئی سوالات پیدا ہوئے۔ پھر اس نے سوچا کہ شام ہی کو ملاقات ہونے والی تھی اس لئے اس سلسلے میں پریشان ہونے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

دسویں جماعت تک ان دونوں کا ساتھ رہا تھا۔ نوتن پڑھائی کے معاملے میں پرلے درجے کا بے پروا لڑکا تھا۔ یوں بے حد ذہین مگر پڑھائی سے اس کی بے پروائی نقطۂ کمال تک پہنچ چکی تھی۔ وہ فیل کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن سارے استاد بڑے تاسف سے کہتے تھے کہ اس قدر ذہین لڑکا اگر اپنی پڑھائی کی جانب توجہ دے تو ریکارڈ قائم کرے۔ نوتن کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ اس کا ذہنِ رسا اور کئی اقسام کی الجھنوں میں گرفتار رہتا تھا۔ شرارت بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

جو لڑکے اس سے راہ و رسم بڑھاتے تھے وہ نیک اور اچھے نہیں سمجھے جاتے تھے۔

ادھر ان دونوں کی آپس میں راہ و رسم ہی نہیں تھی بلکہ اس قدر گہرا یارانہ تھا کہ ایک دن بھی آپس میں ملے بغیر گذر نے نہ پاتا۔ کیلاش کو گھر والوں نے ڈانٹا ڈپٹا لیکن اس نے ذتن کا ساتھ نہ چھوڑا۔

کھانا، کافی اور پھر پکچر —— ان سب چیزوں سے فارغ ہو کر کیلاش نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو چھ بجنے میں چالیس منٹ باقی تھے۔۔۔ کچھ وقت اس نے ادھر اُدھر گھوم کر گزارا۔ وقت مقررہ سے پندرہ منٹ پہلے وہ تنگ آکر نذالگا میں داخل ہو گیا۔ اس نے سوچا کچھ دیر وہاں بیٹھ کر ذتن کا انتظار کر لوں گا۔ لیکن اس کے تعجب کی کوئی حد ہی نہیں رہی۔ جب اس نے ذتن کو پہلے ہی سے منتظر پایا۔ حالانکہ وہ دل میں ڈر رہا تھا مبادا اس کا پرانا ساتھی کسی وجہ سے پہنچ ہی نہ سکے۔

ذتن کے صفاچٹ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ خوب کھلتی تھی۔ کیلاش بولا۔

"بھئی تمہیں پہلے ہی سے منتظر پا کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ مجھے اس خیال سے کوفت ہو رہی تھی کہ ابھی پندرہ منٹ تک اور تمہارا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"واہ دوست! اس برتے پر محبت کا دعوےٰ کرتے ہو۔ پندرہ منٹ کے انتظار کے خیال ہی سے گھبرا گئے۔ ایک ہم ہیں کہ جناب کا ایک مدت سے انتظار کر رہے ہیں۔"

کیلاش نے کرسی میں دھنستے ہوئے تعجب سے پوچھا "کیوں کب سے انتظار کر رہے تم میرا؟"

"اسی وقت سے۔"

"یو ڈونٹ مین اِٹ؟"

"یس آئی ڈو مین اٹ" (Yes I do mean it)

"تو بھی تم اسی وقت کہہ دیتے۔"

نوتن نے مسکرا کر سگریٹ جلایا اور ایک قیمتی سگریٹ کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "اس وقت تم بہت تیزی سے چلے جا رہے تھے۔ اس لئے میں نے تم پر زیادہ بار ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔"

"واہ وا ــــ بھئی مجھے بہت افسوس ہے اس بات کا۔ حالانکہ مجھے کوئی کام بھی نہیں تھا۔ بلکہ میں اس خیال سے چپ رہ گیا کہ شاید تمہیں کچھ ضروری کام ہے کیونکہ تم نے خود ہی . . . ."

"وہ سب کچھ تمہاری خاطر تھا مائی ڈیر . . . خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں نے ایک واقف کار کو پکڑ لیا تھا۔ کچھ دیر بیٹھے رہے پھر کھانا کھایا۔ وہ رخصت ہو گئے بعد میں نے اس میز پر بیٹھے وہ خطوط لکھ ڈالے . . . اب بھول جاؤ اس واقعہ کو . . . یہ بتاؤ کہ کیا کرتے ہو۔ لاہور میں کہاں اور کب سے قیام ہے؟"

"مائی ڈیر کام کوئی ہے نہیں جوتیاں چٹخاتا ہوں۔ یہاں عارضی طور سے والد صاحب کے ایک دوست کے ہاں قیام ہے میرا یعنی ہیڈ کوارٹر وہی ہے۔ البتہ یہ بھی میری عادت ہے کہ ہفتے میں تین چار دن اور رشتے داروں کے ہاں بھی گذار دیتا ہوں . . . وہ لوگ ماڈل ٹاؤن میں ہیں۔ اس لئے یہ میری بہترین جگہ ہے، اس گھر میں بجلی نہیں ہے۔ پانی کا نل نہیں ہے۔ جگہ تنگ ہے۔ لیکن کم از کم یہاں سے ہر دفتر قریب پڑتا ہے۔"

"کام کیا کرتے ہو؟"

"بھئی دو ایک جگہ درخواست دے رکھی ہے ملازمت کے لئے"۔

"تو یوں کہو ابھی تک گلچھرے اڑاتے رہے ہو"۔

"ارے ہماری تقدیر میں گلچھرے کہاں۔ گلچھرے تو تم اڑاتے ہو جو کبھی یورپ میں کبھی امریکہ میں"۔

"ہاں دوست مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے۔ میں نے اپنے آپ کو کئی مشکلات میں بھی ڈالا ہے۔ مزے بھی خوب اڑائے ہیں" —— لیکن چائے کا آرڈر دے دیں بھائی"۔

"چائے کا آرڈر تو دے دیا گیا ہے"۔

بعد ازاں بڑی دیر تک نوتن یورپ کے ممالک کے حالات اور اپنی دلچسپیوں کی داستانیں سناتا رہا۔ اس کے انداز بیان میں عجیب قسم کا ٹھہراؤ اور متانت تھی۔ کیلاش کو اس پر بے اختیار رشک آنے لگا۔

بالآخر نوتن نے کہا "بھئی ہم تو اپنا کچا چٹھا بیان کر چکے۔ اب تم کہو اسکول کے بعد تم کیا کچھ کرتے رہے"۔

کیلاش نے قدرے مسکین لہجے میں کہا "میاں ہمارے دن بھی کسی نہ کسی طرح کٹ ہی گئے۔ اوّل تو زندگی میں کوئی رنگین واقعہ پیش ہی نہیں آیا اور اگر کچھ ہوا بھی ہو تو تم ایسا اندازِ گفتگو کہاں سے لاؤں"۔

اس کے بعد کیلاش نے بھی اپنے حالات بیان کئے۔ باتوں باتوں میں کافی وقت گذر گیا۔ جب ان کی گفتگو آخری منزل پر پہنچی تو نوتن نے کہا "تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ بمبئی میں فلمی لائن سے گہری دلچسپی لے رہا ہوں۔ دو تین اچھی مالدار اسامیاں

میری مٹھی میں ہیں۔ "آزادی" ہمارا پہلا کھیل تھا لیکن فرنگی حکومت نے اسے بین (BAN) کر دیا۔ اس سے مالکوں کو لاکھوں کا نقصان پہنچا۔ غیروں کی غلامی بری بلا ہے۔ اس سے میری ساکھ کو بہت بڑا دھکا پہنچا تھا لیکن اب پھر سنبھل گیا ہوں۔ بھئی دیکھو اگر کوئی کام نہ ملے تو میرے پاس بمبئی آجانا جو بن پڑے گا سو کر دوں گا۔ یونہی اپنا دل میلا مت کرنا۔"

"شکریہ۔ تمہاری دعا بھی یہی ہونی چاہئے کہ یہیں کام بن جائے۔ ورنہ بمبئی کا رُخ کیا تو والد صاحب کہیں گے لونڈا بد معاش ہو گیا ہے جبھی فلموں میں چلا گیا ہے۔"

"خیر میں ہر وقت حاضر ہوں جب ضرورت ہو بلا تکلف لکھنا اور ہاں بھئی خط و کتابت جاری رہے گی نا۔"

"بے شک، بے شک۔"

اس کے بعد کیلاش دوست سے رخصت ہو کر گھر کی جانب چل دیا۔

چائے کے ساتھ بہت کچھ کھا لیا تھا اس لئے بھوک تھی نہیں۔ سوچا کہ جا کے چپکے سے سو رہیں۔

نوتن سے ملاقات کی خوشگوار یاد ذہن میں لئے وہ پیچ در پیچ نیم روشن گلیوں کو لمبے لمبے قدموں سے ناپنے لگا۔ اس وقت گلیوں میں خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ بڑے بوڑھوں کی ریل پیل کے علاوہ چھوٹے بچوں بچیوں نے عجب اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ محلے کے کٹکھنے کتوں سے کنی کتراتا ہوا چچا کے مکان کے آگے جا پہنچا۔

اندر داخل ہوا تو وہاں بھی بچوں نے ایک ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ صحن ایک تھا گھرانے تین چار۔ بعضوں نے وسیع صحن میں سونا شروع کر دیا اور بعض افراد ابھی کمروں

کے اندر ہی سوتے تھے۔ آثار سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی اس کا بستر نہیں بچھا ہوگا۔ کمرے میں خوب زور زور سے باتیں ہو رہی تھیں گویا محفل گرم تھی۔ کیلاش ذہنی اور جسمانی تکان محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ سر جھکائے وہ ایک الگ تھلگ چارپائی پر بیٹھ گیا جہاں دو تین گز ل کسے ہوئے بستر دھرے رہے تھے۔

پھر وہ کھڑکی کا ئیں کا ئیں سے بے پروا اٹھتا تے ہوئے چراغ کی مدھم روشنی میں چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔ معاً اسے کسی کی قربت کا احساس ہوا۔ نظر اٹھا کر دیکھا کہ اوشا ہاتھ میں گلاس لئے کھڑی ہے۔ "کیا ہے"۔ اس نے پوچھا۔

"چائے"۔

"چلئے — چائے تو میں آج بہت پی چکا ہوں۔ اب نہیں پیوں گا۔"

عجیب لہجے میں تھرتھراتی اور شیریں آواز آئی "تو میں یونہی اتنی دیر سے آپ کے انتظار میں چائے لئے بیٹھی ہوں۔"

"اوہ"۔ کیلاش کا ذہن قلابازی سی کھا گیا۔ اس نے چائے کا گلاس بے اختیار تھام لیا اور اچٹتی ہوئی ایک نظر اس پر ڈالی۔ مدھم روشنی میں اس نے اس کی آنکھوں میں عجیب وحشیانہ چمک دیکھی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ آنکھیں جھکا لیتی یا نگاہ پھیر لیتی اس نے خود نظریں جھکا لیں۔

۳

چائے کا گلاس کیلاش کے ہاتھ میں تھا لیکن اس کے ذہن میں ایک طوفان برپا ہو چکا تھا۔

وہ خاصہ قبول صورت جوان تھا اس لئے لڑکیوں کے معاملے میں بدقسمت واقع
نہیں ہوا تھا لیکن اوشا کا حملہ اس قدر اچانک اور خلافِ امید تھا کہ ایک لمحہ کے لئے
اسے زمین اپنے پاؤں تلے سے سرکتی محسوس ہوئی۔

اس نے گھونٹ در گھونٹ چائے پینی شروع کی اور اس کا ذہن سارے
واقعات کا جائزہ لینے لگا۔

پہلے پہل باوجود کوشش کے وہ کچھ نہیں سوچ سکا۔ اوشا کی مترنم آواز کی جھنکار
سے اس کے ذہن کا ایوان ایک بار جو گونجا تو بہت دیر تک گونجتا رہا۔

اوشا نے کس ڈرامائی انداز میں یہ نئی کروٹ بدلی تھی۔

وہ تنہائی پسند اس سے ہمیشہ آنکھ چرانے اور کنی کترانے والی سیدھی سادی
معصوم لڑکی کیا اس کی محبت میں گرفتار تھی؟ لیکن اس کی صورت سے کچھ ایسی بات
نہیں تھی اور اسے کبھی خواب میں بھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ کبھی اس لڑکی سے بھی
محبت کر سکتا ہے یا وہ لڑکی سپنے میں بھی اس کی محبت کا دم بھر سکتی ہے۔ اس کا سبب
یہ نہیں تھا کہ وہ اس سے نفرت کرتا تھا بلکہ اس سے محبت کرنا وہ اس قدر بعید از قیاس
سمجھتا تھا کہ اس قسم کا سوال پیدا ہوتے ہی اس کے ذہن میں بہت سی پیچیدہ الجھنیں
پیدا ہونے لگتیں۔

کتنی عجیب بات تھی۔ کہاں تو اس کے سائے سے دور بھاگتا۔ یونہی بے جا
حد تک شرماتا۔ اس سے ہمیشہ پرے پرے رہتا اور پھر کہاں اک دم اس قدر
قربت، یگانگت، ایثار اور محبت کا اظہار۔

چائے پی چکنے کے بعد وہ کچھ نیم دراز ہو گیا اور باوجود کافی غور و خوض کے وہ

مکمل طور پر اس چیز کا احساس ہی نہیں کر سکا کہ آخر اسے ہؤا کیا ہے۔ کسی لڑکی کی آواز میں اتنا ترنم، ایسا جادو، ایسی لرزش، اتنی کشش، اس قدر لوچ، ایسی ملائمت، ایسی شیرینی اور رس بھی ہو سکتا ہے۔ اسے اس بات کا پہلے کوئی علم نہیں تھا۔

وہ اس سے اس قدر پرے رہتی تھی، یہ بجائے خود عجیب بات تھی لیکن اب اس کا اس سے اس قدر تیز و تند محبت پہ آمادہ ہونا عجیب بات تو تھی ہی۔

اس قسم کی اٹکل پچو اور بے سر و پا باتیں ذہن میں آنے کے بعد معاً اس کے ذہن کے افق میں ایک نامعلوم سا خلا پیدا ہو گیا جیسے اتھلے پانی کے تالاب میں بھاری بھرکم چٹان کے گرنے سے پانی دفعتہً چھٹ جائے۔ اب یہ خلا کیونکر اور کس شے سے پُر ہو سکے گا۔ اس خیال نے اس کی روح پر نامعلوم سی پریشانی اور جھنجھلاہٹ کا سرمئی بادل منڈلانے لگا۔

وہ اپنے گوشۂ تنہائی میں زیادہ دیر تک بیٹھا نہ رہ سکا۔ اس نے بغیر ادھر ادھر دیکھے اور بنا یہ خیال کئے کہ اوشا کہاں ہے کدھر ہے۔ اس وقت اس کی صورت کیسی دکھائی دیتی ہے۔ وہ کیا کر رہی ہے — وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر والے کمرے کی جانب بڑھا جہاں سب لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

شرما جی نے اسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "ہلو بیٹا آ گئے، بڑی دیر لگا دی، تم نے، بیٹا جلدی آیا کرو تم۔ دیکھو تمہارے بغیر گھر میں تو بہت بے رونقی رہتی ہے۔"

کیلاش نے قدرے شرما کر جواب دیا۔ "جی ایک ... ر لانے دور ... کر ... نہ ...

انتظار سے بات چیت کرنے میں دیر ہو گئی — پول بھی ہیں ... ہیں ... سے ... ب ...

صحن میں بیٹھا تھا"۔

"صحن میں۔ ارے کیوں نہ۔ واہ جی واہ ہم تو تمہیں یاد کر رہے تھے۔ تمہاری چچی کہہ رہی تھیں کہ کیلاش بیٹا نہیں آیا ابھی تک —— اور تم آگئے۔ بڑی عمر پاؤ گے بیٹا"۔

"تھکا ہوا تھا سوچا تھوڑی دیر آرام کر لوں"۔

"تو یوں کہو نیند آئی ہے —— (بیوی سے) بھئی بستر بچھا دو نا بچارے کو"۔

"جی نہیں نیند تو بالکل نہیں آئی۔ یونہی تکان سی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی میں آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کی باتیں سنوں گا"۔

"بڑے شوق سے بیٹھو۔ تمہارے پتاجی کا ذکر ہو رہا ہے۔ جانتے ہو تمہارے پتاجی کی اور ہماری کب کی دوستی ہے"؟

"مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں بہت پرانی ہے"۔

اب شرماجی نے ایک طویل قصہ چھیڑ دیا۔ جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا تبھی سے دونوں دوست تھے۔ دن میں دس بار لڑتے پھر بھی شام کو اکٹھا کھانا کھاتے تھے۔

اس دوران میں اوشا بعض کاموں کے سلسلے میں اس کمرے میں بھی آتی رہی لیکن اس نے سر اٹھا کر اس کی جانب نہیں دیکھا۔ وہ اس کے پھرتی سے اٹھتے ہوئے گندم گوں پاؤں کو دیکھتا رہا۔

آخر کار چچی بول اٹھیں "ذرا سنئے میں کیا کہتی ہوں۔ آپ نے چابی کے کھلونے کے مانند ایک مرتبہ باتیں کرنی شروع کر دیں تو بس کرنے ہی میں نہیں آتے"!

"ہاں بھئی کہو تم جو کسر باقی ہے وہ بھی کہہ ڈالو" شرماجی مونچھیں پھڑکا کر بیوی کے

گرد ہو گئے۔

"لو اب میں نے بگڑنے کی کیا بات کہہ ڈالی۔"

"خفا نہیں ہوں میں۔ یونہی بے پر کی مت اڑاؤ۔ کام کی بات کرو۔"

"میں یہی کہہ رہی تھی کہ ستراں کی چٹھی آئے بارہ دن بیت گئے ہیں۔ اب بتاؤ نا ہیں ہو آؤں وہاں سے۔"

اس اثنا میں کیلاش نے محسوس کیا کہ اوشا سب کام نپٹا کر اندر آگئی ہے۔ چند لمحوں تک وہ شر ماجی اور ان کی دھرم پتنی کی باتوں میں دلچسپی لیتا رہا۔ پھر اس نے رفتہ رفتہ نظریں اٹھائیں۔ بھائی بہنوں اور ماتا پتا سے پرے اوشا چپ کے تھرتھراتے ہوئے سائے تلے بیٹھی تھی۔ جب کیلاش کی نظر اس پر پڑی تو وہ سر نہوڑائے زمین کی جانب تک رہی تھی۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ کیلاش کی نظریں اس کے تعاقب میں بڑھی چلی آ رہی ہیں۔ چنانچہ اس نے پہلے ہی سے سر جھکا لیا۔

مدھم روشنی میں اس کے خدوخال بالکل صاف اور واضح طور سے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں خوش نما پپوٹوں تلے چھپی ہوئی تھیں — وہ نیچی نظریں فرش پر ٹیکے تھی اور سر کے بیچوں بیچ اس کی بڑی احتیاط سے نکالی ہوئی دودھیا مانگ چمک رہی تھی۔

۳

اب کیلاش کی زندگی کے لمحوں میں ہلکا سا گلابی رنگ گھل گیا تھا۔ دل کے تاروں

پر ہر دم کوئی انگلی پریم کی دُھن بجاتی رہتی تھی۔
اگر یہ صحیح ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے تو جس طرح عشق کا دعویٰ نہ ہونے پر بھی دل میں ایک سحر کُن خیال کروٹیں لیتا رہتا تھا۔ اس سے اوشا کی دلی کیفیت کی شدت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ یقیناً وہاں تو قیامت ہی برپا ہو چکی ہوگی۔

بظاہر اس طوفان کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اوشا کی چلت پھرت اور کام کاج کرنے کے پروگرام میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ پہلے کی سے انہماک کے ساتھ دن رات کام میں جٹی رہتی۔ اب بھی وہ اس کے سامنے سے اُسی تیزی کے ساتھ گذر جاتی تھی۔ اُس رات کی بات کے بعد اوشا نے اور کوئی حرکت ایسی نہیں کی کہ جس سے کوئی غیر معمولی بات ظاہر ہو۔ نظر بازی، ہنسی، مذاق، چھیڑ چھاڑ کا تو خیر سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
دوسرے دن تو کیلاش کو اوشا کے رویے سے یوں احساس ہوا جیسے رات کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ جیسے وہ سب کچھ محض خواب و خیال ہو لیکن نہیں۔ وہ اس تھرتھراتی ہوئی نقرئی اور شیریں آواز کو باقی آوازوں میں سے بخوبی پہچان سکتا تھا۔ اس آواز میں ایک انفرادیت تھی۔ اس میں ایک خاص اثر تھا۔ سحر تھا۔
رفتہ رفتہ کیلاش نے محسوس کیا کہ اوشا اس کے کاموں میں خاصی دلچسپی لینے لگی ہے۔ اس کی ضروریات کی ساری چیزیں قرینے سے پڑی رہتی تھیں۔ اس کے کوٹ، پتلونیں، پاجامے، بوٹ وغیرہ میں کوئی شے اِدھر اُدھر نہ ہونے پاتی تھی۔ اس کی قمیصیں دھوبی کے ہاں سے دھل کر آتیں تو فوراً ان کے ٹوٹے پھوٹے بٹنوں کے عوض

نئے بٹن ٹانک کر انہیں احتیاط سے سوٹ کیس میں تہ کرکے رکھ دیا جاتا۔ پتلونوں کو اس انداز سے ہینگر سے لٹکایا جاتا کہ دونوں تک ان کی کریز خراب ہونے نہ پاتی۔ یہاں تک کہ اس کے بوٹوں پر پالش تک کر دیا جاتا۔

رات کو جس روز وہ دیر سے آتا اس کا بستر سلیقے سے بچھا ہوتا تھا۔ چادر اور تکیے کا غلاف دونوں صاف اور اُجلے ہوتے تھے۔ اس کا رات کو پہننے کا پاجامہ اور قمیص بھی بستر پر موجود رہتے تھے۔ ہر چند اوشا براہِ راست اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھی لیکن شب و روز وہ اپنے آپ کو اس کی شخصیت سے گھرا پاتا تھا۔ اس کا سنورا ہوا ہر کام اوشا کی تصویر کو ذہن کے آئینے کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا تھا۔

ایک روز دوپہر کو جب گھر میں فراست کون تھا اور جی کسی پڑوسی کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ اوشا کسی کام سے اندر آئی اور حسبِ معمول اس کی جانب پشت کر کے کھڑی ہو گئی۔ اس کے بال اب ناگوں ایسی لمبی چوٹی میں گندھے ہوئے تھے اور چوٹی آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔

کیلاش کے جی میں آئی کہ آج ذرا اس سے گفتگو کی جائے۔ اس خیال سے وہ چارپائی سے اٹھا اور چپکے سے جوتوں میں پاؤں ڈالے ہی تھے کہ اوشا معاً گھبرا کر بگڑے کی طرح دروازے کی جانب بڑھی۔ کیلاش نے دیکھا کہ چڑیا پنجرے سے اڑنے کو ہے تو بلند آواز سے بول اٹھا ——

[illegible]

[illegible]

"اوشا تم میرے بہت کام کرتی ہو۔ میرے آرام کا کتنا خیال ہے تمہیں" کس نے
وہ پھر چپ رہی۔ [illegible]

"بولو نہ اوشا"۔ ۔ ۔ اس کی آواز میں منت تھی

قدرے سکوت کے بعد بہت دھیمی مہین اور شیریں آواز سنائی دی۔ "جی" [illegible]

کیلاش نے چاہا کہ اس کی انگلیوں کو چھو لے اس خیال سے وہ آگے بڑھا [illegible]
دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ان انگلیوں پر ہلکی سی حرکت کی لہر دوڑ گئی
کیلاش کی زبان گنگ تھی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ انگلیوں کو چھو لیتا، دفعتہً ہاتھ ہٹا
لیا گیا۔

آہٹ سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص صحن کی جانب سے آ رہا ہے۔ کیلاش کا
معمول تھا کہ دو تین راتیں چچا کے ہاں رہنے کے بعد چند راتیں ادھر ادھر کہیں اپنے
دوستوں یا دیگر دور کے عزیزوں کے یہاں بھی کاٹ لیا کرتا تھا۔

دوسرے روز نو بجے کے قریب جب وہ اس خیال سے باہر جانے لگا۔ تو
دیکھا اس وقت صحن خالی ہے اور اوشا صحن میں چارپائی پر بیٹھی ہے۔
اسکے قریب سے گزرتے ہوئے کر اس نے اپنے مخصوص نرم اور شیریں لہجے میں
پوچھا "کہاں جا رہے ہیں" یہ کہہ کر اچٹتی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور
پھر آنکھیں جھکا لیں۔

"وہی اپنے دورے پر" وہ ہنسا
"کیوں یہاں آپ کا جی نہیں لگتا؟"
اس وقت دونوں کی نظریں ملیں اور اوشا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کھنچتی ہوئی

اس کے منہ کے دہانے کے حساس گوشوں تک پہنچی اور ان مقامات کو بڑے دلفریب انداز سے متحرک کر دیا۔

وہ کچھ جواب دینے ہی کو تھا کہ سیڑھیوں سے کسی کے اُترنے کی آواز سنائی دی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ گلی میں سے اس نے گھوم کر صحن کی جانب نگاہ ڈالی تو دیکھا اوشا کی موٹی موٹی آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ مُنہ کا دہانہ غنچے کے مانند کھلا ہوا ہے اور اس میں سے خوش وضع سپید سپید دانت جھلک رہے ہیں۔

تمام دن اس کا ذہن کم سن اور معصوم اوشا کی کھلتی ہوئی کلی کے مانند مہکتا رہا۔ اور رات کے وقت جب وہ شہر سے دور کھلے آسمان تلے سونے کے لئے لیٹا تو جھلملاتے ہوئے روشن ستاروں میں سے جیسے آواز آتی سنائی دی "دنیا کی حسین ترین عورت وہ ہے جو تم سے اور محض تم سے محبت کرے۔"

۵

شرما جی کی دھرم پتنی اپنی بیٹی سمترا سے ملنے کے لئے دس پندرہ روز کے لئے لاہور سے باہر چلی گئی تھیں۔

اس روز کے بعد پھر اوشا کی زبان سے کوئی ایسی ویسی بات سننے میں نہیں آئی لیکن اس کے سیوا بھاؤ میں پہلے سے بھی زیادہ شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی شے قرینے سے رکھی ہوئی دیکھ کر کیلاش کو پس پردہ کام کرتے ہوئے ہاتھ کی بو آنے لگتی۔ اس نے بارہا اپنے دل کو ٹٹولا لیکن اس نے یہی نتیجہ نکالا کہ اسے اوشا سے عشق نہیں ہے۔ اسے اس کے جذبات کا احترام ضرور ہے، شاید اس سے

کسی حد تک لگاؤ بھی ہے۔ لیکن عشق، عشق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

یہ اس کی فہم اور فراست کا فیصلہ تھا لیکن اوشا کی یاد کسی نہ کسی صورت میں ہردم اس کے ذہن میں کروٹیں لیتی تھی۔

ایک دن اس نے سوچا کہ چچی بھی آج کل یہاں نہیں ہیں۔ اس لئے آج کا سارا دن گھر ہی پر گذارا جائے۔ معمول تو اس کا یہ تھا کہ وہ صبح کے ناشتے کے بعد گھر سے باہر چلا جاتا۔ دوپہر اور رات کا کھانا بھی بازار ہی میں کھاتا تاکہ شرما جی پر زیادہ بار نہ پڑے شاذ و نادر ہی وہ شرما جی کے ہاں کھانا کھاتا۔ البتہ چائے جب بھی ملتی وہ زیادہ انکار کئے بغیر پی لیتا۔

اپنے منصوبے کے مطابق وہ گھر پر رک گیا۔ شرما جی کے بغیر پوچھے ہی اس نے کہہ دیا کہ آج وہ رسالوں کے انبار میں سے چھانٹ چھانٹ کر کام کی چیزیں نکال لے گا۔ باقی ردی پھینک دے گا۔ شرما جی اسے اپنے بچوں کی طرح چاہتے تھے۔ انہیں اس کا مطلقاً خیال نہیں تھا کہ وہ گھر پہ رہے یا باہر پھرے۔

شرما جی کے دکان پر چلے جانے کے بعد بچے بھی اسکول کو سدھارے مگر اس کے باوجود وہاں تنہائی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ صحن کئی مکینوں کی مشترکہ ملکیت تھا۔

اپنا کام کرتے سمے کیلاش نے اوشا کے پاؤں کی آہٹ کی جانب کان لگائے رکھے لیکن وہ اس طرف نہیں آئی۔ نہ جانے کہاں اور کس کام میں محو تھی۔ اس طرح وہ تقریباً دو گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ اوشا کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ یہاں تک کہ اس کا کام بھی ختم ہو گیا اور اس کے ذہن میں الجھن پیدا ہونے لگی۔ عجب بیوقوف لڑکی ہے، اس روز کہتی

تھی کہ آپ باہر جاتے ہی کیوں ہیں۔ اب گھر پہ بیٹھا ہوں لیکن صورت تک نہیں دکھائی [illegible] آخر اس کی طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ آخر وہ اس کی خاطر خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کیوں کرے۔

[illegible] نے صحن میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد کپڑے پہننے لگا۔

[illegible] میں اوشا نہ جانے کیوں اس کا ارادہ بھانپ کر یا یونہی ادھر آئی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے ہمراہ اس کا آٹھ سالہ بھائی بھی تھا جو محلے کے اسکول سے ایک آدھ گھنٹہ پڑھنے کے بعد گھر بھاگ آتا تھا۔

[illegible] پندرہ منٹ اور گذر گئے، اس وقت تک کیلاش کے ذہن کی [illegible] تقریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ بڑی دیر تک اس کا دل اوشا کے پاؤں کی [illegible] سننے کے لئے چونک چونک پڑا لیکن معاً اسے خیال آیا کہ جب اسے اس معمولی لڑکی سے عشق بھی نہیں ہے تو پھر وہ اس قدر طویل انتظار کیوں کھینچے۔

اب مسلسل باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ باوجود اس بدمزگی کے وہ اوشا کی آواز کی رنگینی اور موسیقی کا قائل ہو چکا تھا۔ وہ اس نقرئی آواز کی کشش سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ آخر وہ دونوں کیا باتیں کر رہے تھے ——— ہنس ہنس کر اور چہک چہک کر۔

اسی اثنا میں اوشا کی سحر انگیز آواز نہایت واضح طور سے سنائی دی۔

"ارے منا۔ جاؤ پوچھو بھیا سے کہو کہ اس تیز دھوپ میں وہ کہاں جا رہے ہیں۔"

"ہونہہ" کیلاش کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ نہ منّا اس سے کچھ پوچھنے کے لئے آیا اور نہ آوازیں ہی اتنی بلند رہیں کہ وہ کچھ سن سکتا۔

اس کے دل میں آئی کہ وہ ان کے کمرے میں چلا جائے۔ لیکن کس حیلے سے کوئی کام نہیں تھا۔ یہاں تک کہ قمیض کے بٹن تک ٹنکے ہوئے تھے۔ معاً اسے شرارت سوجھی اس نے بلیڈ سے ایک بٹن اڑا دیا اور اندرونی برآمدے والے دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ دونوں ٹرنک کھولے بیٹھے تھے۔ نہ جانے کیا تلاش کر رہے تھے۔

"یہ بٹن ٹوٹ گیا ہے۔"

ادشا اسے دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی لیکن جلدی سے سنبھل کر اس نے سوئی میں تاگا ڈالا اور اس کی جانب بڑھی۔

"میرے خیال میں قمیص نہ اتاروں تو اچھا رہے گا۔ پتلون بھی پہن چکا ہوں۔"

ادشا کچھ نہیں بولی اور بٹن ٹانکنے لگی۔

اس کا چہرہ اس قدر قریب پا کر کیلاش کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا منا بھی قریب کھڑا تھا۔ اس نے چند آنے جیب سے نکالے اور منا کو برفی لانے کے لئے بازار بھیج دیا۔

اب دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے تھے۔ کیلاش کو ایک اطمینان یہ بھی تھا کہ دروازے کے آگے چق پڑی ہے۔ اس لئے ان پر اک دم کسی کی نظر پڑنے کا احتمال نہیں تھا لیکن وقت گذر رہا تھا۔ آخر وہ کیا بات کرے۔ دفعتہً اس کی نظر دیوار پہ ٹنگے ہوئے بڑے سے کاغذ پہ پڑی جس پہ دنیا کے مہاپرشوں کی چھوٹی چھوٹی تصویریں

بنی ہوئی تھیں۔ کیلاش نے مسکرا کر پوچھا "اوشا تم ان سب کے نام پڑھ سکتی ہو"
"جی نہیں نام اُردو میں لکھے ہیں مجھے زیادہ اردو نہیں آتی"
بٹن ٹنک چکا تھا اوشا تاگا توڑ کر سوئی پرے ہٹا چکی تھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ خود
پیچھے ہٹتی کیلاش نے اس کی جانب دیکھے بغیر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "میں
سناؤں پڑھ کر"
ذرا سے تامل کے بعد لرزتی ہوئی اور بے حد دھیمی آواز آئی "سنائیے"
کیلاش نے محسوس کیا کہ اوشا کا بدن اس کے جسم کو چھو رہا ہے اور اس کی پتلی اور
نرم کمر اس کے تنگ سے تنگ تر ہوتے ہوئے بازو کے حلقے میں بری طرح کپکپا رہی
ہے۔ پھر اس نے اوشا کے چہرے کی جانب نگاہ ڈالی۔ وہ ابھی تک تصویر کی طرف
بے معنی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ محسوس ہوتے ہی کہ کیلاش اس کی جانب دیکھنے کو
ہے اس نے سر نیچے جھکا لیا اور زمین کی جانب دیکھنے لگی۔
کیلاش نے انگلیوں کی مدد سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا
"اوشا" ۔۔ اس نے دلنواز محبوبہ کے سرد گال پر ہونٹ رکھ دیئے اور پھر اس نے
اس کے منہ کے دلکش دہانے کے حساس گوشے پر ہونٹ پیوست کر دیئے۔ وہ گوشے
اس وقت بھی ماہی بے آب کے مانند پھڑک رہے تھے۔
دفعتہً وہ دونوں تڑپ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے جیسے کوئی اوپر سے
آگیا ہو۔ کیلاش نے گھوم کر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ اس نے چق اٹھا کر احتیاط سے اِدھر
اُدھر نگاہ ڈالی ہر طرف مکمل سکون تھا۔
"کوئی نہیں" اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"نہ جانے اس میں کُل کتنی تصویریں ہوں گی۔ گن کر دیکھیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے پھر ادشا کو اپنی طرف کھینچا اور وہ بغیر کسی جھجک کے جس طرح اس نے چاہا اس کے بازوؤں کی گرفت میں چلی آئی۔ چند لمحوں تک یہی کیفیت رہی۔ کیلاش کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی کانپتی ہوئی ٹانگوں پر زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکے گا۔

اتنے میں دھماک سے باہر کا دروازہ کھلا اور منابہ فی لئے صحن میں داخل ہوا۔

۶

اس دن کے بعد دونوں کے مابین بے تکلفی زیادہ نہیں بڑھی۔ ادشا پہلے سے زیادہ خاموش ہوگئی۔ لیکن وہ اپنی صورت، بالوں کی آرائش اور لباس کی زیبائش سے بے پرواہ دکھائی نہیں دیتی تھی بلکہ اب وہ ان کی جانب زیادہ توجہ دینے لگی تھی بچاری کے پاس اچھے اچھے کپڑے نہیں تھے کیونکہ وہ بہت امیر نہیں تھے اور نہ ان کے ہاں کنواری لڑکیوں کا جسمانی آرائش کی طرف زیادہ دھیان دینا مناسب سمجھا جاتا تھا۔

ادشا بیباک بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اگر وہ تنہا کام کرتی ہوتی یا عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوتی اور اسے اچانک بیٹھے بٹھائے یہ پتہ چل جاتا کہ کیلاش اس کی جانب دیکھ رہا ہے تو وہ رُخ پھیر لیتی یا کسی عورت کی اوٹ میں ہو جاتی۔ اس کی ان حرکات سے کیلاش کو سخت کوفت ہوتی تھی۔ بعض اوقات اس کی رگِ حمیت پھڑک اٹھتی۔ آخر وہ ایسا ہیٹا نہیں تھا کہ نادان چھوکری اس قسم کے نخرے دکھلائے لیکن یہ بھی

ایک حقیقت تھی کہ جب کبھی اسے کسی چیز کی ضرورت یا تلاش ہوتی تو اوشا فوراً وہاں آن موجود ہوتی۔ کچھ فاصلے پر سر جھکا کر مجسمہ کے مانند کھڑی ہو جاتی، اور انتہائی محبت آمیز اور نرم لہجے میں پوچھتی "کیا چاہئے آپ کو؟"

کیلاش نے مختلف آسامیوں کے لیئے عرضیاں دے رکھی تھیں۔ شب و روز اس بات کا انتظار رہتا کہ کسی نہ کسی جانب سے انٹرویو کی چٹھی ہی آ جائے۔ آخر ایک دن اس کے دل کی مراد بر آئی۔ ایک آسامی کے انٹرویو کے لیئے اسے بلایا گیا تھا۔ اس نے یہ خبر گھر میں سب کو سنائی، حالانکہ یہ ایک معمولی بات تھی۔ آئے دن لوگوں کے انٹرویو ہوتے رہتے تھے۔ لیکن گھر کے لوگ بے حد خوش ہوئے۔ بالخصوص اوشا تو اتنی خوش تھی جیسے ملازمت ہی مل گئی ہو۔

کیلاش نے اسے دو تین مرتبہ کسی سے اس سلسلے میں یوں باتیں کرتے سنا جیسے بہت بڑا خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔

انٹرویو کے روز وہ جانے کے لیئے بالکل تیار تھا لیکن اس وقت کوئی بات یاد آ جاتی اور اسے رکنا پڑتا۔ اس کی چچی کہنے لگی "بیٹا! اب جاؤ بھی اوشا نہ جانے کب سے پانی کی بالٹی لیئے دروازے سے باہر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"وہ کیوں؟" کیلاش نے تعجب سے دریافت کیا۔

"نیک شگن ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ بھیا نکلیں گے تو میں پانی سے بھری ہوئی بالٹی لے کر آگے سے ملوں گی۔ اس طرح وہ امتحان (انٹرویو) میں پاس ہو جائیں گے۔"

سچ مچ اوشا باہر دروازے کے آگے دھوپ میں کھڑی تھی۔ اس کی ناک، لبوں کے اوپر اور پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

جب وہ اس کے قریب سے گذری تو اس نے جذبات سے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا "ادشا؟" اوشا نے آنکھیں نہیں اٹھائیں۔ البتہ ایک لمحہ کے لئے اس کے قدم رکے اور پھر وہ آگے بڑھ گئی۔

۷

لاہور آئے کیلاش کو چار مہینے گذر چکے تھے۔ اپنے گھر سے دور وہ مسافروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مانا کہ اس کے چچا چچی بہت نیک انسان تھے لیکن غیر کا گھر پھر غیر کا گھر ہوتا ہے۔ یہاں اپنے گھر کی سی بے تکلفی اور آرام کہاں۔

اس کا انٹرویو تسلی بخش ہوا تھا لیکن بیس کے قریب اشخاص کے انٹرویو لئے گئے تھے اور شاید ہزار سے اوپر عرضیاں آئی تھیں۔ اتنے امیدواروں میں صرف دو کا انتخاب ہونا تھا۔ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ نتیجہ کیا نکلے گا۔ باوجودیکہ کیلاش کا یہ خیال تھا کہ اس کا انٹرویو تسلی بخش تھا لیکن فی الحقیقت اسے اپنی کامیابی کی کوئی خاص امید نہیں تھی۔ مبلغ ساڑھے چار سو روپے کی یہ ملازمت ایسی آسان نہیں تھی کہ یونہی اس کے ہاتھ آ جاتی۔ نہ جانے لوگوں کے کیا کیا رسوخ ہوں۔ ایسے بڑے جوئے میں کامیابی اس قدر خوش آئند چیز تھی کہ کسی کو بھی اس بات کا قطعی طور پر یقین نہیں آ سکتا تھا۔

ہندوستان کے کونے کونے سے امیدوار انٹرویو میں شامل ہونے کے لئے آئے تھے۔ ان میں بڑی بڑی قابلیت کے لوگ بھی شامل تھے اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جن کا رسوخ بہت زیادہ تھا۔

اس انٹرویو میں شامل ہونے والے چند امیدوار لاہور ہی کے رہنے والے تھے۔ ان میں بعض پینتیس یا اس سے اوپر کی عمر کے بھی تھے لیکن زیادہ تر پینتیس سال سے کم عمر ہی کے تھے۔ وہ لوگ آپس میں اسکول کے لڑکوں کے سے جوش وخروش کے ساتھ باتیں کرتے تھے۔ انٹرویو لینے والوں اور ان کے سوالات پر زور شور سے تنقید یں کرتے۔ چائے پیتے اور گرما گرم بحثیں کرتے تھے۔

ان سب میں کیلاش کم گو انسان تھا۔ وہ ان سب کی باتیں انہماک سے سنتا لیکن اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ یوں محسوس کرتا جیسے وہ ان لوگوں میں شامل نہیں تھا۔ جیسے انٹرویو کے نتیجے سے وہ بخوبی باخبر ہو چکا تھا اسے معلوم تھا کہ اس کے لئے تو کوئی امید نہیں۔ پھر اس قدر جوش اور شوروغل کی کیا ضرورت ہے۔

حالانکہ اسے ان کی باتیں دلچسپ معلوم نہیں ہوتی تھیں لیکن وہ انہیں محض اس خیال سے دھیان لگا کر سنتا کہ شاید ان میں کوئی کام کی بات مل جائے۔ دن میں وہ سینما دیکھ لیتا یا عجائب گھر کی سیر کرتا یا چڑیا گھر میں گھوما کرتا لیکن ادھر شام ہوتی اور وہ کشاں کشاں رمبی ہوٹل جا پہنچتا۔ یہ سستا، چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ وہاں ہر روز کی کائیں کائیں سنائی دیتی۔

ایک روز معمول سے زیادہ شوروغل سنائی دیا۔ اس نے اندر قدم رکھا تو عجیب ہنگامہ نظر آیا۔ دو تین حضرات اس کی جانب دوڑے۔ سرخ بالوں والے ایک مسلمان نوجوان نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "کونگریچو لیشنز

Congratu-Lations

"آخر یہ مبارکباد کا کونسا مقام ہے بھئی" کیلاش نے دھڑکتے ہوئے دل سے پُوچھا۔

"تم دوسرے نمبر پر ہو"

کیلاش مطلب کو پا گیا لیکن اس نے وضاحت چاہی "یعنی"۔

"یعنی یہ کہ آپ کو ایک شاندار دعوت دینی ہو گی"۔

"ضرور ضرور لیکن ماجرا کیا ہے"۔

"تمہارا انتخاب ہو گیا ہے"۔ ایک اور صاحب نے جواب دیا۔

"لیکن یہ آفیشل خبر تو نہیں ہے"۔ کیلاش نے بے اختیار کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنا شروع کیا "یہ تو بھنگیخانے سے اڑائی ہوئی خبر معلوم ہوتی ہے"۔

"جی حضور آفیشل خبر بھی آجائے گی"۔

"یہ درجوں درجوں کو ڈالو بھاڑ میں' پہلے یہ کہو کہ خبر واقعی قابلِ اعتماد ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے"۔

"ہاں صاحب ہاں"۔

دوسرے روز اس کے نام دوپہر کے وقت رجسٹری چٹھی موصول ہوئی۔ اس کی پیشانی پر لکھا تھا: "اون ہز مجسٹیز سروس" یعنی سرکاری چٹھی تھی۔ کیلاش نے ادھر ادھر دیکھا۔ کسی کو قریب نہ پایا کمرے کے اندر گھس کر لرزتی ہوئی انگلیوں سے اس نے لفافہ چاک کیا۔ سچ مچ اسے چن لیا گیا تھا۔ کام کا چارج لینے کے لئے تاریخ بھی مقرر کر دی گئی تھی۔

پہلے تو مسرت کی ہلکی سی چیخ اس کے حلق سے نکل گئی۔ پھر دفعتہً سنجیدہ بن گیا۔ دوپہر

کا وقت تھا۔ سارے گھر پر نسبتاً خاموشی طاری تھی۔ اس نے جلد جلد اپنے گھر والوں
کو اس خوشخبری کی بابت ایک چٹھی لکھ کر کپڑے پہنے پھر دروازے سے باہر جھانک کر
دیکھا۔ اوشا کسی کام سے صحن سے گذر کر اندر والے برآمدے میں داخل ہو رہی تھی۔
نظروں سے نظریں ملیں تو کیلاش نے بڑے اشتیاق سے اسے اندر آنے کا
اشارہ کیا۔

اوشا نے ایک نظر اس کمرے کی جانب دیکھا جہاں اس کی ماں بیٹھی تھی لیکن پھر
کیلاش کی حکم عدولی کرنے سے بھی قاصر تھی۔ وہ بھاری قدموں سے اس کی جانب بڑھی
جونہی وہ اندر داخل ہوئی کیلاش نے اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور بڑی
گرمجوشی کے ساتھ اس کے لبوں میں لب پیوست کر دیئے اور پھر اسے حیران و ششدر
چھوڑ کر ہاتھ میں لفافہ پکڑے بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔

دن کا باقی حصہ اس نے بے مہار اونٹ کی طرح ادھر ادھر گھومنے میں گذارا۔
اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ چند ایسے لوگ بھی مل گئے
جن پر اس نے یہ راز بھی افشا کر دینا مناسب سمجھا۔ انہوں نے مسرت کا اظہار
کرتے ہوئے ہدیۂ مبارکباد پیش کیا۔ شام ہونے پر وہ گھر لوٹا۔

گھر میں حسب معمول خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ بچوں کے شور میں ملی جلی شرما جی
کی کراری آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

صحن کے ایک کونے میں برتن مانجھتی ہوئی اوشا ایک متحرک سائے کے مانند
دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اب اس سائے میں کتنے معنی پنہاں تھے۔

وہ سیدھا اس کمرے میں چلا گیا جہاں شرما جی بیوی بچوں میں بیٹھے اول جلول.

باتیں بنا رہے تھے۔ ناگاہ ان کی نظر کیلاش پر پڑی تو بولے "کہو بیٹا! آج تو بہت خوش نظر آتے ہو۔"

"مٹھائی کھلائیے تو بتاؤں۔"

"ارے مٹھائی بہت۔ ۔ ۔ کچھ کہو تو سہی۔"

کیلاش نے قدرے تامل کیا "جی مجھے ملازمت مل گئی ہے۔"

"واہ واہ، واہ وا۔ ۔ ۔ واہ بیٹا جیتے رہو۔"

"جیتے رہو پھلو پھولو" تائی جی کی آواز سنائی دی۔

اب تو بات چیت کا رخ ہی پلٹ گیا۔ بچے بھیا کے کندھوں پر کودنے لگے۔ مسلسل آدھ گھنٹے تک گرما گرم باتیں ہوتی رہیں۔ شرما جی بولے "اب بولو بیٹے! اب تو ہمارے پاس ہی رہو گے نا۔ تم بھی لاہور سے اکتا کر بھاگ جانے کی سوچا کرتے تھے۔"

"سچ مچ اب ہم اسے اپنے گھر سے نہیں جانے دیں گے۔"

"نہیں نہیں ہم نے آپ کو کافی ستایا ہے۔ ۔ ۔"

"ارے چھوڑو بابا بڑا آیا ستانے والا بھلا۔ بچوں کی بھی کبھی تکلیف ہوتی ہے بڑوں کو" شرما جی بولے اور پھر بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگے "ارے وہ پڑا والا کمرہ اسے خالی کر دیں نا۔ ہمارے لئے تو بیکار ہی ہے خواہ مخواہ گودام بنا رکھا ہے اس کا۔ تھوڑا بہت جو سامان ہے وہ دکان میں ٹھونس دیں گے جا کر۔"

"ہاں ہاں ـــ اسے ذرا بھی نہ بھاتی رہی۔ کچھ کر کے بھی تو دکھاؤ۔"

اب تو میاں بیوی کے مابین باقاعدہ تُو تُو میں میں شروع ہو گئی۔ اسی اثنا میں اوشا کو بھی اس خبر کا پتہ چل گیا۔ اس کا بالٹی بھر پانی لے کر آ گئے سے ملنے والا شگون نیک ثابت ہوا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا البتہ اس کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدموں سے رقص کی سی کیفیت عیاں تھی۔

۸

اوپر والے کمرے میں آتے ہوئے اسے سات آٹھ مہینے گذر چکے تھے۔

پختہ بنا ہوا یہ مختصر کمرہ خوب ہوادار اور روشن تھا۔ اس کے دفتر کا ماحول بھی پسندیدہ تھا۔ بڑی عزت اور آرام کا کام تھا۔ دفتر میں بھی الگ سجا سجایا کمرہ، برقی پنکھا، ٹیبل لیمپ، چپڑاسی اور آرام کے دیگر سامان موجود تھے۔

اب اوشا سے اس کے تعلقات بہت بڑھ گئے تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا دن گذرتا ہو جب وہ کسی نہ کسی حیلے سے اس کے کمرے میں تین چار بار نہ آتی ہو۔ پھر دیر تک بغل گیر ہوتے اور بوس و کنار میں محو رہتے۔

اس قسم کی باتیں بھلا کب تک چھپی رہتی ہیں۔ خواہ کسی نے ان دونوں کو مشکوک حالت میں کبھی نہیں دیکھا ہو لیکن اوشا کا ہر وقت اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے رکھنا اس کے میلے کچیلے کپڑے دھونا اور رات گئے شب تک اس کے کمرے کے پھیرے پر پھیرے کرنا ایسی باتیں تھیں، جن کی تاک میں پڑوسی ہر وقت لگے رہتے اور اب کچھ مدت سے اس قسم کی بھنک اوشا کے ماں باپ کے کانوں میں بھی پڑنے لگی تھی۔ والدین کو اس بات کا بالکل یقین نہیں آتا تھا تاہم ماں اوشا کو اس کے

کمرے میں آنے سے دبی دبی زبان میں ٹوکنے لگی۔ رونے لگی۔

قدرتی طور پر کیلاش کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ اس نے اوشا سے شادی کے امکانات پر غور کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں بہت سے امور قابلِ غور تھے۔ جہاں تک اوشا کا تعلق ہے وہ سانولے رنگ کی معمولی خدوخال کی لڑکی تھی ۔۔۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہ تھی مگر سینے پرونے یا کھانے پکانے میں اسے غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ یہ بات بھی عیاں تھی کہ اس کے ماں باپ جہیز میں بھی کچھ زیادہ نہیں دے سکیں گے مگر وہ خود اس بات کا خیال نہیں کرتا تو بھی اس کے ماں باپ تو جہیز کی رقم سے [illegible] کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بالخصوص اس صورت میں کہ ان کا اکلوتا لڑکا [illegible] اور بڑا افسر ہو اور وہ خود بھی مالدار ہوں۔

لڑکی والوں کی جانب سے بھی کچھ ایسی ہی باتیں تھیں۔ ایک تو وہ [illegible] کی مالی حالت سے بے خبر نہیں تھے، دوسرے وہ شعوری طور پر اپنی بیٹی کو بھی بعض پہلوؤں سے ایسے پتی کا اہل نہیں سمجھتے تھے، تیسرے ان کا خیال تھا کہ ان دونوں کی عمر میں بڑا تفاوت ہے۔ لڑکی پندرہ برس کی، لڑکا ستائیس کا۔ دونوں میں بارہ برس کا بُعد تھا۔ پانچ چھ برس کا فرق ہوتا تو خیر کوئی بات نہیں تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ دو ڈھائی برس پہلے اس نے یونہی ہنسی ہنسی میں کسی موقعہ پر ان دونوں کے رشتے کا کنایتہً ذکر کیا تو کیلاش کی ماں نے سنی ان سنی کر دی۔

خود اوشا ایک روز کیلاش کے کمرے میں آئی تو اس کی نازک کمر کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے کیلاش نے اس کے ہونٹ چوم لیے اور پھر وہ اس کی صورت کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو سمجھایا کرتا تھا کہ اوشا سے اس کا لگاؤ محض

منہ زبانی تھا۔ وہ دراصل خود اس کے حسن پر فریفتہ تھا اور اس کی ادا پر مر مٹا تھا۔ اس کی بات یہ کہ وہ شاعر تھا اور نہ اس کی کوئی ادبی شہرت تھی۔ یوں اگر اس کی شادی اوشا سے ہو جاتی تو شاید کسی کو کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا لیکن اوشا ان دنوں تو یقیناً نہیں تھی اور خود وہ بھی کوشش کر کے اس سے شادی رچا لیتا۔ کچھ عجب بات تو روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ وہ حسین سے حسین لڑکی سے شادی کر سکتا تھا۔ اب جبکہ اوشا کو ... شاید پتہ تھا۔ اس نے کہا: "اوشا مرد نہیں آیا؟"

اوشا نے اس کا مطلب سمجھنے کے لئے چہرہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تو وہ ... اس نے زور سے سمٹ کھینچا اور ... انہیں ڈھیلے چھوڑ دو ... اور ڈھیلے پڑ کر ... مسکراتے ہوئے دانتوں کی سفیدی دکھائی دینے لگی۔

اوشا نے آنکھیں بند کر لیں اور کیشا کے ہونٹ اس کے بھرے بھرے ہونٹوں میں دھنستے چلے گئے۔

پھر اس نے چہرہ ہٹا کر مدھم آواز میں پوچھا: "اوشا! آخر اس محبت کا انجام کیا ہوگا؟"

وہ چپ رہی۔

تھوڑے تامل کے بعد کیلاش نے بھاری آواز میں کہا: "اگر انہوں نے تمہاری شادی کہیں اور کر دی تو؟"

اوشا دوسری جانب دیکھنے لگی۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ چند لمحوں تک یہ اسرار خاموشی طاری رہی پھر کیلاش کے منہ سے آواز نکلی "میں!"

جواب میں اوشا نے بغیر کچھ کہے اس کے سینے پر سر رکھ دیا اور چپ چاپ غلا

یوں لگنے لگی جیسے کوئی سمجھ میں نہ آنے والی شے اس کی جانب بڑھ رہی ہو اور وہ
ایک ننھے معصوم اور کمزور بچے کے مانند بے دست و پا کھڑی ہو۔

اس قسم کے حالات اور کانا پھوسی اور تشا کے : والدین کے لئے تانی پریشان کن
تھی۔ وہ لاکھ یہ بھی سمجھتے تھے کہ دونوں کے مابین یونہی بے ضرر سی محبت ہے لیکن اگر
یہ بات کھل گئی تو ان کے اور ان کی لڑکی کے حق میں بہت برا ہوگا۔ لڑکی بدنام ہوگی
دوسری شادی بھی نہیں ہو سکے گی اور دنیا بھر کی طعن و تشنیع الگ۔ فی الحقیقت یہ
بات نہیں کہ صحن کے کمرے تک محدود تھی۔ وہ لوگ بھی آپس میں ہی کانا پھوسی
کرتے تھے لیکن چند بزرگوں نے مشورہ دیا کہ بات ہونٹوں چڑھی کوٹھوں چڑھی۔
بہتر یہی ہے کہ بیشتر اس کے کہ مفت میں بات کا بتنگڑ بنے لڑکی کی شادی
کر دی جائے۔

اب رشتے کے لئے بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ رشتوں کا معاملہ یہ ہے کہ ہونے
پر آئے تو چشم زدن میں بہت اچھے جوڑ مل جائیں ورنہ برسوں کام نہ بنے
لیکن جلدی کا کام شاذ و نادر ٹھیک ہوتا ہے۔

جوں جوں دن گذرتے جاتے والدین کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ اب تو وہ
اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ لڑکی کو کسی کے پلو میں دھکیل دیں۔ آخر ایک ایسا
شخص ملا جس کی دو بیویاں مر چکی تھیں۔ اس کی پہلی شادی بچپن میں ہوئی تھی اس کے
مرنے کے بعد اٹھارہ برس کی عمر میں دوسری شادی ہوئی دو برس بعد وہ بھی مر گئی۔
اب ایک سال سے نہایت ہی خالی ہاتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ
ان سے منگنی کر دی۔

ان مہاشے جی کی بابت جو کچھ کیلاش کو معلوم ہو سکا وہ یہ تھا کہ شکل و صورت کے لحاظ سے بس غنیمت ہی تھے لیکن یوں شادی کر لینے کے خواہش مند نہیں تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ محض ماں باپ کے زور دینے پر بار بار شادیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ ورنہ انہیں ان باتوں سے کبھی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

منگنی ہو چکی تھی بس اب یہ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو مہینے کے بعد شادی رچا دی جائے گی۔

دونوں کے والدین کو کچھ تسکین تو حاصل ہو گئی لیکن پوری طرح سے اطمینان کے لیے شادی کا ہو جانا بے حد لازمی تھا۔

۵

اکتوبر کا مہینہ تھا۔ اوشا کی شادی ہونے میں بس پچیس دن باقی رہ گئے تھے۔ کیلاش اوشا کی شادی سے کچھ ایسا مطمئن بھی نہیں تھا۔ اس کے دل میں بار بار اس بات کا خیال پیدا ہوتا تھا کہ نہ جانے اوشا کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ اس رشتے کو پسند کرتی ہے یا شاید وہ اس سے اتنی گہری محبت نہیں کرتی جتنی وہ کرتا ہے۔ اس پر وہ دل ہی دل میں بے اعتنائی سے کہتا: اگر اسے مجھ سے محبت نہیں ہے تو نہ سہی، میں کون سا اس پر جان دیتا ہوں۔ آخر اس میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔

اوشا تو خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف رہتی۔ اس کے موجودہ رویے سے کسی واقعہ کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہ اداس تھی نہ خوش۔ نہ بے قرار تھی

مطمئن۔ وہ حسبِ معمول اپنے کام کاج میں مصروف رہتی۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ ہر کام پر آمادہ تھی۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت پوری کرنے کا اسے بدرجۂ اتم خیال رہتا تھا۔ کیلاش اس کی اس گونگی محبت کا احساس کرتا تو اس کے دل کو نہ جانے کیا ہونے لگتا۔ اس نے بارہا اوشا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور پوچھا۔

"اوشا!"

وہ بغیر کچھ جواب دیئے دبے پاؤں اس کی پشت کی جانب چلی جاتی۔

"بولتی نہیں! میں تمہیں بلا رہا ہوں اوشا!"

وہ رک رک کر کہتا "کیا تم ... میرا مطلب ہے .. یعنی کہ تم ... تم اس شادی سے خوش ہو؟"

وہ چھوئی موئی کی طرح سمٹ اور جھینپ کر صرف چپ رہتی۔

"بولو نا!" وہ اصرار کرتا

"کیا؟"

"یہی جو بات میں نے پوچھی ہے اس کا جواب دو نا!"

"کیا جواب دوں!"

"ارے واہ! جواب کیا دوں! ـــــ بتاؤ نا! تمہیں ہم پسند ہیں؟ تم اس شادی کو پسند کرتی ہو؟"

"مجھے معلوم نہیں"

"تو کسے معلوم ہے؟"

وہ پھر چپ ہو جاتی۔ اس طرح باوجود کوشش کے وہ اوشا کی دلی کیفیت سے بے خبر رہا۔

کیلاش نے ایک پڑھے لکھے ذہین شخص کے مانند اوشا کی بابت اپنے خیالات کا تجزیہ کیا۔ بعض اوقات انسان عجیب تذبذب میں پڑ جاتا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے ہمیشہ یہی کہا کہ اس کیفیت کو معمولی لگاؤ سے زیادہ اہمیت دینا بیکار ہے۔ اوشا میں کوئی غیر معمولی خوبی بھی نہیں تھی۔ بیوی کی بابت اس کا نظریہ یا تو فی الحقیقت ضرورت سے زیادہ بلند تھا یا اوشا ہی معمولی سے معمولی پیمانے پر بھی پوری نہیں اترتی تھی۔ وہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

گھر میں شادی کی ڈھولک بجنے لگی۔ گلی محلے کی لڑکیاں گیت گانے کے لئے راتوں رات وہاں اکٹھا ہونے لگیں۔ کیلاش بظاہر ان سب واقعات کو کمال اطمینان سے نظر انداز کر رہا تھا لیکن جوں جوں شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے توں توں اس کے دل کی ہلچل بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ شادی میں ایک ہفتہ باقی رہ گیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی کوئی بڑی قیمتی اور عزیز شے اس کے ہاتھوں سے چھینی جا رہی ہے۔

اس کے والدین بھی آ چکے تھے۔ گھر میں مہمانوں کی چہل پہل تھی۔ خود اس کا کمرہ بھی استعمال میں لایا جا رہا تھا۔ اس شوروغل اور مہمانوں کی ریل پیل میں اوشا سے گھڑی بھر کو بات کرنے کا موقعہ بھی میسر نہیں آتا تھا۔ ان دنوں لڑکیاں کام کاج بھی ترک کر دیتی ہیں چنانچہ یہی حال اوشا کا تھا لیکن نہ جانے کب وہ اس کا کمرہ صاف کر دیتی تھی اس کے جوتوں، کپڑوں اور ضروریات کی دیگر چیزوں میں اسے اوشا کا نازک ہاتھ

کام کرتا نظر آتا تھا۔ اگر کبھی اُس کے چھن جانے کے خیال سے اس کا دل غمگین ہوتا تو اسے اس بات سے یک گونہ تسکین سی حاصل ہوتی تھی کہ ابھی تک اُن کے دل میں اس کے لئے جگہ باقی ہے۔

ایک روز دوپہر کے وقت جبکہ گھر میں صرف شکورن تھا، کیلاش مسز زبیر کے دروازے کی چٹخنی جو جانے کس باعث نیچے گر گئی تھی، موجود تھا، اوشا اندر داخل ہوئی۔

وہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگا "کہو اوشا یاد کیسے آ گئی؟ میں تو سمجھا تم نے ہمیں بالکل ہی بھلا دیا۔"

اوشا چپ تھی اور چپ ہی رہی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا، پھر جھاڑو اٹھا کر فرش صاف کرنے لگی۔

"یہ کیا کرتی ہو؟"

"سنا ہے کہ اوپر جانا ہے بہت جلد۔ زیادہ لوگ آتے جاتے ہیں یہاں۔"

"مگر اوشا تم تو آج کل کام بھی کیا جاتا ہے؟"

"ہاں"۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر؟"

قدرے تامل کے بعد اس نے مدھم اور باریک آواز میں جواب دیا۔ "لیکن مجھے اپنے دل کی بات کہنے کا حق تو حاصل ہے۔"

کیلاش اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے وہ اس کے سینے کو توڑ کر نکل جانا چاہتا ہو۔۔۔

اسی اثنا میں اوشا اس کی چارپائی کے قریب پہنچ گئی۔ گیان شنکر نے کہا "ٹھہرو
میں جوتا آپ اٹھاؤں۔"

لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہہ پاتا اوشا اپنے ہاتھ سے اس کے بوٹ اٹھا کر ان
کے نیچے فرش صاف کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"ارے پاؤں سے ہٹا دیا ہوتا۔ ناحق ہاتھ خراب کیے تم نے۔"

اوشا لرزتی ہوئی آواز میں بولی "بھلا میں آپ کے جوتوں کو پاؤں کی ٹھوکر لگا سکتی
ہوں.... میں تو انہیں چوم چوم لیا کرتی ہوں۔"

"احمق" گیان شنکر نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ عشق و محبت کا تو قائل تھا لیکن محبت
کی اس حد تک بھگتی اسے قطعاً پسند نہیں تھی۔

وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ یہ محبت نہیں بچپن تھا۔ اس قدر جذباتی لڑکی کبھی اچھی بیوی ثابت
نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھا ہوا تھا۔ اس وقت جبکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ
اوشا چلی گئی ہوگی۔ اسے اپنے پاؤں پر نمی سی محسوس ہوئی۔ آنکھوں سے بازو ہٹا کر
دیکھا کہ اوشا اس کے پاؤں کو آنسوؤں سے دھو دھو کر چوم رہی ہے۔ پیشتر اس کے
کہ وہ کچھ کہہ سکتا۔ عین اس نازک موقع پر اوشا کی ماتا جی نہ جانے کہاں سے آن
ٹپکیں۔ اور فوراً اصل معاملہ بھانپ گئیں۔ اوشا ماں کو دیکھتے ہی چھوئی موئی کی طرح
سمٹ گئی اور پھر اٹھ کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔

چچی نے گیان شنکر سے کچھ نہیں کہا۔ ایک گوشے سے ٹین کا ڈبہ اٹھا کر
باہر چلی گئیں۔

۱۰

آخرکار جب شادی کی رسوم ادا کی گئیں اور اُما نے ایک غیر مرد کے ساتھ متبرک آگ کے گرد چکر کاٹے تو کیلاش کا دل بیٹھ گیا اور وہ اسے ڈولی پر رخصت ہوتے نہ دیکھ سکا اور چپکے سے کھسک کر گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ کافی دیر تک گم صم سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اس کے لبوں پر مہرِ سکوت لگی ہوئی تھی اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وقت کی رفتار ختم ہو گئی ہے اور ساری دنیا ایک نقطے پر رُک کر رہ گئی ہے۔

جب وہ مال روڈ پر گھومتا ہوا بیڈن روڈ کی جانب جا رہا تھا تو دفعتہً اس کی اپنے دوست ستیش سے ملاقات ہو گئی۔

اس سے وہ پہلے پہل انٹرویو کے موقعہ پر ملا تھا۔ وہ ملازمت سے محروم رہا لیکن ان دونوں کے تعلقات گہرے سے گہرے ہوتے چلے گئے۔

جس وقت کیلاش گھر سے نکلا تھا اس وقت وہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اب اس کا جی چاہنے لگا کہ اگر کوئی دوست ملے تو اسے ہمراز بناؤں۔ چنانچہ اس دوست کو پا کر اسے یک گونہ تسکین محسوس ہوئی اور وہ دونوں ایک ہوٹل میں گھس گئے۔

کیلاش نے اپنی داستان کی پوری حقیقت ظاہر نہیں کی البتہ اس نے اس کا مشورہ حاصل کرنے کے لئے کہانی کچھ ردوبدل کے بعد یوں سنائی کہ ایک لڑکی کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ پہل اس نے کی تھی۔ چنانچہ مجھے بھی اس کی جانب رجوع کرنا پڑا۔

میرے ذہن میں یہی خیال جاگزین تھا کہ مجھے اس لڑکی سے عشق نہیں ہمدردی ہے۔ جونہی میں نے بارہا عقل سے دریافت کیا کہ کیا اس لڑکی سے شادی کر لوں گا، تو جواب ہمیشہ نفی میں پایا لیکن اب اس کی شادی ہونے لگی تو دل دہائی دینے لگا۔ بہت ہی عجیب قسم کی ٹریجڈی ہے کیونکہ ہم دونوں کی محبت اور شادی کے درمیان کوئی غیر معمولی چیز حائل نہ تھی۔ صرف میری قوت فیصلہ کی کمزوری کے باعث یہ سب کچھ پیش آیا۔ سچ پوچھو تو اب بھی موقع ملے تو میں اس لڑکی سے شادی کرنے سے گریز کروں کیونکہ بیوی کی بابت میرا نقطہ نظر ذرا مختلف ہے لیکن نہ جانے پھر میرے دل میں یہ ہلچل کیسی پیدا ہو گئی ہے۔

"آخر تمہیں اس سے شادی کرنے سے گریز کیوں تھا؟ اس کی حقیقی وجہ کیا تھی؟ کیا [illegible]

وہ بدصورت ہے، کم پڑھی یا کچھ؟"

[illegible] نے ذرا سا تامل کیا۔ "فی الحقیقت وہ خوبصورت نہیں مگر از کم میرے نقطۂ نگاہ سے وہ حسین نہیں ہے۔ [illegible] ذرا بھی [illegible] ..."

"تو پھر یہی ہو سکتا ہے کہ تمہیں زیادہ حسین ہونی چاہیئے"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مجھے اپنے دل کی اس کیفیت پر خود الجھن ہوتی ہے۔ مجھے حقیقی تکلیف اس بات کی ہے کہ وہ مجھ سے دلی محبت کرتی تھی۔ خیال آتا ہے کہ اگر میں اسے اپنا لیتا تو اس کے دل کی دنیا اجڑنے سے بچ جاتی لیکن ... میں اس سے شادی کر سکتا؟"

اس پر عقیل مسکرایا۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ عقیل نے مشورہ دیا "میرے خیال میں تم بیوی کو خدمت کرو۔ وقت کا مرہم سارے زخموں کو مندمل کر دے گا۔"

دیکھئے میں کل دو مہینے کے لئے گاؤں جا رہا ہوں۔ مجھے تمہارے اس حد سے
دلچسپ رسالے کی خط و کتابت کرتے رہنا۔

دونوں نے ایک دوسرے کے پتے لکھ لئے اور رخصت ہو گئے۔

راستے میں کیلاش نے یوں محسوس کیا کہ اسے شاید ایسی باتیں کسی سے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کیونکہ اس گفتگو سے اسے تسلی ہونے کے بجائے ذہنی الجھن اور بڑھ گئی تھی۔ یا وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر سکتا یا خاموش رہتا۔ لیکن وہ وضاحت کیا کرتا اسے خود پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

جب وہ گھر پہنچا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ گھر نہیں ہے بلکہ لٹا ہوا قافلہ ہے۔

[illegible]

اور پھر وہ لڑکی جو اس کے دل کے ایک نہایت نازک تار پر انگلی رکھے بیٹھی تھی۔

پورا چاند آسمان میں چمک رہا تھا۔

کیلاش نے اپنے کمرے سے باہر قدم رکھا اور تاروں کے جھرمٹ میں چاند کو دیکھ کر رک گیا۔

چھت پر کوئی نہیں تھا۔ دس بج چکے تھے۔ شادی کے شور و غل کے بعد یہ سکون موت کی سی خاموشی سے بھی زیادہ اداس کر دینے والا تھا۔ اس نے ذہن پر زور ڈال کر واقعات کو سمجھنا چاہا لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ذہن کی یہ حالت تھی کہ وہ کچھ بھی سوچنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ بس ایک بے بسی اور بے حسی کی سی کیفیت طاری تھی۔

اس نے اداس چاند پر نظریں جما کر اپنی بے بضاعتی کو کچھ اس شدت سے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

دوسرے روز علی الصبح اوشا کی ماں نے اس کے گھر سے نئی جھانکا۔
جس روز سے اس نے دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھا تھا وہ اس سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے پر مسرت کے آثار ہویدا تھے۔ شاید اب وہ مطمئن تھی کہ لڑکی کی شادی ہو چکی ہے اور اسے ڈولی میں روانہ کیا جا چکا ہے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔
وہ اس کی چارپائی پر آن کر بیٹھ گئی اور بڑے بے تکلفانہ انداز سے دھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ شاید وہ اس کے دل سے اوشا کی جدائی کے غم کو بہلا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ یوں تو وہ بعض اوقات اس سے بے تکلفانہ باتیں کر لیا کرتی تھی لیکن آج اس کے انداز میں کوئی اور جذبہ بھی کارفرما تھا۔
کیلاش سے نہ رہا گیا۔ اس سے پوچھ ہی لیا "چاچی! اب اوشا بھلا سسرال میں کتنے روز رہے گی؟"
"یہی تین روز . . ."
چاچی کے ان چار الفاظ میں کیلاش کو اپنی نجات دکھائی دی۔ یہ خیال کہ دو تین روز تک اوشا کے پھر درشن ہوں گے، اس کے لئے بے حد تسکین دہ تھا۔
مگر دوسری شب تو قیامت تھی۔
انہیں ایک رات تو لیٹے ہی میں کٹ ہو گئی ہو گی۔ راولپنڈی تقریب تو نہیں تھی لیکن آج اوشا کی سہاگ رات تھی۔

اس نے تخیل میں ایک نہایت روح فرسا منظر دیکھا اور ایک چمکتا ہوا سبز اور نوکیلا خنجر اس کے سینے میں اترتا چلا گیا . . . نیچے، نیچے، اور نیچے یہاں تک کہ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ نازک ڈور جس میں اوشا اور وہ باہم بندھے ہوئے تھے دفعتہً ٹوٹ گئی ہے۔

اس ڈور کا ٹوٹنا بڑا تکلیف دہ تھا۔ اس کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ جذبات کے تیز و تند ریلے میں اس کی قوتِ ارادی تنکے کے مانند بہہ نکلی۔

تیسرے دن شرما جی اوشا کو لینے کے لئے چلے گئے۔ وہ ایک رات وہاں رہیں گے اور صبح کی گاڑی سے چل کر رات کو واپس آ جائیں گے۔

کیلاش کے دل میں ایک کھوکھلا سا پیدا ہو گیا تھا لیکن وہ چپ چاپ وقت کو ٹالتا رہا۔ وہ ایک ایک لمحہ گن رہا تھا — ایک ایک لمحہ جو اسے اپنے گذرنے کا نہایت شدید احساس دلا رہا تھا۔

آخر وہ رات بھی آن پہنچی۔

اپنے کمرے میں تنہا نیم دراز پڑا کیلاش ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس کا پڑھنے میں دھیان نہیں تھا۔ کان صحن کی آوازوں کی جانب لگے تھے . . . لمحے گھسٹ گھسٹ کر گذر رہے تھے۔ یاس اور ناامیدی کے بھوت گھوم گھوم کر اسے آنکھیں دکھاتے تھے۔ بار بار وہ کسی آواز پر کان کھڑے کر لیتا لیکن پھر اس کی ٹھوڑی اس کے سینے پر جا ٹکتی۔

نو بج گئے۔

دفعتہً دروازہ کھلا جیسے بھونچال آ گیا ہو اور دوسرے لمحہ رنگ و بو اڑاتی ہوئی

ایک شام جب وہ اندر داخل ہوئی اور اس کے گلے سے لپٹ گئی تو
کیلاش نے محسوس کیا کہ اس کے بدن پر گویا ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑ گئے
دونوں گویا ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے رہے۔

کیلاش کو اوشا سے ایسی محبت نہ تھی جو اس کی ادا ادا پر نثار ہو۔ اس کی حرکت ہی
تھی کہ اس کے اندر کوئی جسم کی پیاس، اپنے تصور میں کوئی بات محسوس نہیں کرتا اب
محسوس کر رہا تھا۔

ٹھنڈے موسم میں گلے لگ کر بیٹھے جھولے کیلاش نے منہ چوم کر جی بھر کر پیار کیا۔
اس کے چہرے پر زیب اور کافور جیسی پٹی ہے جس کا منہ کیسے ترک کر دیا ہے
کو واقعی دل کو بھی حسن بنا دیا تھا۔

ڈیڑھ دو مہینے کے بعد پھر اوشا کی رخصت کے تذکرے ہونے لگے۔ کیلاش
کے ذہن پر یہ تلخ حقیقت عیاں ہونے لگی کہ دنیا اور سماج کی نظروں میں اوشا غیر
کی ہو چکی ہے اور اسے جلد یا بدیر اس کی جدائی برداشت کرنی ہی پڑے گی۔
یہ خیال بڑا تکلیف دہ تھا۔ اس دوران میں وہ پتنی کو خط لکھے بغیر نہ رہ سکا۔
جواب آیا۔

دوست!

ذرا تو تم بھی تسلیم کرو گے کہ تم منطق سے کام نہیں لے رہے ہو بلکہ
جذباتی ہو رہے ہو۔ تم کہتے ہو کہ اس لڑکی سے شادی کرنے کا قطعاً ارادہ
نہیں تھا۔ پھر کہتے ہو کہ تمہیں یہ خیال بھی پریشان رکھتا ہے کہ وہ لڑکی دنیا میں
تم ہی سے محبت کرتی ہے اور تمہاری وجہ سے اس کی زندگی برباد

ہمارے بیچ ۔۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ ایک بات یقینی ہے کہ اب ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ تم دونوں اب [illegible] کہ اپنے آپ کو نئے حالات میں منتقل کرنے کی کوشش کرو۔ میری صاف رائے ہے [illegible] وہ مکان چھوڑ دو اور کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لو [illegible] بھی ہر صورت [illegible] ذمہ داری [illegible] علاوہ کوئی [illegible] اٹھاؤ گے تو خود بھی پریشان ہو گے اور [illegible] کو بھی خراب کرو گے۔

تمہارا
کمل

۱۱

حالانکہ ورجاماں کو ترک کر کے نئے مکان میں قیام کرنا کیلاش کے لئے ناخن سے گوشت الگ کرنے سے کم اذیت دہ نہیں تھا تاہم اس نے دوست کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شرماجی کا کمرہ خالی کر دیا۔

آرتشا کے دوبارہ سسرال چلے جانے کے بعد اس کا وہاں رہنا اس کے لئے یقیناً ناممکن تھا اور چونکہ آرتشا اس کے وہاں سے چلے جانے کے حق میں نہیں تھی، اس لئے اس وقت تک مکان تبدیل نہیں کیا جب تک کہ وہ سسرال روانہ نہیں ہو گئی۔

جانتے [illegible] کی کرن [illegible] سے شادی کی بات [illegible] چوڑیاں توڑ ڈالیں ۔ [illegible]

بدشگونی تھی لیکن اس نے وہ ٹکڑے (اپنی برباد محبت کی نشانی) پرمی کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ کیلاش نے وہ ٹکڑے لفافے میں بند کر کے انہیں محفوظ کر لیا۔

اس دوسری جدائی سے کیلاش کے دل کو عجیب طرح کا رنج ہوا۔ رنج پہلا بھی کافی بار رہا سہی تھا لیکن بقول شکل اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس مسئلہ پر عملی نقطہ نظر سے غور کرے۔ اب دل کی پکار کے خلاف زبان دانتوں تلے دبا کر قطعاً مضبوط ارادے سے قدم بڑھانا تھا۔ گرچہ اس طرح اٹھایا ہوا قدم اسے آسودہ [illegible] وہ [illegible] لیے غالباً [illegible] تھا۔

ایسے ہی وقت شکل اس کے کام آیا۔ بعض لوگ ہیں جو دوستوں کے کام آنے کے لئے ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ ان دونوں کا بہت پرانا یارانہ نہیں تھا۔ پھر بھی شکل نے ہر طرح سے اس کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

شکل نے مشورہ دیا کہ اخبار میں شادی کا اشتہار دے دیا جائے۔ اتنے اچھے پڑھے لکھے لڑکیوں کی قطار لگ جائے گی۔ کیلاش کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ شکل پر چھوڑ دیا کہ جو اس کے جی میں آئے سو کرے۔ چنانچہ انگریزی اخبار میں مندرجہ ذیل مضمون کا اشتہار دے دیا گیا۔

> ضرورت ہے صحیح معنوں میں حسین لڑکی کی جو پڑھی لکھی اور سوشیل ہو اور شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ لڑکا تعلیم یافتہ، خوبصورت، صحت مند اور اچھے خاندان کا فرد ہے۔ سرکاری ملازم ہے۔ ماہوار تنخواہ ساڑھے چار سو روپیہ۔

اشتہار شائع ہونے کے تیسرے دن ہی لڑکی والوں کی جانب سے خطوط کا

تانتا بندھ گیا۔ آٹھ دس روز تک سو سے اوپر خطوط موصول ہوئے۔

ان خطوط کی وجہ سے عجیب گہما گہمی پیدا ہو گئی۔ متل چٹخارے لے لے کر اسے خطوط سناتا اور رفتہ رفتہ کیلاش کا دل بہل گیا۔

لڑکی والے بھی لڑکے کی بابت تفصیلی معلومات کے طلبگار تھے۔ متل نے پہلے ایک پکی عبارت تیار کی۔ اس میں کیلاش کی عمر، رنگ، خدوخال، عادات، ذات پات، ماں باپ، خاندان وغیرہ کی بابت تفصیلی معلومات جمع کر دیں۔ پھر اس کی متعدد نقول ٹائپ کروالیں۔

پہلے لڑکی والوں کے سب خطوط میں سے چند پسندیدہ خطوط چھانٹ لیے گئے۔ باقی ضائع کر دیئے گئے۔ منتخب خطوط کے پتوں پر جواب روانہ کر دیئے گئے غرضیکہ اس طرح خاصے بڑے پیمانے پر خط و کتابت شروع ہو گئی۔

قدم قدم پر متل کیلاش سے مشورہ لیتا۔ وہ سمجھاتا کہ اب انہونی چیز کا خیال دل سے نکال دو۔ عملی زندگی خیالی دنیا سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ تم اوشا کی محبت کے گن گاتے ہو لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر اسے سچ مچ تم سے محبت تھی تو پھر اس نے کسی اور سے شادی کیوں کر لی۔ اس پر کیلاش نے ماتھے پر بل ڈال لئے لیکن چپ ہو رہا۔ متل نے بیان جاری رکھا کہ خواہ اوشا کو اس سے سچی محبت ہی ہو لیکن ہمارے سماج میں اب کوئی راہ باقی نہیں رہ گئی۔ اگر تم شادی نہیں کرو گے تو اوشا کے ذہن پر بوجھ رہے گا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ اس کی محبت کی وجہ سے تمہاری زندگی خراب ہو رہی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ بھی اپنے دھرم کا پالن صحیح کے ساتھ نہیں کر سکے گی اور تمہارے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا غرض

بربادی ہی بربادی ہوگی۔ اگر تم شادی کر لوگے تو ایک تو تمہارا دھیان ہٹ جائے گا۔ ادھر اوشا کے خیالات میں انقلاب پیدا ہو جائے گا ۔۔۔ غرضیکہ پختہ عقل انسان کی طرح قدم اٹھاؤ گے تو آغازِ شباب کی جذباتی محبت کا شکار بننے سے نہ صرف خود بچ جاؤ گے بلکہ اسے بھی بچا سکو گے جس کی محبت کا دم بھرتے ہو۔

کیلاش ان باتوں کے سننے سے گریز کرتا تھا لیکن خلل موقعہ پاتے ہی اس کے کان بھرنے سے ہرگز نہ چوکتا۔ رفتہ رفتہ کیلاش کے جذبات کی وہ شدت کم ہونے لگی لیکن اوشا کی صورت اور محبت کا جو نقش اس کے دل پر ثبت ہو چکا تھا اس کا ہٹنا ناممکن تھا۔

جن پارٹیوں سے بات چیت شروع کی گئی، ان میں سے بیشتر سے پیچھا چھڑانا پڑا۔ باقی صرف چھ پارٹیاں رہ گئیں۔ اب کیلاش نے مشورہ دیا کہ ماتا جی کو بلا لیا جائے تاکہ وہ خود اس معاملے کو طے کر سکیں۔

کیلاش کی ماتا جی کو اس مفہوم کا خط ملا تو وہ اچھل پڑیں۔ بیٹا با روزگار تھا اب صرف شادی ہی کی کسر تھی۔ باپ نے کہا آخر یہ چھوکرا کیا کرتا پھر رہا ہے۔ رشتہ تو بہت تلاش کریں گے۔ اس پر بیوی بولیں۔

"رہی بیٹا، تمہارا تو جیون بھر حال ہی یہ رہا ہے کہ گھڑی میں ماشہ اور گھڑی میں تولہ۔ میرا بیٹا تو ہیرا ہے گنو۔ اس کے کسی دوست کا خط آیا ہے کہ چند رشتے ہیں آکر دیکھ لیجئے تو بہتر ہے جانے میں حرج ہی کیا ہے۔"

ماتا جی فوراً ان کے پاس آ پہنچیں اور پھر کیا تھا بات چیت بڑے زور شور سے شروع ہو گئی۔

لڑکی والی پارٹیوں کو جب ان کی امارت اور وقار کا پتہ لگا تو وہ ہر ممکن طریقے سے یہ رشتہ لینے کے درپے ہوئے۔

کیلاش کا خیال تھا کہ وہ لڑکی دیکھ لے لیکن ماتاجی نے اسے ٹال دیا۔ "ارے چل! بڑا صاحب بنا پھرتا ہے ہم جو ہیں لڑکی دیکھنے والے"۔

کافی لے دے کے بعد ایک جگہ رشتہ طے ہو گیا۔

کیلاش بری طرح پھنس گیا تھا۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ واقعات اس تیزی سے قدم اٹھائیں گے اور جس بات کا اس کے ذہن میں خیال بھی نہیں تھا وہ اس "قدر جلد طے ہو جائے گی۔ اب نہ انکار کرتے بنتی تھی نہ اقرار کئے۔ چنانچہ وہ بچارا دم سادھ کر چپ ہو رہا۔ اس نے یہ جاننے کا خیال بھی ترک کر دیا کہ لڑکی کی شکل و صورت کیسی ہے، البتہ متل اس کی موجودگی میں ماتاجی سے کرید کرید کر سوال کرتا۔ "ماتاجی! لڑکی کا رنگ کیسا ہے۔ بال لمبے ہیں نا! آنکھیں بڑی بڑی ہیں نا! قد خوب لمبا ہے نا، جسم اکہرا..."

ماتاجی چپت مارنے کے انداز سے ہاتھ اٹھا کر کہتیں۔ "برخوردار سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہم نے کوئی دھوپ میں بال سفید نہیں کئے ہیں"۔

ہر چہار جانب سے مبارک مبارک کی صدائیں سنتی ہوئی ماتاجی گھر لوٹ گئیں اور بیاہ کی تیاریاں بڑے زور شور سے شروع ہو گئیں۔

ماتاجی عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر کہتیں۔ "دلہن پرمیشر نے ایک لڑکا دیا ہے۔ میرا کیا ہے ندی کنارے کھڑے پیڑ کے مانند، جانے کب گر پڑوں؛ میرے جیتے جی میرے بچے کے سہرا بندھے اور وہ چھم چھم کرتی دلہن لائے اس

سے بڑھ کر اور مجھے کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ ادھی میں تو اس کا منہ تکتی تھی اس نے ہاں
کہی اور میری جان میں جان آئی۔ بھلا میں موقعہ ہاتھ سے چھوڑنے والی ہوں اور اس کے
بعد ہندوستان بھر کے دھرم استھانوں کا تیرتھ کرنے کا خیال ہے۔"

تیاریاں مکمل ہو گئیں تو شادی کی تاریخ کے قریب کیلاش کو چند روز کی چھٹی
لے کر گھر جانا پڑا۔

کیلاش کے حواس قائم نہیں تھے۔ اس کی دانست میں جیسے یہ سب کچھ خواب
کی حالت میں ہو رہا ہو۔

وہ کسی معاملے میں نہیں بولا جو کپڑے انہوں نے سلا دیئے وہ قبول کر لئے غرض
جو کام جس طرح سے ہو گیا سو ہو گیا۔ اس نے کچھ دخل نہیں دیا۔

آخر ایک روز وہ بھی آیا کہ جب بارات لڑکی والوں کے شہر کی جانب روانہ
ہو گئی۔

ایک بار پھر شہنائیوں کی صدائیں فضا میں گونج اٹھیں۔ فلمی ترانے ہوا میں اڑنے
لگے سنسکرت کے شلوک اور پھر ایک انجانی لڑکی کے ساتھ اس نے متبرک آگ
کے گرد چکر کاٹے۔

بڑی گہما گہمی رہی۔ ہنسی مذاق اور قہقہوں کی صداؤں میں کان پڑی آواز سنائی
نہ دیتی تھی۔

فی الحقیقت شہنائیوں کی صدائیں کیلاش کے لئے ڈوبتی ہوئی بے یار و مددگار
کے حلق سے نکلتی ہوئی چیخوں سے کم نہیں تھیں۔

آخر کار وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب بارات لوٹ آئی اور کیلاش نے جیسے خواب

میں چلتے چلتے گھوم کر دیکھا کہ گٹھڑی بنی ہوئی ایک لڑکی اس کے دامن سے بندھی ہے . . . وہ اس کی اور محض اسی کی بیوی تھی۔

۱۲

خواب گاہ کے دروازے میں کھڑے کھڑے کیلاش نے کمرے کے پرلے سرے پر کھلی ہوئی کھڑکی میں تاروں کی جانب دیکھا جو یوں نظر آرہے تھے جیسے سیاہ چوکھٹے میں تابدار موتی جڑے ہوئے ہوں۔

متفرق خیالات و احساسات کے ہجوم میں اس کا ذہن سوچنے اور فیصلہ کرنے کی قوت سے خالی ہو چکا تھا۔ بظاہر وہ پُرسکون دکھائی دیتا تھا۔

آج شادی کی پہلی رات تھی۔

اگر کسی اور سے اسے محبت نہ ہوئی ہوتی تو آج کی رات یقیناً اس کی زندگی کی اہم ترین رات ہوتی اور یہی بات اس کے دل میں کھٹک رہی تھی۔

ایک جانب وہ ایک ایسی لڑکی کو چھوڑ آیا تھا جس نے اس سے بے پناہ محبت کی تھی جس نے اس کی ذات کو اپنی ذات میں مدغم کر لیا تھا۔ دوسری طرف وہ ایک ایسی لڑکی کی جانب قدم بڑھا تھا جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جس کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کی تال پر اس کا اپنا دل کبھی نہیں دھڑکا تھا . . .

ایک لڑکی نے کبھی کسی بات کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ نہ حسن صورت کا نہ لیاقت کا نہ امارت کا . . . اس لڑکی نے صرف یہ کیا کہ ایک راہ گیر کے قدم پکڑ لئے ۔ اس نے پاؤں پیچھے ہٹانا چاہے تو اس نے ان پہ سر ٹیک دیا عشق کی اس سے زیادہ اور کیا مجبوری ہوسکتی

تھی! ۔ دوسری عورت سماج کے حکم سے والدین کے آشیرواد سے اس کی ملکیت ہو چکی تھی۔ وہ اس کی جیون ساتھی بن چکی تھی۔ اسے اس کے والدین نے کہا۔ جاؤ بیٹی جاؤ۔ ہم نے تمہیں ایک اجنبی کو سونپا، یہ بازی تو ہمیں ایک روز ہارنی ہی تھی سو ہم نے ہار دی۔

لیکن ایسا کیوں ہوا . . . کیوں ہوا۔

کیلاش کے دماغ میں ہتھوڑے بجنے لگے۔ مگر اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اس نے کب کسی سے محبت کی تھی۔ اس نے کب کسی کو اپنایا تھا۔ فی الحقیقت اس نے اوشا کی محبت کی خواہش نہیں کی تھی۔ اس کے ذہن میں اوشا کے ساتھ شادی کرنے کا کبھی خیال تک پیدا نہیں ہوا تھا . . . تو پھر یہ کشمکش کیسی۔ یہ کس قدر غیر منطقی بات نظر آتی ہے۔ شاید میں بہت جذباتی ہوں، دل دماغ پر حاوی ہے . . . زندگی کا عملی پہلو . . . تنّی کے یہ الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے اور پھر اسے ان الفاظ سے کراہت سی محسوس ہونے لگی۔

اپنے ذہن کو الجھن سے نکالنے کے لئے اس نے قدم آگے بڑھایا۔

رنگین پلنگ پر دلہن گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ اس نے لمبا گھونگٹ نکال رکھا تھا اور اس کے بدن کا کوئی حصہ بھی ننگا نہیں تھا، یہاں تک کہ ہاتھ پاؤں رنگین کپڑوں کی سلوٹوں میں گم تھے۔

کیلاش کے لبوں پر بے اختیار لمحہ بھر کے لئے متضاد جذبات لئے ہوئے ایک مسکراہٹ پھیل گئی . . . . اس وقت اسے اپنی بیوی ایک گٹھے کے مانند دکھائی

وہ ایک پُر اسرار پہل کی طرح کپڑوں کا تھوڑا ہیں لپٹی ہوئی تھی۔ کیسی عجب بات تھی کہ اسے اس قدر ڈھکی چھپی ہوئی گٹھڑی کو کہاں تک عریاں کرنا تھا۔ ۔ ۔ یہ عجب ہے۔ بڑی مضحکہ خیز بات تھی۔

وہ قدم قدم آگے بڑھتا چلا گیا اور پلنگ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

بظاہر بڑی معقول معلوم ہوتی تھی۔ کچھ دیر اس کا ذہن اس خیال سے محظوظ ہوتا رہا۔

پھر اس نے سوچا کہ اسے کیا کہنا چاہیئے۔ کچھ تو کہنا چاہیئے لیکن کیا؟ ۔ ۔ ۔ ابھی تک اس نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔ ایسے موقعوں پر کیسی باتیں کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اس کے دل میں کوئی الجھن نہ بھی ہوتی تو بغیر شکل دیکھے وہ کیا کہہ سکتا تھا بلکہ بغیر ایک دوسرے کو جانے انسان کیونکر باتیں کر سکتا ہے ایک عورت سے۔

رنگین و ریشمی کپڑوں کی گٹھڑی کو اس نے انگلیوں سے چھوا تو ساری گٹھڑی میں لرزش پیدا ہوئی اور وہ اور بھی سمٹ گئی۔

اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر چل دے۔ خفگی کے مارے نہیں بلکہ یونہی۔ ۔ ۔ آخر اس غریب کو چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اس کا کیا لیتی ہے۔ پڑی رہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس قسم کا رویہ اختیار کرنا حیوانیت ہے، یہ تو پرانا رواج چلا آرہا ہے کہ دلھن شرمائے اور دولھا ہاتھ بڑھائے۔ ۔ ۔ کاش وہ کہہ سکتا! ۔ ۔ ۔ لیکن کیسے۔ بغیر دیکھے وہ کچھ کیسے کہہ سکتا تھا۔ اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔

آخرکار اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گھونگھٹ دفعتہً ہٹا دیا۔ ۔ ۔

پہلے چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں، جیسے یکا یک فانوسِ قزح

دیکھ کر بدک جائے۔

وہ اس قدر حسین تھی کہ انسان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آسکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کیلاش نے کبھی کبھار ایسی صورت دیکھی ہو لیکن ایسی بیوی اس کے حصے میں آئے گی۔ اس کا تو اسے خواب میں بھی خیال نہیں تھا۔ نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی وہ لڑکی تھی دُبلی پتلی۔ کس قدر بے عیب اور پاک تھی وہ . . . . جو اب اس کی بیوی تھی جیسے پروردگار کے کارخانے سے ابھی ابھی نو بہ نو مورتی تیار ہوئی ہو اور پھر آب کوثر میں نہلا کر اس کے بستر پر آہستہ سے بٹھلا دی گئی ہو۔

بستر پر بیٹھنے کے بجائے دھیرے دھیرے اس نے زمین پر گھٹنے ٹیک دیئے۔

معاً اسے اوشا کا خیال آیا جس کا حسن حبشی تھا جس کا دل گرم تھا جس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر دمک تھی . . . کیا وہ اس قدر خود غرض انسان تھا۔ کوہ آتش فشاں کا لاوا اس کے ذہن میں سے کلبلاتا ہوا بہہ نکلا . . . .

پھر جب اس نے نادیدہ آنکھیں دانستہ اوپر اٹھائیں تو اس بت کو ہنوز بے حس و حرکت پایا۔ صرف اس کے لب لعلیں نامعلوم طور پر متحرک تھے جیسے گلاب کی پنکھڑیاں نسیم سحری میں لرزاں ہوں . . . . اس نے لبوں کی جانب منہ بڑھایا لیکن ہونٹ اس کی ٹھوڑی پر جم کر رہ گئے . . . کیونکہ ان نرم و نازک لب ہائے لعلیں کو نظروں سے اوجھل کرنے کی اس میں تاب ہی نہیں تھی . . . .

۱۳

شادی کے چند روز بعد جب کیلاش دفتر پہنچا تو میز پر آدرشا کی بند چٹھی پڑی ہوئی
وہ اس کا خط پہچانتا تھا۔ اس نے لفافہ اٹھایا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے
لگا۔ اس نے قدرے تامل کے بعد لفافہ چاک کیا تو لکھا تھا:

آقا!

ایک طویل ذہنی کشمکش کے بعد چند سطور آپ کی خدمت میں بھیجنے
کی جرأت کر رہی ہوں۔

میں آپ کی شادی میں شامل نہیں ہو سکی بلکہ دیدہ دانستہ شامل نہیں
ہوئی۔ کیونکہ میں اس حادثے کو برداشت کرنے سے معذور تھی اور ممکن
تھا کہ میری موت واقع ہو جاتی۔ گو مرنے سے نہیں ڈرتی لیکن ایسی
اذیت دہ موت میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ میں جھوٹ بول کر آپ کا
دل خوش کرنا نہیں چاہتا۔ فی الحقیقت آپ کی شادی نے مجھ سے میری
محبوب ترین شے نوچ کر چھین لی ہے۔

مجھے اپنی شادی کا غم نہیں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ مجھے آپ سے کوئی
نہیں چھین سکتا۔

اخلاقی اعتبار سے [illegible] ہے: میں [illegible] باتیں [illegible] پہلے [illegible]
کی بے حیائی ہے لیکن میں شادی سے پہلے اپنے آپ کو مکمل طور پر آپ
کے حوالے کر چکی تھی۔

کاش! میں خود کو خط نہ لکھنے پر مجبور کر سکتی۔

آپ کی

اوشا

طرزِ تخاطب ہی سے بے پناہ اپنائیت کا اظہار ہوتا تھا۔ کیلاش کو اتنی خاکساری پسند نہیں تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ "آخر اس بیوقوف نے مجھ سے محبت ہی کیوں کی تھی۔ مفت بیٹھے بٹھائے خود بھی آفت مول لی اور مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ اگر میں اپنے دل پر جبر کر بھی لوں تو اوشا کی مصیبت میرے لئے پریشانی کا باعث بنی رہے گی۔" آخر وہ جواب میں کیا لکھے۔ اگر اس کی تسکین کے لئے وہ کچھ لکھے بھی تو نہ جانے کس کے ہاتھ لگے اور پھر اس کا جو نتیجہ نکلے گا وہ تو ظاہر ہی ہے۔

اس ادھیڑ بن میں وہ کچھ بھی نہ لکھ پایا۔ یہاں تک کہ اوشا کا دوسرا خط موصول ہوا جس میں ایک جگہ لکھا تھا:

"... سنتی ہوں آپ کی بیوی بےحد خوبصورت اور نازک بدن ہیں اور اس قابل ہیں کہ آپ انہیں سر آنکھوں پہ بٹھائیں ... لیکن مجھے اس کا کچھ غم نہیں کیونکہ آپ کے قدموں پہ تو کسی اور کا قبضہ نہیں ہے نا ..."

۳۱ پہلی چٹھی کی طرح کیلاش دوسری چٹھی کا جواب بھی نہ دے سکا۔ اوشا نے اس کے دل میں مستقل طور پہ اپنے لئے جگہ بنالی تھی۔ لیکن اب اسے بدلے یا بگڑے ہوئے حالات کا کچھ کچھ احساس ہونے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اوشا اس سے اس قدر والہانہ محبت نہ کرے بلکہ اپنے حالات سے قابلِ عمل حد تک سمجھوتہ کرے۔

چٹھی لکھنے سے بھی اسے الجھن سی محسوس ہوتی تھی۔ اگر وہ اس کے محبت ناموں کا

کسی حد تک بھی گرمجوشی سے جواب دے تو مشکل اور اگر خشک سا کاروباری قسم کا جواب دے تو مشکل، بہرکیف اس نے اُلٹ پھیر کر مندرجہ ذیل خط اس انداز سے لکھا کہ اوشا کو ناگوار اور خشک بھی معلوم نہ ہو اور اگر کوئی اور پڑھ لے تو اعتراض بھی نہ کر سکے۔

اوشا جی!

آپ کے خطوط ملے۔ افسوس کہ کام کی زیادتی کے باعث میں جواب نہ بھیج سکا۔

میرے لئے یقیناً یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ مجھے ابھی تک نہیں بھولیں جن دنوں آپ کے ہاں رہا آپ لوگ بے حد عنایت اور محبت سے پیش آتے رہے۔ میں اس سلوک کو عمر بھر بھلا نہیں سکوں گا۔

آپ شادی پر بھی تشریف نہیں لائیں مجھے اس بات کا رنج بھی ہے اور شکایت بھی۔

آپ مجھے مبارکباد بھیجتی ہیں۔ شکریہ! لیکن اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں بہت خوش اور مطمئن ہوں تو یہ خیال غلط ہے۔ یاد رکھئے کوئی انسان بھی مکمل طور پر خوش نہیں ہے — صرف یہ سوچ کر کہ آدمی کی ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی دل کو تسکین دینی پڑتی ہے۔ آخر کائنات میں انسان کی حقیقت ہی کیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ مجھے کبھی کبھی خط سے نوازتی رہیں گی۔

مخلص

کیلاش

اس خط کا واپسی ڈاک سے جواب آیا۔

میرے دیوتا!

جی چاہتا ہے کہ کورا کاغذ آپ کی خدمت میں بھیج دوں، کیونکہ آپ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا عنایت نامہ پاکر جو خوشی مجھے حاصل ہوئی نہ تو اس کا اظہار کر سکتی ہوں اور نہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کو کیا لکھوں۔

آپ مجھے کم گو اور تنہائی پسند لڑکی کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن جو طوفان میرے سینے کے اندر بپا ہے اس سے آپ واقف نہیں ہیں۔

مانا کہ انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی ــــ یہ فارمولا ایسے موقعہ پر تو چل سکتا ہے جب خواہشوں کا ہجوم ہو۔

لیکن اگر کسی کے دل میں خواہش ہی ایک ہو ــــ تو؟

صرف آپ کی
ہمیشہ آپ کی
اوشا

یہ خط پڑھ کر کیلاش نے سر میز پر رکھ دیا اور دیر تک وہ اسی حالت میں گم رہا۔ اس کی گھریلو زندگی خوشگوار اور ہموار تھی۔ اس کی بیوی حسن صورت کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک، کم گو اور قدرے کاہل واقع ہوئی تھی۔ گرمجوشی بہت کم لیکن پیشانی پر بل بھی کبھی نظر نہ آتا تھا۔ اس کی کوئی عادت اس حد تک بری نہیں تھی کہ کیلاش کو ناگوار گذرتی۔ البتہ اس کی خوابیدہ سی حالت بعض اوقات اس کے ذہن میں جھنجلاہٹ پیدا

کردیتی۔

اسے ملازمت اختیار کئے پانچ ماہ سے اوپر ہو چکے تھے لیکن کچھ اس قسم کی افواہیں اڑ رہی تھیں کہ غالباً وہ نہیں موقوف کر دیا جائے گا۔ عارضی ملازمت میں یہی عیب ہے۔ انسان دن تو گذارتا ہے لیکن ہر وقت دل کو دھڑکا لگا رہتا ہے۔

ان کے موقوف ہو جانے کی ابھی کوئی پکی اطلاع نہیں آئی تھی تاہم کیلاش نے احتیاطاً ذوتن کو لکھا۔

"ڈیر ذوتن!

شاید تین ماہ سے اوپر ہو چکے ہیں۔ میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی لیکن اب غرض آن پڑی ہے۔

بات یہ ہے کہ ہمارے موقوف ہو جانے کی افواہیں بڑے زوروں پر ہیں اور عین ممکن ہے کہ مجھے جواب مل جائے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ اب آزاد برہمچاری نہیں ہوں اب تو باقاعدہ گرہستی بن گیا ہوں، سو بتاؤ کہ اگر کوئی آفت آئی تو تمہارے پاس چلا آؤں کچھ مدد کر سکو گے؟

منتظر
کیلاش

فوراً جواب آیا:

ڈیر کیلاش!

جب جی چاہے ہمیں یاد کرو۔ آخر دوست ہوتے کس لئے ہیں۔

—— تمہاری نوکری کی بابت پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ میرے بازو ہمیشہ ہی تمہارے لیئے وا ہیں جو تمہیں سنبھالا دے کر پلکوں پر بٹھا لیں گے، دل میں جگہ دے لیں گے۔

لیکن کام کاج کی حالت یہ ہے کہ میرے پاؤں ابھی مضبوطی سے نہیں جم پائے کہ تمہیں فوراً کوئی کام دلا سکوں، البتہ یہ ممکن ہے کہ دو چار ماہ مار کھانے کے بعد تم کامیاب ہو سکو۔ میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ یہاں تمہاری کامیابی کا مجھے پورا پورا یقین ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ تم مفت میں ہوائی قلعے بنانے لگو۔

تمہارا

نوتن

اس دوران میں اوشا کے محبت نامے آتے رہے جن کا وہ جواب نہیں دے سکا۔ کچھ تو اپنی ذہنی کشمکش کے باعث اور کچھ ملازمت ختم ہو جانے کی افواہوں سے پیدا شدہ کوفت کی وجہ سے۔

آخر اسے ملازمت سے سچ مچ جواب مل گیا۔ ایک ماہ کا نوٹس وصول ہو جانے پر اس نے کافی دوڑ دھوپ کی کبھی آس بندھ جاتی کبھی ٹوٹ جاتی —— لیکن بالآخر امید ختم ہو گئی اور اس نے بمبئی میں اپنے دوست نوتن کے پاس جانے کی ٹھانی۔

انہیں دنوں اوشا کی ایک چٹھی آئی۔ لکھا تھا:

من موہن! —— جیو۔

یہ میرا آخری خط ہے۔ آئندہ صرف میرا دل آپ کو آوازیں دیا

کرے گا۔

آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ آپ تک کے جواب نہ دینے پر میں ایسا کر رہی ہوں۔ جی نہیں۔ اس لئے کہ محبت کا دعویٰ آپ کو نہیں مجھے ہے۔ اپنے جذبۂ صادق سے میں ذرہ برابر بھی مایوس نہیں ہوں ۔۔ شاید کبھی آپ سوچتے ہوں کہ ہم دونوں کے مابین آخر یہ سب کچھ کیا تھا میں بتاؤں۔

ہُوا یہ کہ ۔۔۔ آپ نے مجھے اس بات کا احساس دلا دیا ہے کہ آپ کے بغیر میری زندگی اندھیر ہے، بے معنی ہے لیکن یہی احساس میں اپنی ذات کے بارے میں آپ کو نہیں دلا سکی ۔۔۔ افسوس

ہمیشہ ہمیشہ آپ کی

رہنے پر مجبور

اوشا

اوشا کا ہر خط کیلاش کے دل پر نشتر کا کام کرتا تھا اور اسے دنوں تک اپنے پہلو میں کرب سا کروٹیں لیتا محسوس ہوتا تھا ۔۔۔ اس نے سوچا کہ چھٹی کا جواب بمبئی سے ذرا اطمینان کے ساتھ دوں گا۔

نوکری چھوٹنے پر وہ بیوی کو اس کے میکے چھوڑ آیا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے بیوی کا نازک اور گورا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"ڈارلنگ! میں تمہیں جلد از جلد ہی بلا لوں گا۔"

۱۴

بمبئی آئے ہوئے کیلاش کو دو ماہ ہو چکے تھے۔ کئی بار امید بندھ بندھ کر ٹوٹ چکی تھی۔ اگر نوتن وہاں موجود نہ ہوتا تو وہ کبھی کا منہ کی کھا کر لوٹ چکا ہوتا۔

ہر قسم کے انسانوں کی جدوجہد اور تگ و دو کے جو نظارے بمبئی میں دیکھنے میں آئے، وہ اس نے کہیں اور نہیں دیکھے تھے۔ دال روٹی کا چکر ایسا شدید تھا۔ کہ لوگ شب و روز بالکل جانوروں کی طرح ادھر اُدھر درندے پھرتے تھے۔

انسانوں کے اس جنگل میں اپنی بقا کے لئے جدوجہد کرنا کیلاش کے بس کی بات نہیں تھی لیکن اب اس پرانی بیوی کی ذمہ داری بھی تھی، وہ بیوی جو بے حد حسین تھی ——
البتہ نوتن تو ہی یہیں اتنی ہی آسانی اور روانی سے زندگی بسر کر رہا تھا جس آسانی سے مچھلی سمندر میں گھوما کرتی ہے۔ کیلاش اپنی مشکلات کا ذکر کرتا تو نوتن کہتا:

"دوست! اسی لئے تو میں نے تمہیں کہا تھا کہ کچھ عرصے تک مار کھانی پڑے گی اور یہاں کی مار بہت سخت ہے استاد! شکر کرو کہ میں اس دریا کا مگرمچھ پہلے ہی سے یہاں موجود ہوں ورنہ تمہیں چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا!"

کیلاش کو اس حقیقت کا اعتراف تو تھا ہی لیکن یوں بھی وہ اپنے دوست کی قابلیت کا قائل ہو گیا تھا۔ نوتن کی مالی حالت بھی مستحکم نہیں تھی اس کے اخراجات بہت بڑھے ہوئے تھے اور انہیں پورا کرنے کے لئے اسے خاصی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی تھی لیکن بقول خود وہ اس دریا کا نہنگ تھا۔ بیچارا کیلاش زندگی کی کشمکش میں نیا نیا گرفتار ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے ملازمت ملی وہ بھی عارضی۔ ابھی وہ اپنے پاؤں پر جم کر کھڑا بھی نہیں ہو سکا تھا

کہ قدرت نے تھپیڑے کھانے کے لئے پھر اسے بیچ دھارے میں پھینک دیا۔
سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ یہاں اُمید یقین کی حد تک اپنی جھلک دکھا کر دفعتہً آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ نوتن کے لئے یہ روزمرہ کی چیز تھی لیکن کیلاش کے اعصاب مضمحل ہو جاتے۔ ایک نہیں بیسوں مرتبہ ایسا ہو چکا تھا۔

ان دنوں وہ نوتن کے فلیٹ میں ہی ٹھہرا ہُوا تھا۔ ایک صبح جبکہ نوتن ناشتہ کئے بغیر ہی گھر سے نکل گیا تھا اور کیلاش ناشتہ کرنے کے بعد پلنگ پر لیٹا تازہ اخبار پڑھ رہا تھا کہ نوتن ایک دھماکے کے ساتھ کمرے میں آیا اور ہیٹ ہوا میں پھینکتے ہُوا بولا "لاؤ ہاتھ"

"کیوں خیریت؟"

"بھئی تمہارا ہمارا دونوں کا کام بن گیا ہے"

کیلاش ہمہ تن سوال بنا بیٹھا تھا۔ پھر امید نے سر اٹھایا۔ امید کئی دفعہ سر اٹھا چکی تھی یہ کوئی نئی بات نہیں تھی البتہ نوتن بلا ضرورت آپے سے باہر بہت کم ہوتا تھا۔ کیلاش بولا "یار چھوڑو یہ تمہید۔ اب غلط امیدیں باندھنے کے موڈ میں نہیں ہوں میں..."
نوتن نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اس کی ران پر ہاتھ مار کر کہا "نہیں میری جان! ___ جب میں لاہور گیا تھا تو ایک پارٹی سے سرسری گفتگو کر آیا تھا۔ اب وہی پارٹی پھر آگئی ہے۔ بھئی کیا بتاؤں ایک فلم کے ریلیز نہ ہونے کے باعث میری ساکھ میں فرق آگیا تھا۔ اس پارٹی کے آدمی پڑھے لکھے سمجھدار لوگ ہیں اور میری لیاقت کے قائل بھی ہیں۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب کے ایسی فلم تیار کروں گا کہ ایک بار تو تہلکہ مچ جائے گا"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"
"اب تمہیں میرا ہاتھ بٹانا ہوگا۔"
"اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ بالکل پکا ہو چکا ہے۔ . . ."
"ابھی ایک نششت کی بات اور ہے۔"
"بھئی یہ نششت ہی ہمیں لے کر بیٹھ جائے گی۔"
"ارے نہیں بھئی دیکھو میں پہلی بار اپنی جانب سے تمہیں امید دلاتا ہوں۔ بس گھبراؤ نہیں — آج ہم لنچ انہیں کے ہاں کھائیں گے اور تمہیں میرے ہمراہ چلنا ہوگا، میں نے تمہارا ذکر بھی کر دیا ہے۔"

ایک بجے کے قریب وہ اس پارٹی کے ہاں پہنچ گئے۔ کھانا کھانے کے بعد جو گفتگو ہوئی تو کیلاش کا سر چکرا گیا۔ اس پارٹی کے لوگ بہت دور اندیش اور سمجھ دار معلوم ہوتے تھے لیکن نوتن چونکہ اپنی لائن میں پورا پورا تجربہ رکھتا تھا۔ اس لئے بالآخر معاملہ طے ہو گیا۔ نوتن کو تو ڈائریکٹر DIRECTOR کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا اور کیلاش کو سات سو روپیہ ماہوار پر مستقل طور سے ملازمت دے دی گئی۔ اس کے علاوہ وہ ہر فلم کے مکالموں کے لئے اسے کچھ روپیہ یکمشت دینے پر بھی رضامند ہو گئے۔ یہ معاملہ طے ہوتے ہوتے پانچ بج گئے۔ لیکن جب وہ ہوٹل ہی سے نکلے تو خوش تھے۔ کیلاش بولا "بھئی بڑی کڑی بحث ہوتی رہی تم لوگوں کی لیکن آخر تم جیت گئے۔"

"ہاں دوست میرا اصول ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ جس کام کا بیڑا اٹھاؤ اسے پوری ایمانداری سے نبھاؤ۔ یاد رکھو ہمارے لئے سنہرا موقع ہے، آئندہ کے لئے اپنی مارکیٹ کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔"

"یہ تو درست ہے لیکن تم دیکھو گے کہ تم دوسرے پروڈیوسروں سے بھی روپیہ حاصل کر سکو گے، شرائط کے مطابق اور کنٹریکٹ بھی حاصل کر سکتے ہو۔"

بازار میں چلتے چلتے نوتن رک گیا اور بولا "آؤ یار سامنے والے پارسی ریستوران میں کافی پی کر ذرا تازہ دم ہو جائیں۔"

بادل چھائے ہوئے تھے، جب وہ ریستوران میں گھسے تو ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔

گرم گرم کافی کا گھونٹ پینے کے بعد نوتن نے تھری کیسلز سگرٹ کا طویل کش لیا اور اطمینان کے ساتھ آنکھیں موندتے ہوئے کہا

"آہا کیسا سہانا سماں ہے۔"

پھر جب دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں کھلیں تو ضرورت سے زیادہ کھل گئیں

"ارے ہلو ڈاکٹر تم کب آئے؟"

کیلاش نے گھوم کر دیکھا ایک تیس سالہ صفا چٹ چہرے والا مرد ایک حسین عورت کے نوتن سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

نوتن نے تعارف کرایا

"یہ میرے دوست مسٹر کیلاش۔ آپ ڈاکٹر راجن، آپ مسز راجن اور آپ ڈاکٹر صاحب کی ہمشیرہ مس کرن۔" بات چیت کرنے کے بعد وہ دوسری میز کے گرد جا بیٹھے۔

نوتن نے کہا "ڈاکٹر کی بہن کیسی حسین ہے۔ میں نے اسے فلمی دنیا میں لانا چاہا۔ لیکن وہ اس پر رضامند نہیں ہوئی۔"

"ان باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں عارضی طور پر آئے ہیں تو وہ لوگ کہاں رہتے ہیں" کیلاش نے دریافت کیا۔

۱۵

ستمبر ۱۹۴۵ء کے آخری دنوں میں کیلاش بمبئی آیا تھا۔ ابتدائی جدوجہد کے بعد جو اس کا ستارہ چمکا تو ۱۹۴۷ء کے خاتمے تک معقول پونجی جمع کر لی۔

اس دوران میں اوشا کی جانب سے ایک سطر بھی موصول نہیں ہوئی۔ وہ اس شوریدہ سر لڑکی کو بھلا نہیں سکا لیکن اس نے اسے خط نہیں لکھا۔ اس خیال سے کہ شاید وہ نئے ماحول سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ اب اسے چٹھی لکھنا گویا دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دینے کے مترادف ہوتا۔ ایک درد جو اس کے بدن کی رگ رگ میں سما گیا تھا اسے اس نے سمیٹ کر دل کے ایک گوشے میں مستقل طور پر جگہ دے دی تھی۔ وہ درد مٹا نہیں بلکہ عمیق ترین تہوں میں اترتا چلا گیا جہاں اسے ایک تیز کانٹے کی سی کھٹک محسوس ہوا کرتی تھی۔

بیوی سے البتہ خط وکتابت جاری رہی۔ اس کی بیوی خطوط کے معاملے میں اپنی عادت کے مطابق سرد مہری سے کام لیتی تھی۔ یوں تو ان میں سبھی باتیں ہوتی تھیں اس کے دکھ درد کی بابت سوال کئے جاتے، اس کے آرام اور صحت کے بارے میں ہدایتیں دی جاتیں لیکن ان میں تیزی و تندی نہیں ہوتی تھی۔ وہ مسکرا کر دل ہی دل میں کہتا، بالآخر یہی کچھ ہوتا ہے عورت اور مرد کے مابین۔ وہ میری معشوقہ نہیں ہے بیوی ہے۔ میں اس کی نظر میں جانباز عاشق نہیں ہوں اس کا شوہر اس کا دیوتا ہوں۔ اس

نقطۂ نظر کی جڑیں گہری اور دور اتری ہیں۔

بحیثیت مجموعی وہ مطمئن تھا۔ اوشا کی بابت صرف ایک ہی حسرت تھی کہ کاش اتنی سادہ لوح لڑکی نے اس سے اس قدر شدت سے محبت نہ کی ہوتی۔ اس کی محبت کس قدر تیز و تند اور منہ زور تھی۔ وہ اس محبت سے ڈرنے لگا تھا۔ اس کے ضمیر میں کانٹا تھا۔ کبھی کبھی اسے عجیب قسم کا احساسِ گناہ ہونے لگتا تھا۔ مانا اس لڑکی نے اس سے محبت کر ہی لی تھی تو اس نے اسے قبول کیوں نہ کر لیا۔ آخر وہ کیا چاہتا تھا۔

بمبئی میں کام بن جانے کے بعد کیلاش نے چاہا کہ رہنے کو مکان مل جائے تو وہ بیوی کو اپنے پاس بلا لے لیکن مکان نہ ملنا تھا نہ ملا۔ وہ خود بھی نوتن کے ہاں ٹکا رہا۔ بعد ازاں جب اسے معقول آمدنی ہونے بھی لگی تو نوتن نے یہ کہہ کر کہاں اکیلا مارا مارا پھرے گا ہوٹلوں میں یہیں ڈٹا رہ۔ اسے جانے نہیں دیا۔

بہر کیف اس نے مکان کی تلاش جاری رکھی۔ بمبئی میں مکان ملنا قریب قریب ناممکن تھا۔ اس دوران میں اسے بمبئی سے باہر نکلنے کی فرصت بھی نہ ملی اور نہ وہ بیوی کو اپنے پاس بلا سکا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیوی بھی نوتن کے فلیٹ ہی میں رہے۔ اس طرح ان کے گھر کی آزادی میں فرق آنے کا ڈر تھا۔

بالآخر فروری ۱۹۵۰ء میں ایک اچھا سا فلیٹ مل گیا۔ اس نے فوراً بیوی کو بمبئی چلے آنے کے لئے خط لکھ دیا۔

اسے تار ملا کہ بیوی فلاں روز اپنے بھائی کے ساتھ بمبئی پہنچ رہی ہے تو اس کا دل اچھل پڑا۔

ایک تصویر جو بیوی نے اس کے مانگنے پر چند ماہ پہلے بھیجی تھی اس کی میز پر

پڑی رہتی تھی۔ وہ اسے دیکھتا تو اسے خیال آتا کہ کاش اونتا والا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو وہ اس قدر خوبصورت بیوی پاکر کتنا خوش ہوتا۔

اب وہ انتظار کی گھڑیاں گننے لگا۔

روزِ مقررہ کو وہ اسٹیشن پر گیا۔ گاڑی آئی۔ پل پل بعد اسے مایوسی ہوئی۔ وہ بے تابی سے ادھر اُدھر تاک رہا تھا کہ آواز آئی

"جیجا جی"۔

یہ اس کے سالے کی آواز تھی۔

گھوم کر دیکھا تو اس نے انہیں اپنے روبرو پایا۔ اس وقت وہ بیوی کو اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھ سکا۔ جب وہ ٹیکسی میں ساتھ ساتھ بیٹھے تو اس نے بیوی کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ ویسی ہی حسین تھی، ویسی ہی دلربا۔ البتہ اس کا چہرہ قدرے زرد پڑ گیا تھا۔ ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد ہلکے ہلکے سیاہ حاشیے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ہنسا تو بیوی بھی مسکرا دی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہو "کتنے ظالم ہیں آپ، شادی کے چند مہینے بعد مجھے چھوڑ کر چل دیئے اور پھر لگ بھگ ڈیڑھ برس تک صورت نہیں دکھائی۔ ذرا میری جانب دیکھو میرا کیا حال ہے۔ میرے جسم کا رنگ اور میری آنکھیں دیکھیے۔ ایسا ظلم تو کوئی نوخیز حسینہ برداشت نہیں کر سکتی۔ . . ."

کیلاش نے جرم کا اقرار کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔ لیکن اس نے سوچا کہ اب اس کے پاس کچھ پیسہ ہے، وہ اپنی بیوی کے من کی ہر تمنا کو پورا کرے گا اور اس کے جیون کو سکھی بنا دے گا اور ایک بار پھر اس نے بیوی کو تاکتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

صحت قدرے گر جانے سے اس کے حسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ پیاری لگنے لگی ہے۔

اس کا سالا دو روز کے بعد واپس چلا گیا۔ بیچارا دفتر سے چھٹی لے کر آیا تھا۔ زیادہ دنوں تک رہنے سے معذور تھا۔ تقریباً دو ہفتے انہوں نے بڑے آرام اور اطمینان سے بسر کئے۔ فرصت کا ایک ایک لمحہ کیلاش بیوی کی قربت میں گذار رہا تھا۔ ایک روز وہ گھر واپس آیا تو دیکھا کہ بیوی پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ طبیعت متلاتی ہے اور پیٹ میں سخت اینٹھن ہو رہی ہے۔

وہ اسے فوراً لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے بند کمرے میں معائنہ کیا۔ اور پھر ہنستی ہوئی باہر آئی اور چہک کر بولی۔

"اوہ مسٹر کیلاش! گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔ ۔ ۔ آپ کی بیوی حاملہ ہیں"۔

"حاملہ" کیلاش نے چلا کر پوچھا "کب سے؟"

لیڈی ڈاکٹر اس دوران میں نرس سے بات کرنے لگی تھیں اس نے اس کے الفاظ تو سن لئے لیکن لہجے کی جانب دھیان نہیں دیا۔

نرس سے فارغ ہو کر اس نے کہا "یہی تین یا چار مہینے کا ہے ۔ ۔ ۔ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ انہیں ذرا زیادہ جسمانی محنت سے بچا کر رکھئے"۔

۱۶

ہسپتال سے واپس آ کر کیلاش نے بیوی سے کوئی بات نہیں کی۔ البتہ اسے چھوڑ کر باہر نکل گیا ۔ ۔ ۔ وہ کچھ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کہاں جائے۔ کسی دوست کے ہاں

جانے میں یہ خدشہ تھا کہ اس کی اداس صورت دیکھ کر اس کی وجہ پوچھی جائے گی
چنانچہ وہ تن تنہا چوپاٹی جا پہنچا اور ایک الگ تھلگ سی جگہ پر گوشہ گیر ہوکر
بیٹھ رہا۔

وہاں وہ سمندر کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کاش وہ ایک وسیع
سمندر ہوتا اس کی نگاہیں بے دریغ افق کی کپکپاتی ہوئی دھندلی لکیر تک پہنچ سکتیں
لیکن یہاں بیسوں چیزیں راہ میں حائل تھیں جن سے آنکھوں میں چبھن سی محسوس ہوتی تھی۔
اس نے سوچنا ترک کر دیا یا شاید اس کی سوچنے کی قوت زائل ہو چکی تھی۔

رفتہ رفتہ دن ہفتے اور مہینے بڑی سست رفتاری کے ساتھ گذرنے لگے۔
ان کی چبھن عظیم الجثہ آرے کے دندانوں سے زیادہ شدید اور اذیت دہ تھی۔ میاں
بیوی دونوں کے ہونٹوں پر چپ سی لگ گئی تھی۔ شوہر نے اپنے بشرے سے کچھ
ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بیوی کے چہرے کی رونق اڑ گئی تھی لیکن حقیقت اس حد تک
ظاہر تھی کہ اس نے اپنی صفائی میں کچھ ضرورت نہیں سمجھی۔ کام کے وقت وہ مصروف
رہتی اور بوقت فرصت منہ پر کپڑا ڈال کر چارپائی پر لیٹ جاتی۔

اب کیا ہوگا؟

آنے والے بچے کے تصور ہی سے اس کی روح کانپ جاتی تھی۔ کبھی اس کا
دل چاہتا کہ بیوی کو چپ چاپ میکے بھیج دے۔ کبھی سوچتا کہ اس کے والدین کو خط
لکھ کر سارا حال ان پر ظاہر کر دے۔ لیکن ہر طرح سے اس کی جان آفت میں تھی اگر
وہ اپنے والدین پر یہ راز ظاہر نہ کرے تو پھر وہ لڑکی کے میکے بھیجے جانے پر اعتراض
کریں گے، الٹا اسے عیاش سمجھیں گے اور اگر وہ بھید کھول دے تو انہیں نہ جانے

کتنا رنج ہو۔ بالخصوص اس کی ماتا جی کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ اپنی بہو سے بے حد محبت کرتی تھیں، اس کی بلائیں لیتی نہیں تھکتی تھیں۔ ان کی معصوم آتما تو لرز کر رہ جائے گی۔ جوں جوں بات پھیلے گی ـــ آخر بچہ تو وہاں بھی جا کر پیدا ہوگا۔ راز فاش ہوگا ہی ـــ تو پھر اس میں سبھی کی بدنامی کا احتمال تھا۔

اسی ادھیڑبن میں وقت گذرتا گیا۔ یہ تو غنیمت تھا کہ وہ اپنے شہر سے دور پردیس میں تھے ورنہ اب تک یہ خبر دور دور تک پھیل گئی ہوتی۔

انتہائی دکھ اور اذیت کے تین ماہ گذر ہی گئے۔ بعض اوقات جبکہ انسان کے چاروں جانب تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے۔ راستہ سجھائی نہیں دیتا، تو روشنی کی کرن نامعلوم سمت سے چمک اٹھتی ہے . . . شاید اسی ضمن کی کسی وجدانی کیفیت کے تحت کیلاش اس بارے میں خاموش تھا۔

اب حاملہ کو سات مہینے ہو چکے تھے کہ دفعتہً اس کی طبیعت خراب ہوئی اور درد کے مارے وہ نیم بیہوش ہوگئی۔ اسی حالت میں اُسے ہسپتال لے جایا گیا وہاں اسے لیڈی ڈاکٹر کے سپرد کر دیا گیا۔

ڈاکٹر کمرے کے اندر مریضہ کا معائنہ کر رہی تھی اور کیلاش سر نیچے ڈالے باہر بنچ پر بیٹھا تھا۔

کافی دیر کے بعد ڈاکٹر باہر آئیں اور بولیں کہ کیس خطرناک معلوم ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اپریشن کرنا پڑے گا۔

بہت ارجنٹ URGENT اپریشن کی تیاریاں ہونے لگیں

کیلاش کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اب جبکہ بچہ معرض وجود میں آنے والا تھا۔

کیلاش نے سوچا، بچہ پیدا ہو جانے پر کیوں نہ ماں کو بمبئی میں بلا یا جائے۔ سب حال معلوم ہونے پر جو ان کا جی چاہے سو کریں۔ آخر یہ دُکھ انہیں کبھی نہ کبھی تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ . . لیکن . . . لیکن وہ قطعی فیصلہ نہ کر سکا۔

اپریشن کا ایک ایک لمحہ گذارنا اس کے لیئے دوبھر ہو رہا تھا۔ اپریشن روم میں موت کی سی، خاموشی طاری تھی، اگر کوئی کمرے میں داخل ہوتا تو چپ چاپ اور اگر باہر آتا تو اس کی جانب دیکھے بغیر ایک سمت کو نکل جاتا۔

وہ جاننا چاہتا تھا کہ اپریشن اب کس منزل پر ہے۔ کون کیا کر رہا ہے۔

بظاہر وہ جتنا الگ تھلگ اور خاموش بیٹھا تھا بباطن اتنا ہی بے چین اور بے قرار تھا۔ وہ دلربا عورت . . . اس کی بیوی . . . اس کی پناہ گاہ تھی۔ وہ نہ جانے کس کس دُکھ سے گھبرا کر اس کے پاس پہنچا تھا . . . اور آج وہ نہ جانے کس کے بچے کو جنم دے رہی تھی . . .

شاید وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ شاید وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی یا شاید اس کے عاشقوں کی کوئی انتہا ہی نہیں تھی۔ شاید وہ فاحشہ تھی شاید یہ محض ایک جذباتی اور کمزور لمحہ کا نتیجہ تھا . . . لیکن اتنے مہینوں تک وہ اپنے مُنہ سے اس بارے میں ایک لفظ تک کیوں نہیں کہہ سکی۔ اس نے اپنی صفائی کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی . . . درحقیقت اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اسے اس قدر ہیچ سمجھتی تھی کہ اس نے اس کے بارے میں کچھ کہنا یا نہ کہنا برابر سمجھا . . . .

کیلاش کا ذہن کھول رہا تھا۔

اتنے میں ڈاکٹر باہر آئیں۔ "مسٹر کیلاش مجھے بے حد افسوس ہے کہ . . ."

کیلاش نے سر اوپر اٹھایا ۔ ۔ ۔ لفظ گیا اس کے حلق میں سے نکل نہیں سکا ۔ البتہ اس کے پھیکے اور ڈھیلے ہونٹ لرز کر رہ گئے ۔ ۔ ۔

"بچہ مردہ پیدا ہوا ہے" یہ کہہ کر ڈاکٹر نے ہمدردی سے کیلاش کی جانب دیکھا اور پھر قدرے تامل کے بعد بوجھل آواز اور مایوس کن لہجے میں کہا ۔ ۔ ۔ "زچہ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش جاری ہے"۔

۱۷

ڈاکٹر کیلاش کی بیوی کو نہ بچا سکے ۔

وہ ماہ پارہ صابن کے حسین و جمیل بلبلے کے مانند فضا میں ایک لمحہ کے لئے اُبھر کر تحلیل ہو گئی ۔

ناجائز بچے اور بے وفا بیوی دونوں سے اس طرح پیچھا چھوٹ جانے سے کیلاش کے ذہن سے بوجھ سا ہٹ گیا ۔

لیکن بعد ازاں اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بد روح اس کے جسم میں گھر کر گئی ہو ۔ مرحومہ اس کی بیوی کی حیثیت سے گنہگار سہی مگر کیا اس کے سینے میں دل نہیں تھا دل میں جذبات کے کیسے کیسے طوفان نہ اٹھتے ہوں گے ۔ نہ جانے وہ کس منزل تک پہنچنا چاہتی تھی ۔ صد افسوس اس نے منہ سے ایک لفظ تک نہیں کہا اور نہ اس راز سے پردہ ہی اٹھایا ۔

پھر وہ اپنے خیالات اور احساسات کا تجزیہ کرنے لگا ۔ اس کے جو بھی خیالات ہوں لیکن اس نے بیوی سے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے اس کے دل کو

رنج ہوا ہو، خواہ وہ بحیثیت بیوی کے اسے اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہ ہوتا لیکن وہ اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کی فکر میں بھی نہ تھا۔ وہ اسے پوری آزادی دینے کو تیار تھا بلکہ اگر وہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی تو اسے چاہئے تھا کہ اس سے شادی کرنے پر رضامند ہی نہ ہوتی — لیکن . . . . اس کی موت میں تو اس کا کوئی ہاتھ نہ تھا اس نے اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود اگر وہ مر گئی تو اس کا کیا قصور۔

پہلے کچھ روز وہ بے حد پریشانی میں گرفتار رہا تھا۔ ایک بڑے حادثے کے بعد اس نے شادی کی تھی لیکن وہ پورے طور پر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ بیوی نے اسے ایک ایسا جذباتی دھکا دیا کہ جس سے بڑھ کر اور کوئی دھکا بیوی خاوند کو نہیں دے سکتی۔

نوتن اصل معاملے سے بے خبر تھا۔ وہ صرف یہی سمجھتا تھا کہ بیوی کی اچانک موت نے اس کے دوست کا دل توڑ دیا ہے۔ اس نے گھنٹوں باتیں کر کے تسکین دینے کی کوشش کی۔ آج ویشنو کے مندر والوں کی پہلی فلم "رجنی" کا مہورت تھا۔ نوتن نے اسے زور دے کر کہا تھا کہ اسے مہورت میں شامل ہونا ہو گا اور وہ خود اسے لینے کے لئے آئے گا۔

جب اس کی بیوی نئی نئی بمبئی میں آئی تھی تو اس کے دم سے اس فلیٹ میں کتنی رونق دکھائی دیتی تھی۔ کمرے کی ہر شے پر اس کے حسن کا پرتو دکھائی دیتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ جگمگاہٹ چند دنوں کی مہمان ہے۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

کاش! . . . .

ابھی وہ پورے طور سے تیار بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ نیچے سڑک سے نوتن کی کار کے ہارن کی مخصوص قسم کی صدائیں سنائی دینے لگیں اور نوتن خود شور مچاتا اور پھنکارتا اوپر آن پہنچا۔ "ارے یار! چلو نا۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔"

کیلاش نے مسکرا کر اس کی ٹائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیوں بھئی یہ شعلہ سی ٹائی لگانے میں کیا راز ہے۔"

"کچھ نہیں۔ ۔ ۔ راز کیا ہوتا۔ ۔ ۔ ارے شک ہے کسی بہانے سے تمہارے منہ پر رونق تو آئی۔ ۔ ۔ بہت دنوں کے بعد مسکرائے ہو آج۔"

مورت کی رسم کے موقع پر کیلاش کی طبیعت کچھ بجھی سی رہی۔ وہاں سے چلتے وقت نوتن نے کہا "تم نے عجیب چپ سادھ رکھی ہے۔ میں سمجھے بیٹھا تھا کہ آج تم خوش ہو ۔۔۔ بھلے مانس اس طرح اپنے آپ کو جلتا کی چتا میں مت جلاؤ۔"

کیلاش نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا "اچھا اب کہاں جا رہے ہو۔ ۔ ۔ مجھے گھر چھوڑ آؤ نا پہلے۔"

"نہیں ویر آج ایک فیملی کو کھانے پر مدعو کیا ہے میں نے۔ تمہیں بھی شامل ہونا ہوگا۔"

"ارے نہ بھائی میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔"

"موڈ ٹھیک کرنا ہوگا تمہیں۔ دیکھو میری آبرو رکھ لینا میں نے تمہاری ذہانت اور حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی کی بہت تعریف کر رکھی ہے ان کے سامنے۔"

"میری جان نہ پہچان۔ ۔ ۔ کیوں فضول میں پریشان کرتے ہو مجھے۔"

"اخاہ! یہ ہیں ڈاکٹر راجن ہیں جن سے ایک دفعہ ریستوران میں ملاقات ہوئی تھی۔

سرسری سی۔ کوئی تین ساڑھے تین مہینے کی بات ہی تو ہے . . . . ارے وہی گاؤں والے ڈاکٹر راجن۔"

کیلاش کو کچھ کچھ یاد آرہا تھا۔ اگرچہ وہ جاننا نہیں چاہتا تھا لیکن نوتن سے بحث کرنا فضول سمجھ کر چپ ہو رہا۔

گھر پہنچے تو ڈاکٹر راجن کو معہ بیوی اور بہن کے اپنا منتظر پایا۔ ڈاکٹر صاحب نوتن کو دیکھتے ہی بولے۔

"لو بھئی اسے کہتے ہیں مدعی سست گواہ چست۔ مہمان گھر پر تشریف فرما ہیں اور جناب میزبان آگے آگے بھاگے پھرتے ہیں۔"

"یار معاف کرنا . . . ایک مہورت میں شامل ہو گئے تھے۔ حالانکہ ہم پوری کاروائی میں بھی حصّہ نہیں لے سکے۔"

فضا مردانہ قہقہوں اور نسوانی آوازوں سے گونج اٹھی تھی۔

سب لوگ میز کی جانب بڑھے۔ نوتن نے کہا "میرے دوست کیلاش ہیں۔ آپ ان سے تین یا ساڑھے تین مہینے پہلے متعارف ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد آپ لوگ واپس چلے گئے۔ اچھا کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟"

ڈاکٹر صاحب بولے "اب کے تین چار ماہ لگ جائیں گے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

کیلاش نے دیکھا کہ ڈاکٹر لگ بھگ چھبیس برس کا جوان اور خوش رو شخص ہے۔ اس کی گوری چٹی بیوی بھی دلکش صورت کی مالک تھی۔ اس کی اونچی اور ذرا اوپر کی جانب سے کمان کی طرح اٹھی ہوئی ناک اس بات کی شاہد تھی کہ وہ اونچے خاندان کی فرد تھی

اُن کا بچہ بھی خوبصورت پیارا سا تھا۔

ڈاکٹر کی بہن کرن بلا کی حسین تھی۔ میک اَپ سے مبرا، سادہ پوشاک میں اُس کا حُسن پھوٹا پڑتا تھا۔ بالخصوص اس کے گلابی ہونٹوں پر چنبگلی گلاب کی کلیوں کا دھوکا ہوتا تھا۔

فضا اس قدر خوشگوار تھی کہ کیلاش گھڑی بھر کو اپنے غم بھلا بیٹھا۔ جب وہ ہنستی تو منہ سے پھول جھڑنے لگتے اور سب لوگ اس کی باتوں سے بے حد محظوظ ہوتے۔ کرن کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہو گیا ــــ وہ تو گویا کھِلی کھِلا کر ہنسنے کے لئے محض ایک حیلے بلکہ اشارے کی منتظر معلوم ہوتی تھی۔

۱۸

انہی دنوں پنجاب سے فسادات کی خبریں آنے لگیں۔ شروع شروع میں تو انہیں کوئی اہمیت نہیں دی گئی لیکن تقسیم ہندوستان کے بعد بڑے پیمانے پر فسادات کی اطلاعات آنے پر کیلاش کو والدین کی فکر لاحق ہوئی۔

شروع اگست ۱۹۴۷ء میں وہ پنجاب جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ والد کا خط ملا:

برخوردار کیلاش!

جیتے رہو

تمہیں اطلاعاً چند سطریں لکھ رہا ہوں کہ تم پنجاب آنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں نے احتیاطاً چند ماہ پیشتر دہلی میں ایک مکان اور ایک

دکان کرائے پر لے لی تھی۔ کچھ سامان بھی وہاں پہنچا دیا تھا۔ اب ہم بھی پنجاب سے بصد دشواری نکل آئے ہیں۔ بنک کا روپیہ بھی ٹرانسفر ہو گیا ہے لیکن افسوس کہ ذاتی مکان اور زمین کا کچھ انتظام نہیں کر سکے۔ اتنی امید تو تھی نہیں کہ یہ حال ہوگا۔

باقی گھر کے لوگ بالکل خیریت سے ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں بہو کے سورگباش ہو جانے سے تمہاری ماتا جی بہت اداس رہتی تھیں اور پھر ادھر سے مصیبتیں، اگر ہو سکے تو ہمیں دہلی میں آن کر مل جاؤ۔

شرما جی کے خاندان کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ لاہور میں حالات بگڑ رہے ہیں۔ میں نے انہیں خط ڈال دیا تھا۔ آتی دفعہ ہم لاہور نہیں اتر سکے۔ کیونکہ فضا بہت بگڑی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ پہلے ہی چلے آئے ہوں۔ صحیح خبر کا ابھی انتظار ہے . . . "

یہ خط پاکر کیلاش کے دل کو یک گونہ تسکین حاصل ہوئی اور اس نے جواب میں لکھا کہ ایک ہفتے کے بعد آؤں گا۔ ہاتھ میں تھوڑا سا کام تھا اس نے سوچا کہ اسے نپٹا کر چلا جاؤں گا۔

بالآخر جب وہ دہلی پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں کی دنیا میں انقلاب آچکا ہے پنجاب میں فرقہ دارانہ بربریت کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ جس کی آنچ دہلی تک محسوس ہونے لگی۔

ماں کو بہو کے مر جانے کا بے حد رنج تھا۔ اپنے نوجوان بیٹے کے رنڈوے ہو جانے سے اس کے دل میں ہول پڑ رہا تھا۔ اس نے دبی زبان سے دوسری

شادی کا ذکر کر دیا لیکن کیلاش نے منہ پھیر لیا اور چپ ہو رہا۔ وہ اس قصہ کی باتیں سننے تک کے موڈ میں نہیں تھا۔

شرما جی کے خاندان کی اس وقت تک کوئی خبر نہیں ملی تھی۔

دہلی سے لوٹ کر جی آئے ایک مہینہ ہی گذرا ہوگا کہ اسے منڈل کی ایک طویل چٹھی موصول ہوئی۔ لکھا تھا:-

ڈیئر کیلاش!

چند دن گذرے کہ مجھے تمہارے دہلی آنے کی خبر ملی۔ تم آئے اور چلے گئے۔ میں اسی دم سے تمہیں چٹھی لکھنے کی فکر میں تھا لیکن جن آفتوں کا سامنا ہے ان کی موجودگی میں خط نہ لکھ سکنا کوئی گناہ نہیں ہے اور شاید کچھ دن اور اسی طرح ٹل جاتے لیکن آج دوپہر میں نے ایک ایسی خبر سنی ہے جسے تم تک پہنچانا بہت ضروری ہے۔

آج کل میں دہلی میں ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ پنجاب سے جو شریف آدمی بھاگ نکلتا ہے دہلی آن کر ہی دم لیتا ہے —— ایک آدمی جو کچھ دنوں فسادیوں کے نرغے میں رہ چکا ہے مجھے ملا اور اس نے اوشا کی بابت مندرجہ ذیل واقعہ بہت طول دے کر سنایا تھا۔ خدا جانے یہ سچ بھی ہے یا نہیں لیکن جو کچھ سنا لکھ رہا ہوں۔

یہ شخص اوشا کے سسرال میں رہتا تھا۔ آج سے ڈیڑھ مہینہ پہلے وہاں کی فضا بھی بہت خراب ہو گئی تھی۔ اقلیت کو اپنی عزت اور آبرو تک خطرے میں دکھائی دینے لگی۔ سارے صوبے میں جنگ و جدل کی آگ

بھڑک اٹھی تھی چنانچہ اس چھوٹے سے قصبے کی باری بھی آن پہنچی۔

حالات ایسے تھے کہ وہاں سے بھاگ کر نکلنا بھی مشکل تھا۔ ایک روز فسادیوں نے قصبے پر ہلہ بول دیا اور اوشا کے خاوند کو قتل کر دیا کیونکہ وہ ہندو سنگھ کا ممبر تھا۔ سنا ہے کہ ان کے گھر والوں میں سے کوئی نہیں بچا۔ صرف اوشا کو معہ دیگر نوجوان عورتوں کے وہ اپنے ہمراہ لے گئے۔ ان میں صرف ایک مرد تھا (یعنی یہی واقعہ سنانے والا) اسے زندہ لے جانے میں مصلحت یہ تھی کہ اس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اسے قصبے کے ساہوکار کے دبے ہوئے خزانے کا علم تھا۔

ادھر خبر آئی کہ ہندوستان کے سپاہی پاکستانی افسروں کی مدد سے اغوا شدہ عورتوں کو برآمد کرتے پھر رہے ہیں تو ایک جاں نثار نے ان سب عورتوں کو کھیتوں میں لے جا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اسی رات اس شخص کو وہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔۔۔

کیلاش اس سے آگے خط نہ پڑھ سکا۔۔۔۔

۱۹

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہوا میں خشکی تھی اور کیلاش کوٹ کے اٹھے ہوئے کالروں میں کان چھپائے سیٹی بجاتا ایک کشادہ بازار میں چلا جا رہا تھا۔

آج کل وہ اپنے آپ سے جنگ کر رہا تھا۔ اوشا کی موت کی خبر سن کر اس کا دل بجھ گیا تھا۔ اب زندگی میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ایک بہت بڑا سیاہ بادل

اس کی روح پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ انسانی زندگی دکھوں کا ایک پلندہ ہے جس میں کسی انسان کو سکھ کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ مرنے کے بعد جو ہو سو ہو۔ بعض اوقات جب اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ پاگل ہو جائے گا تو وہ سیٹی بجانے لگتا یا بازاروں میں گھومنے لگتا یا کسی بارونق ریستوران میں بیٹھ کر وقت گزارتا۔

اسے اوشا کی وفات کی خبر ملے دو ہفتے سے اوپر گذر چکے تھے لیکن ابھی تک اس کے حواس ٹھکانے پر نہیں آئے تھے۔ مثلاً وہ بالکل بھول گیا تھا کہ آج اسے نرمل کے ہمراہ ڈاکٹر راجن کے ہاں ڈنر کھانے کے لئے جانا ہے۔

ہاکمنز بڑے ہوٹلوں کے مقابلے میں چھوٹا تھا۔ اس میں پچاس کے قریب میزیں بچھی تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہاں دو سو آدمی آسانی سے بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔

کیلاش اندر داخل ہوا اور ایک کونے میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گیا۔ ان دنوں پنجاب کے فسادات گفتگو کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ اس سے کیلاش کو اور زیادہ الجھن محسوس ہوتی تھی۔

کافی اور تمباکو کی بو سے فضا بوجھل ہو رہی تھی۔ باہر بارش اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ ہال کے بیچوں بیچ ایک چائے پارٹی ہو رہی تھی۔ شامل ہونے والوں میں لڑکے بھی تھے اور نوجوان اور نوخیز لڑکیاں بھی۔

کیلاش کی توجہ اس گروہ کی جانب مبذول ہو گئی۔

دفعتہً ایک صاحب اٹھے۔ گورا رنگ، اونچی ناک، ٹھوڑی پر داڑھی یعنی فرنچ کٹ۔ دانتوں میں سگار۔ ہاتھ میں گورگز۔ پہلے انہوں نے کھانس کر نہ صرف گلا صاف کیا بلکہ

لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا اور پھر یوں تقریر کرنے لگے۔

ساتھیو!

ان دنوں ہمارے ملک میں خون کی جو ندیاں مذہب کے نام پر بہائی جا رہی ہیں ہندوستان کی پیشانی پر ایسا کلنک کا ٹیکا ہے جو اپنی بدنمائی کی وجہ سے اس چھوٹے سے برِ اعظم کے رہنے والے ہر انسان کا سر رہتی دنیا تک نیچا رکھے گا۔ لیکن اہلِ بصیرت حضرات کو پہلے ہی سے اس خونی ہولی کی خبر تھی۔

جن لوگوں نے انگریز سرمایہ داروں کی ذہنیت کا مطالعہ کیا ہے۔ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک روز ان کی ریشہ دوانیاں رنگ لائیں گی جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ قتل و خون تو شاید اشرف المخلوقات کے لئے قابلِ معافی ہے لیکن جس شرمناک طریقے سے قتل و غارت کا بازار ہمارے یہاں گرم ہوا یہ یقیناً قابلِ صد لعنت ہے۔ اگر پاکستان میں ہماری بہو بیٹیوں اور ماؤں کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی تو ہم نے کونسی ان کی ماؤں اور بہنوں کی بے حرمتی میں کسر اٹھا رکھی ہے اور یہ بات پاکستانیوں کے لئے بھی باعثِ شرم ہے اور ہمارے لئے بھی۔ ہم انسانوں سے جانور بن گئے حالانکہ ایک وقت تھا جب ہم جانوروں سے انسان بنے تھے"۔

محض انگریزوں پر الزام دھرنے سے ہمارے کندھوں سے ذمہ داری کا بوجھ ہلکا نہیں ہو جاتا ہے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جاہلیت، بربریت، مذہبی تنگ نظری اور تعصب کی بنا پر ہم دنیا کی غیر متمدن اقوام

سے بھی گرے ہوئے ہیں۔"

"اس وقت میں اس سلسلے میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن مجھے دوستوں کو اس بات کا احساس دلانا ہے کہ ہمارا ملک دنیا کا غریب ترین ملک ہے۔ دنیا میں مٹھی بھر دولت مند انسانوں نے اپنے بھائیوں کے بھوک کے مارے ہوئے ڈھانچوں پر جگمگاتے ہوئے محل کھڑے کئے ہیں۔ پسینہ کہیں اور بہتا ہے اور حلوہ پراٹھا کہیں اور نگلا جاتا ہے۔ شب کی محنت سے ہلکان کوئی ہوتا ہے اور مسرت و اطمینان کے قہقہے کوئی اور بلند کرتا ہے۔"

"آج کوہ ہمالیہ کی چوٹی سے لے کر راس کماری تک ہمارا دیش آزاد ہو گیا۔ وہ غیر ملکی گدھ جو ہمارے وطن کو اپنے تیز پنجوں میں صدیوں سے دبوچے بیٹھا تھا آج اپنی موت آپ مر گیا ہے۔ اگرچہ مرتے مرتے ایک ایسا چرکا بھی دے گیا ہے جو ہمیں روز ابد تک نہیں بھولے گا!

"دیش آزاد ہوا ـــ اب کسان بھی آزاد ہونا چاہیئے ـــ اب مزدور بھی آزاد ہونا چاہیئے ـــ اب گلیوں میں گھومنے والا عام انسان بھی آزاد ہونا چاہیئے . . . . .

اس مرحلہ پر نوجوانوں کو کمر ہمت باندھنی چاہیئے ـــ آزادی بوڑھے لیڈروں کی محنت اور نوجوانوں کی قربانیوں سے حاصل ہوئی ہے ـــ اور اب آزادی کی برکتیں لانے کے لئے نوجوانوں کو ہمت کرنی چاہیئے۔

"کیا اب بھی کوئی ایسا نوجوان ہے جو اپنے وطن کے کروڑہا انسانوں
کی بھوک اور پیاس سے بے خبر ہے؟"
ہال پر کیلاش کو یوں محسوس ہوتا جیسے مقرر کا روئے سخن خاص اس کی جانب ہے
اس کی آواز گونج رہی تھی۔
. . . "جو زندگی کے تلخ حقائق سے چشم پوشی کرکے جیتا ہے۔۔۔
ہے، جو ہماری بھوکی، پیاسی، لڑکھڑاتی چیختی چلاتی زندگی کی۔۔۔ کی اس کا
سن کر اس کان سے اڑا رہا ہے تو میں ایسے نوجوان کو جھنجھوڑ کر جگا دینا
چاہتا ہوں . . . .
ساتھیو! آؤ ہم میں سے ہر شخص مشعل ہاتھ میں لے کر اور آستین
چڑھا کر زندگی کو غلاظت، ظلم، بیماری، بھوک، پیاس اور احتیاج سے
آزاد کردے . . . . آؤ ہم نئی صبح کا استقبال کرنے کے لئے
خود کو تیار کریں"
ہال تالیوں سے گونج اٹھا
بات معمولی تھی لیکن کیلاش کے دل و دماغ پر اس کا گہرا اور خوشگوار اثر
ہوا۔ چائے پینے کے بعد اس نے دیکھا کہ دھوئیں کے مرغولوں میں نوتن اور
راجن اس کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ نوتن نے اسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا "آخر
پایا تمہیں"۔ علیک سلیک کے بعد ڈاکٹر راجن نے کہا "آپ نہ ملتے تو ہمارے
ذہن بالکل ہی جاتا رہتا۔ کرن اب بھی آپ کی باتیں یاد کرتی ہے تو لوٹ پوٹ
ہوجاتی ہے"

کیلاش اٹھا اور ان کے ساتھ ہولیا۔

رکمن!!

۳۰

کرن نے دروازے پر ہی ان کا استقبال کیا۔

ڈاکٹر راجن بولے "کرن انہیں ساری ممبئی چھان مارنے کے بعد تلاش کرکے لائی ہیں۔ اب تو انہیں کچھ انعام ملنا چاہئیے۔"

کرن کھل کھلا کر ہنس پڑی اور بولی "یہ اپنا انعام آپ ہیں۔ ان کے دم سے محفل میں جب رونق اور رنگینی پیدا ہوگی تو آپ کی ساری تکان دور ہو جائے گی۔"

"دیکھا مسٹر کیلاش! میں نہ کہتا تھا کہ کرن تمہاری بڑی مداح ہے۔ اس نے تمہاری دو تین کتابیں بھی پڑھ ڈالی ہیں۔ اسی لئے قائل ہوگئی ہے۔"

ڈاکٹر راجن کے خاندان کے ساتھ کیلاش کی خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ کیلاش اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کے باعث ان میں خاصا مقبول اور محبوب ہوچکا تھا۔ شعبہ رونہ اگرچہ ایک کانٹا سا دل میں کھٹکا کرتا تھا، تاہم جب کبھی محفلوں میں بیٹھتا تو یہ اپنی خوش طبعی عود کر آتی۔

سگریٹ وغیرہ جلانے کے بعد وہ لوگ صوفوں میں دھنس گئے۔ نوتن نے دھواں اڑا کر پوچھا "اب یہ بتاؤ کہ کھانے میں کتنی دیر باقی ہے — ہماری تو آنتیں موتہ رہی ہیں بھوک سے . . . ."

مسز راجن بولیں "معاف کیجئے گا۔ یہ ہوٹل ہے اپنا گھر ہوتا تو آپ کو ایک منٹ

ہیں کھانا کھلا دیتی۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "ارے چھوڑ دبھی اس سے معافی مانگتی ہو۔ اسے ہم سے زیادہ بھوک تو نہیں لگی ہے۔"

"ارے واہ ڈاکٹر! مجھے بالکل کتے کی طرح دوڑایا تم نے ساری بمبئی میں۔ کہتے تھے یار کیلاش کے بغیر لطف نہیں آئے گا ـــ ادھر اسے دیکھیے۔ اس کی خاطر ہم ہلکان ہو گئے ہیں اور وہ کیسے بیٹھا ہے جھک مار کے۔"

کرن کام سے باہر گئی تھی۔ اندر داخل ہوتے وقت اس نے نوتن کی بات سن لی۔ چمک کر بولی "بھئی انہیں مت چھیڑو۔ بیچارے آپ ہی پریشان ہیں۔"

نوتن ایسا سنہرا موقع ہاتھ سے کب دینے والا تھا۔ بولا "ت ت . . تاں بھئی۔

"کوئی کچھ نہ کہے میرے دیوانے کو۔"

اس پر زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ کیلاش بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

سب لوگ یہی سمجھتے تھے کہ بیوی کی موت نے کیلاش کو پریشان کر رکھا ہے دیگر واقعات کا انہیں علم نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اس کا دل بہلانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

اطلاع ملی کہ کھانا میز پر چن دیا گیا ہے۔

سب لوگ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کھانا شروع ہوا تو ساتھ ہی قہقہے پہ قہقہہ اٹھنے لگا۔ کیلاش سے فرمائش کی گئی کہ کھانے پر کوئی لطیفہ

ہو جائے۔

قدرے تامل کے بعد کیلاش نے کہنا شروع کیا: ایک مرتبہ ایک صاحب نے تین پیٹوؤں کو کھانے پر بلایا۔ چنانچہ چاروں اصحاب کھانا کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ میزبان کھا کر فارغ ہو گیا لیکن تینوں مہمان بیٹھے رہے۔ ان کی خاطر میزبان کو بھی دکھاوے کا ساتھ دینا پڑا لیکن وہ بلا تکان کھاتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ زیادہ کھا جانے کے باعث ایک مہمان کرسی پر سے گرا اور چشم زدن میں تڑپ کر مر گیا۔ باقی دونوں بلا تکلف جٹے رہے۔ آخر دوسرے کا بھی یہی حشر ہوا اور میزبان نے دیکھا کہ تیسرا مہمان ساتھیوں کے حال سے بے خبر کھانے میں محو ہے۔ اب میزبان سے نہ رہا گیا۔ اس نے ادب سے پوچھا۔ کیوں جی کیا میں آپ سے ایک سوال کر سکتا ہوں۔ مہمان نے ایک لمحہ کو ہاتھ روکا اور بولا "کیجئے"۔ میزبان بولا۔ مجھے یہ بات کہنی تو نہیں چاہئے تھی لیکن یہ پوچھنے پر مجبور ہوں کہ کیا آپ کا پیٹ نہیں بھرا ابھی تک۔ جواب میں آخری مہمان نے اپنے ساتھیوں کی لاشوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "پیٹ بھرے وہ رہے"

اس پر محفل الٹ گئی۔ سب کو اتنی ہنسی چھوٹی کہ منہ کے نوالے نگلنے محال ہو گئے۔

وہ سب ہنس چکے تو انہوں نے دیکھا کہ کیلاش دوسروں کی بہ نسبت بدستور سنجیدہ بنا بیٹھا ہے۔

ان کے لئے اس کی ہستی اس قدر محبوب تھی کہ اس کے رنج میں وہ بھی رنجیدہ ہو گئے۔ محفل کی یہ خاموشی بڑی غیر متوقع تھی۔ معاً کیلاش کو اپنے بھونڈے پن کا احساس ہوا تو وہ چونکا۔ "آئی ایم سوری"۔ یہ کہہ کر اس نے لبوں پر مسکراہٹ پیدا کی۔

کبھی کبھی سیاہ بادل کا ٹکڑا اس کی روشنی کو اپنے تاریک سینے میں چھپا لیتا تھا تو وہ حال سے بے خبر ہو جاتا ——— لیکن یہ تو بری بات تھی کہ اس کی وجہ سے ساری محفل کا لطف خراب ہو۔

اس نے بزور اپنے چہرے پر بشاشت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! آج دوپہر میں بہت پریشان تھا۔ آپ سب جانتے ہی ہیں۔۔۔ اسی لئے میں محفلوں سے دور بھاگتا ہوں۔۔۔ آپ برا نہ مانئے میری ہر کوتاہی پر"

ڈاکٹر صاحب نے گرمجوشی سے کہا۔ "ارے توبہ۔ آپ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔۔ ایک بات کہوں؟"

"کہیئے۔"

"آپ ہمارے ساتھ گاؤں چلئے دو تین ماہ کے لئے ——— یوں مایا داس بنئے سے کیا فائدہ۔ روپیہ کمانے کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔"

کیلاش ہنسا۔ "وہاں کیا رکھا ہے ذرا تفصیل سے بتائیے۔"

کرن بول اٹھی۔ "ابی آپ کی ساری اداسی غائب ہو جائے گی۔ بلکہ میں تو دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کا واپس آنے کو دل نہیں چاہے گا۔"

"ارے آپ انہیں دھکے بھی دیں گی تو یہ نہیں آئیں گے وہاں سے۔"

"آخر میں بھی سنوں کہ وہاں ایسی کیا کشش ہے۔" کیلاش نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "دیکھو مسٹر میں ڈاکٹر ہوں۔ میری رائے میں وہاں جانا تمہاری صحت کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ بڑی پرفضا جگہ ہے۔ تہذیب و تمدن سے بہت

دور جہاں قدرت اپنے اصلی روپ میں دکھائی دیتی ہے، جہاں سرزمین بال کی گردنے مانند کھلی نظر آتی ہے۔ وہاں کی صبحیں، وہاں کی فضائیں بالکل مختلف ہیں۔ یقین کرو وہاں جاکر تم میرا احسان مانو گے۔ تمہارے لئے اس تبدیلیٔ آب و ہوا کی بے حد ضرورت ہے۔ اس کا تمہاری صحت اور ذہن پر بہت ہی اچھا اثر پڑے گا۔۔۔"

"بے شک بے شک" کرن نے بچوں کی طرح تالی بجا کر کہا

کیلاش ذرا سنبھل کر بولا "اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ بعض اوقات ماحول کی ذرا سی تبدیلی سے انسان کی طبیعت میں فرق آجاتا ہے۔ مثلاً آج دوپہر کو میری طبیعت اداس تھی۔ ریستوران میں ایک جوشیلے نوجوان کی تقریر سن کر میں نے یوں محسوس کیا جیسے میرا ماحول ہی بدل گیا ہے۔ اس نے بعض ایسی باتوں کی جانب توجہ مبذول کرادی جس طرف کہ میرا دھیان بہت کم گیا تھا۔ حالانکہ وہ کوئی بڑا مقرر نہیں تھا معمولی طالب علم تھا۔۔۔"

"قطع کلام معاف" ڈاکٹر صاحب بول اٹھے "میں نے بھی اس کی تقریر سنی تھی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس وقت ہمیں عمل کے میدان میں آنے کی ضرورت ہے بے شک اس دنیا میں بعض واقعات ایسے بھی پیش آجاتے ہیں کہ جن کے روبرو ہم اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتے ہیں لیکن ہمیں تو حتی المقدور اس دنیا کو بہتر سے بہتر بنانا ہے۔ اس کے لئے عمل اور ایثار کی بے حد ضرورت ہے۔"

"بائی دی وے۔۔۔ آپ وہاں کرتے کیا ہیں؟" کیلاش نے دریافت کیا۔

ڈاکٹر نے تھوڑے توقف کے بعد کہنا شروع کیا "آپ نے بڑی دلچسپ بات

دریافت کی ہے۔ میری طالب علمی کے زمانے ہی سے میری توجہ ان مسائل کی جانب مبذول ہوگئی تھی۔ میں نے ملک کی آزادی کی تحریک میں بہت زور شور سے حصہ بھی لیا لیکن رفتہ رفتہ مجھے ایک اور بات کا شعور بھی پیدا ہونے لگا کہ ملک کے پس ماندہ باشندوں کے لئے جب تک ہم عملی طور پر ان کے درمیان رہ کر کچھ نہ کچھ نہ کریں گے۔ تب تک زندگی کو خوبصورت بنانے کا جو خواب ہم دیکھا کرتے ہیں وہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات میرے دل میں کچھ اس طرح سے جڑ پکڑ گئی کہ میں نے اس کی تفصیلات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میرے ہم خیال دوست بعض مجبوریوں کے باعث اس تحریک میں عملی حصہ نہ لے سکے تو میں نے تن تنہا اس کام کو انجام پر پہنچانے کا بیڑا اٹھا لیا . . . . میری ننھی بہن کرن نے بھی میرے دوش بدوش کام کرنے کا یقین دلایا۔ اب عرصہ دو برس سے ہم وہاں موجود ہیں . . . "

"اچھا تو آپ کا پروگرام کیا ہے"۔ کیلاش نے پوچھا

"اس سلسلے میں ہم بہت زیادہ کام نہیں کر سکے۔ سیاسی حالات کی وجہ سے ہمیں بعض ایسی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے پروگرام جلد پورا نہیں ہو سکا لیکن اب ہندوستان آزاد ہو گیا ہے اس لئے امید ہے کہ قومی حکومت ہمیں ہر ممکن امداد بہم پہنچائے گی۔ ایم، بی، بی، ایس پاس کرنے کے بعد میں نے وہاں ایک ہسپتال کھول رکھا ہے۔ میلوں تک پھیلے ہوئے دیہات کے لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ بچوں کے علاوہ بالغوں کے لئے بھی ہم نے اسکول کھولا ہے۔ علاوہ ازیں کھیتی باڑی میں دیہاتیوں کو سہولتیں بہم پہنچانا، ان کے دلوں میں قومی یکجہتی کا جذبہ پیدا کرنا، کئی اور مسائل بھی ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ یہیں تو ہاں

بہت سادہ زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ ہم معمولی سہولتوں سے بھی محروم ہیں لیکن ملک کے ایک گوشے کے باشندوں میں نئی تعلیم و تمدن پھیلانے اور انہیں نئی دنیا اور نئے ذہن، نئی اقدار سے روشناس کرنے کی تمنا ہمیں وہاں سے ہٹنے نہیں دیتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے وہاں تھوڑا کھویا اور بہت زیادہ پایا ہے۔"

یہ باتیں سُن کر کیلاش چند لمحوں تک ایک مخصوص کیفیت میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے سب کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا: "آپ مجھے دو تین ماہ کے لئے کیوں مدعو کرتے ہیں ——— ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں بلا لیتے۔"

ڈاکٹر کا لقمے والا ہاتھ رک گیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا "سچ مچ!"

"سچ مچ نہیں تو کیا وہ مذاق کر رہے ہیں" کرن نے گلاب کی طرح کھل کر کہا۔ ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

٣١

بمبئی ترک کر کے ڈاکٹر راجن کے ہمراہ چلے جانے کا خیال دفعتہً ہی کیلاش کے ذہن میں آیا۔ ڈاکٹر راجن کے ساتھ تفصیلی گفتگو کرنے پر بات صاف ہو گئی کہ چند ہزار روپے کی امداد ملنے پر اتنی آمدنی ضرور ہو جائے گی جس سے اس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ کیونکہ وہ ڈبوں میں پھل محفوظ کر کے انہیں ملک بھر میں بھیجنے کا کاروبار بھی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں خالص شہد اور گھی مکھن کا کام شروع کرنے کی اسکیم بھی زیر غور تھی۔ کیلاش کے پاس روپیہ بھی موجود تھا اور ان حالات میں یہ تجویز بہترین معلوم ہوتی تھی۔

مندرجہ بالا گفتگو کے چند روز بعد کیلاش ڈاکٹر راجن اور اس کے مختصر خاندان کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھا گاؤں کی جانب جا رہا تھا۔

سب سے نئی زندگی کی بابت بات چیت ہوئی تھی۔ کیلاش کا دل بہلنے لگا تھا۔ پچھلی زندگی اور اس سے متعلقہ جذبات ایک خاص نقطۂ عروج تک پہنچ کر اب ڈھلان کی جانب رواں تھے۔ اپنی دانست میں وہ اپنی پچھلی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر چکا تھا۔ وہ سر دست کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔ وہ اسے محض بھلا دینا چاہتا تھا محسوس ہوتا تھا کہ اس معاملے میں بہت حد تک کامیاب ہو رہا تھا۔

جب وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے اور گاڑی بمبئی سے چل پڑی تو ڈاکٹر راجن نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا "بھئی کیلاش! حقیقت یہ ہے کہ اب ہم ایسے بڑے شہروں میں رہنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔"

"کیوں؟"

"دیکھو نا! . . . خیر اس بات کو ابھی تم نہیں سمجھ سکو گے . . . اس شور و شغب سے دور قدرت کی گود میں رہنے کے بعد تمہاری بھی یہی کیفیت ہو جائے گی۔"

"اچھا بھئی! اب یہ بتائیے کہ ہم کہاں کہاں سے ہو کر گزریں گے اور کہاں کہاں ٹھہریں گے۔"

پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر کچھ کہتا۔ کرن بچوں کی طرح سر ہلا کر بولی: "یہ مجھے بتانے دیجیے۔"

مسز راجن بولیں: "ہاں بھئی ضرور . . . بڑی دیر سے چپ ہو۔"

کرن نے ـــــ مسکراتے ہوئے گھوم کر بھاوج کی طرف دیکھا اور اپنی پیشانی

نازک اور ناجی انگشتِ شہادت اٹھا کر کہا " دیکھئے کیلاش جی۔ پہلے تو یہ بات ... آپ کو لنچ کھلایا جائے گا ....

اس پر سب ہنس پڑے۔

کرن نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

ڈاکٹر راجن بولے " اس کی باتیں تو ہو چکیں — ہم کو ... وہیں اتریں گے۔ زیادہ سے زیادہ دو دن کا وہ ہے ... سے کاٹھ گودام پہنچنا ہوگا۔ یہاں سے گاڑی کا سفر ختم ...."

" اچھا ... اور مصیبت ... پھر کیا لاری ؟"

" نہیں ... پھر پیدل چلنا پڑے گا۔"

کیلاش نے ازراہِ مذاق دریافت کیا " اچھا تو سامان بھی خود ہی اٹھانا پڑے گا؟"

کرن نے اس دوران میں ناخوش ہو کر ایک طرف ہو بیٹھی تھی۔ مسکرا دی۔ مسز راجن نے کہا " اچھا وہاں گھوڑوں کی سواری کرنی پڑے گی۔ سامان بھی ... پر لادے گا اور آپ بھی "

چھوٹی بچی اچھل پڑی " آہا جی ! ہم تو گھوڑوں پر چڑھیں گے ... ہم گھوڑوں ..."

گاڑی کا سفر بے حد دلچسپ ثابت ہوا۔ لیکن کرن چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس بے چاری کی بات بیچ ہی میں سے کاٹ دی گئی تھی اور اس کے چپ رہنے کا یہی سبب تھا۔

کیلاش نے اس چیز کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا " اچھا جی راستے میں قدرتی مناظر تو دیکھنے میں آئیں گے " اور پھر اس نے کنکھیوں سے کرن کی جانب دیکھا۔

کرن پڑھی لکھی لڑکی تھی لیکن اس کے مزاج میں جب بچپن اور ذہانت اور چلبلا پن گھل مل جاتا تو ہر آن چہرے پر عجب رنگ آتا تھا۔

ڈاکٹر راجن نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن کیلاش نے انہیں ٹوک دیا۔ "بھئی نہ۔ تمہاری باتوں میں کوئی لطف نہیں۔ یہ میں کرن کی زبانی سننا چاہتا ہوں۔"

اس پر کرن کسمسائی۔

"بتاؤ کرن! راستے میں کیسے کیسے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔"

کرن نے جھٹ سے منہ پھیر لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی مسکراہٹ چھپانا چاہتی ہے۔

"بولو بھئی! دیکھو کیلاش کیا پوچھتے ہیں۔" ڈاکٹر راجن نے کہا

"نا ہیں۔ ہماری پھوپھی بات نا ہیں کریں گی۔"

بچی کی بات پر سب کو ہنسی آگئی۔ کیلاش نے ننھی کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو ننھی! اگر تمہاری پھوپھی نا ہیں بولیں گی تو ہم ان کے ساتھ نا ہیں جائیں گے اگلے اسٹیشن سے بمبئی واپس چلے جائیں گے۔"

"واپس کیسے جائیں گے آپ . . ." یہ کہہ کر کرن کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"تو پھر ہماری بات کا جواب دو۔"

"ارے بات کے جواب کے پیچھے پڑے ہو اس سے گانا سنو۔" مسز راجن نے لقمہ دیا۔

"اچھا۔ اچھا کرن گاتی بھی ہے۔"

"جی ہاں۔" ڈاکٹر نے کہا

"بھئی پھر تو گانا ہو جائے" کیلاش نے منت کی لیکن کرن چپ رہی

"تو دوں واپس جانے کی دھمکی"

کرن نے کنکھیوں سے کیلاش کی جانب دیکھا اور نازک ہاتھوں سے ہوا میں اڑتی ہوئی سیاہ زلفوں کو پیچھے کی جانب ہٹاتے ہوئے شیریں آواز میں بولی۔

"گاتی ہوں"

۲۲

کاٹھ گودام پہنچ کر ایک روز انہوں نے آرام کیا۔ اسی روز ڈاکٹر راجن نے خچروں اور ٹٹوؤں کا انتظام کر لیا۔

دوسرے روز علی الصبح تاروں کی چھاؤں میں ان کا چھوٹا سا قافلہ منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

خواتین کے لیے ٹٹوؤں کا الگ انتظام کر دیا گیا تھا تاکہ وہ جونہی تھکان محسوس کریں ان پر سوار ہو جائیں۔ راجن نے بارہ بور کی دو نالی بندوق اپنے ہاتھ میں لے لی اور رائفل کیلاش کے سپرد کر دی۔ کیلاش نے پوچھا "بھئی اس قدر بھاری رائفل کی کیا ضرورت ہے"

"بندہ پرور! اب ہمیں دو راتیں اور تین دن جنگل میں بسر کرنے ہیں یعنی صحیح معنی میں جنگل۔ اس لئے ہر خطرے کی امید رکھنی چاہیئے"

ایک شخص جسے سب پنڈت کے نام سے پکارتے تھے کہنے لگا "جی ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آج کل ایک باگھ سے لوگوں کو بہت خطرہ لاحق ہے"

"باگھ کیا؟" کیلاش نے پوچھا
"باگھ یعنی LEOPARD یہ جانور آدم خور شیر سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ آدم خور شیر کی جرأت یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ عام طور پہ دن میں حملہ کر دیتا ہے لیکن باگھ ہمیشہ رات کو حملہ آور ہوتا ہے اور پھر یہ درخت سے انسان کے اوپر کود سکتا ہے۔"

کیلاش نے دیکھا کہ ان کی باتیں سن کر کرن اس کے بازو کے ساتھ لگ کر چپک رہی ہے۔ اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں دہشت کے سائے نظر آ رہے ہیں۔ شبنم آلود فضا اور صبح کے دھندلکے میں وہ بہت حسین دکھائی دے رہی تھی۔ کیلاش کو کسی قسم کا خوف محسوس نہ ہوا۔ البتہ اسے کچھ اس قسم کا احساس ہوا جیسے پرانی دنیا اور بھی اس سے دور — بہت دور اور بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور وہ صحیح معنی میں زندگی کا نیا ورق الٹ رہا ہے۔

کیلاش نے کرن کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دی اور وہ سردیوں کی دھوپ میں نہاتی ہوئی مخمور بلی کی طرح خوش ہو گئی۔

"کیوں بھئی — باگھ ہمارے علاقے کی طرف ہے یا اُدھر؟" ڈاکٹر نے دریافت کیا۔

"جی نہیں اُدھر ہی ہے اور ابھی کچھ ایسا اودھم بھی نہیں مچایا اس نے"۔

کیلاش نے پوچھا۔ "اچھا بھئی ہمارا علاقہ کونسا ہے۔ میں تو وہاں کا نام

بھی بھول گیا ہوں"۔

"موضع چھپادت سے کچھ آگے دریا کے لوہا گھاٹ کے قریب ہماری منزلِ مقصود ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا

چھپادت اور لوہاگھاٹ، ان ناموں میں کتنی جدت تھی۔ یہ نئی دنیا کے ایک گاؤں اور دریا کے نام تھے۔ کافی دیر تک یہ نام اس کے ذہن میں گونجتے رہے۔

چند دیگر راہ گیر بھی ان کے ساتھ ہو لئے تھے۔ اگرچہ وہ اخیر تک ان کا ساتھ دینے والے نہیں تھے تاہم ان کی موجودگی سے قافلے کی رونق میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بہرحال سفر اس قدر دلچسپ اور عام سفروں سے مختلف ثابت ہوا کہ کیلاش کا دل چاہنے لگا۔ کاش یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ یہی ڈاکٹر یہی مسز راجن، یہی بے بی اور یہی کھلے گلاب کے سے ہونٹوں والی کرن اس کے ہم سفر ہوں اور وہ رہتی دنیا تک اسی طرح چلتا رہے۔ نامعلوم سرزمینوں کی جانب، کوئی منزل نہ ہو، کوئی مستقل ٹھکانہ نہ ہو۔

راستہ چلتے چلتے دن بھر ڈاکٹر راجن بعض پرندوں کو بندوق سے مار لیتا۔ اس شغل سے سفر اور بھی دلچسپ ہو گیا، ہر جگہ ڈاکٹر کے واقف کار مل جاتے۔ مٹی کے مرتبانوں میں بند دہی اور دودھ سے ان کی تواضع ہوتی۔

رات کا کھانا بڑے اہتمام سے تیار کیا جاتا۔ تاروں کی چھاؤں اور السی کے تیل کے چراغوں کی روشنی میں وہ سب کھانا کھاتے۔ اس کے بعد جب وہ آرام سے لیٹ جاتے تو جنگل کی فضا کرن کے لرزاں اور سوز بھرے گیتوں سے گونج اٹھتی اور کیلاش کا دل ہچکولے لینے لگتا۔

صبح کے وقت خوش نوا پرندوں کے ترانوں اور کسی پہاڑی بنسری کی دل لبھا دینے والی لے سے ان کی آنکھ کھل جاتی اور پھر بڑی شد و مد سے سفر کی تیاری شروع ہو جاتی۔

دوسری رات گذرنے کے بعد صبح کے وقت ان کے چھوٹے سے قافلے میں کچھ ہلچل پیدا ہو گئی۔ کیلاش کے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ زمین پہ باگھ کے پنجوں کے نشانات پائے گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ باگھ رات کے وقت ان کے کیمپ کے گرد چکر لگاتا رہا تھا۔ نہ جانے کس وجہ سے اس نے حملہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جب کیلاش کو اس بات کا احساس ہوا کہ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کسی ایک شخص کو باگھ اٹھا کر لے جاتا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر نے کہا: "آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ بہتر ہو اگر آج کی رات ہمیں جنگل میں بسر نہ کرنی پڑے۔"

عورتیں قدرے سراسیمہ ہو گئیں۔

چنانچہ اس روز انہوں نے کافی تیزی سے سفر طے کیا۔ دن ڈھلنے تک ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بولا: "کیلاش! سامنے پہاڑ کی جو نکڑ دکھائی دے رہی ہے، اس سے آگے چمپاوت دکھائی دینے لگے گا۔ چمپاوت میں ہم رات بڑے اطمینان سے گذار سکتے ہیں۔ اگلے روز بقیہ مختصر فاصلہ طے کر لیا جائے گا۔"

تھکے ماندے قافلے کو پیچھے چھوڑ کر کیلاش آگے بڑھ گیا۔ نکڑ سے گھوم کر اس نے نظر اٹھائی تو اس کے قدم رک گئے۔

اس کے سامنے ایک ایسا منظر پھیلا ہوا تھا جسے وہ زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔

معاً پہاڑیوں میں گھری ہوئی سرسبز و شاداب وادی کا ایک ایسا منظر کھلا کہ آنکھوں کو اس کی اصلیت پر یقین نہیں آتا تھا۔ سرسبز جھاڑیاں، گھنے درخت، ہری بھری کھیتیاں میلوں تک پھیلی ہوئی اور ان پر چھائی ہوئی ازلی خاموشی اور سکوت جس سے روح کو اطمینان اور دل کو فرحت حاصل ہوتی تھی۔

۲۳

کماؤں کے علاقے میں آئے ہوئے کیلاش کو آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ دریائے رو ہا گھاٹ سے دو فرلانگ پرے چند چھپر والے مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس علاقے کے عام جھونپڑوں سے یہ مکانات قدرے مختلف تھے۔ نسبتاً بڑے صاف، آبادی سے دور۔ ان مکانات یا جھونپڑوں کو دیہاتی کوٹھی کہتے تھے۔

کیلاش نے اپنا جھونپڑا الگ بنوا لیا تھا۔ یہ مکان یا جھونپڑا بالکل سیدھا سادا بنا ہوا تھا۔ باہر برآمدہ، اندر دو کمرے، باورچی خانہ، غسل خانہ اور اسٹور روم گویا کیلاش کی ضروریات کے لئے کافی تھا۔

اسکول اور ہسپتال کے لئے بھی الگ مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان سب مکانوں پر بہت زیادہ روپیہ خرچ نہیں ہوا تھا۔ سیمنٹ، پتھر، لکڑی اور مزدوری وغیرہ میں سے کوئی شے مہنگی نہیں پڑی۔ اسکول اور ہسپتال کے باعث وہاں کافی چہل پہل رہتی تھی۔ ڈاکٹر راجن کو اس علاقے کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ ان لوگوں کے دل میں اس کے لئے بڑا احترام تھا۔

اسکول میں برائے نام فیس لی جاتی تھی۔ اس باب میں بھی انہوں نے کافی

ڈھیل دے رکھی تھی۔ ان کا اصول یہ تھا کہ ہر لڑکے کو پڑھنے کا موقع دیا جائے خواہ اس کی فیس ملے یا نہ ملے۔ اسی طرح ہسپتال بھی تقریباً خیراتی تھا۔ ہر مریض کو دوا دی جاتی تھی خواہ وہ اس کی معمولی قیمت دے یا نہ دے۔

ہسپتال کا سارا کام ڈاکٹر راجن نے اپنے ذمے لے رکھا تھا اور اسکول کا سارا انتظام مسز راجن اور کرن کے سپرد تھا لیکن وہ ایک دوسرے کے کاموں میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔

ڈاکٹر راجن پہلے تو اسپتال میں کام کرتے تھے اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر میلوں تک پھیلے ہوئے دیہات کے دورے پر نکل جاتے تھے۔ بعض بعض مریض جو اسپتال تک آنے سے معذور ہوتے ان کی خبر گیری کرتے۔ بارہا کئی رات تک گھر لوٹتے بعض اوقات انہیں رات بھی باہر بسر کرنی پڑتی۔ فالتو وقت کا بھی ایک ایک لمحہ دوسرے کاموں میں صرف کرتے۔

مسز راجن اور کرن اپنے اپنے کام میں مگن رہتیں۔ غریبوں کے لڑکے اور لڑکیاں ڈلیاں بنا کر علی الصبح گھروں سے نکل کھڑے ہوتے۔ نو بجے تک وہ اسکول میں جمع ہو جاتے۔ پڑھائی کے اوقات بھی مختصر تھے۔ کیونکہ ان سب غریب بچوں کو گھر کے دیگر کاموں میں ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ اس لئے انہیں جلد چھٹی دے دی جاتی تھی۔

اگرچہ وہاں ڈاکٹر اور اس کے خاندان کے اخراجات بہت معمولی تھے تاہم مالی نقطۂ نظر سے یہ گھاٹے کا سودا تھا۔ ان کی چند ایک اسکیمیں ایسی تھیں جن سے معقول آمدنی کی امید کی جا سکتی تھی۔ ڈاکٹر راجن اپنے اور خاندان کے ذاتی اخراجات کو محدود ہی رکھنا چاہتے تھے البتہ وہ اتنا ضرور چاہتے تھے کہ اول تو انہیں گھاٹا نہیں

بڑھنا چاہیے مبادا انہیں وہاں سے بھاگنا پڑے۔ دوسرے جتنا زیادہ روپیہ فراہم ہو اسے تمام سدھار کے کاموں پر فراخ دلی سے خرچ کریں۔

کیلاش نے اسکول اور دیگر متفرق کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ یقیناً پچھلے ماحول سے نکل آنا اس کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔ دکھ اور تکلیف میں ڈوب کر ابھر آنے سے اس کی روح اور ذہن روشن سا ہو گیا تھا۔ دل کے اندر بیٹھا ہوا درد بعض اوقات ابھی مارتا ضرور تھا لیکن اس میں وہ شدت نہیں رہی تھی اور پھر زندگی کو مردانہ وار بسر کرنے کا اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

وہ سب اپنے چند ملازموں سمیت ایک بڑے خاندان کے مانند گھل مل کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ مسز راجن اور کرن ایسی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی خواتین کی موجودگی بھی کیلاش کے حق میں نعمت سے کم نہیں تھی۔ بالخصوص کرن بے حد خدمت کرنے والی لڑکی تھی۔ اگرچہ بچوں کے مانند روٹھنا، لڑنا، جھگڑنا اور پھر جلد من جانا اس کی فطرت میں داخل تھا لیکن اس کے باوجود وہ ذہین لڑکی تھی۔ سنجیدہ، معقول بات کہتی، وہ اظہار خیال کرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ فی الحقیقت بارہا انہیں اس کی رائے کی صحت اور صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑا۔

کیلاش کے گھریلو معاملات تک کرن کے زیر غور رہتے۔ وہ روزانہ اس کے گھر آتی۔ ہر تیسرے چوتھے اس کے ہاں چائے پیتی یا کھانا کھاتی۔ مسز راجن کو اسکول کے بعد گھریلو کاموں کی جانب توجہ مبذول کرنی پڑتی تھی البتہ ان دونوں کو ملنے کی کھلی آزادی دے دی گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کرن کو اس کے گھر والوں نے کبھی کیلاش

سے وقت سب سے وقت ملنے جلنے ہنسنے کھیلنے اور سیر سپاٹا کرنے سے منع نہیں کیا تھا ہفتے میں دو دن ایسے بھی ہوتے تھے تب کرن کا سارا وقت کیلاش کے جھونپڑے میں اس کی کتابیں اور کاغذات ٹھکانے سے رکھنے اور کمروں کی صفائی اور دیگر چیزوں کی دیکھ بھال میں گذرتا تھا۔

ایسے مواقع تو مہینے میں ایک دو بار ہی آتے تھے جب وہ سب سیر کے لئے اکٹھا نکلا کرتے تھے لیکن کرن اور وہ دونوں تقریباً بلا ناغہ شام کی سیر کو دور تک نکل جاتے۔ ان سیروں کے دوران میں وہ خوب باتیں کرتے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دونوں ذہنی اور جذباتی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے ــــ وہ ایک دوسرے کو سمجھنے لگے تھے۔

۲۴

ایک روز کیلاش کی کرن سے ملاقات نہیں ہو سکی کیونکہ اسے علی الصبح ڈاکٹر کے ساتھ دوسرے گاؤں جانا پڑ گیا تھا لیکن شام سے پہلے پہلے وہ ڈاکٹر سے رخصت لے کر واپس چلا آیا تھا۔ شیو اور غسل سے فارغ ہو کر اس نے نئے کپڑے پہنے اور برآمدے میں کھڑا ہو کر کرن کا انتظار کرنے لگا۔

کرن کو اس کی واپسی کی خبر تو مل ہی چکی تھی، اس لئے اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی اور پھر یہ بھی خیال کہ شاید اسے اطلاع نہ ملی ہو یا ممکن ہے وہ آج آنے سے معذور رہے۔ ان خیالات سے اس کا دل کچھ پریشان سا ہو گیا۔

پانی کے دھوئیں کے ہلکے پردے میں سے وہ بے چینی سے کرن کے مکان کی جانب

دیکھ رہا تھا جو تقریباً ڈھائی تین فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہر لحظہ اُسے خیال آتا تھا کہ ابھی نازک بدن کرن شاخِ گل کے مانند لچکتی ہوئی اپنے مکان سے نکلے گی اور ڈھلان کے پُرپیچ راستوں پر تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے قریب آن پہنچے گی ـــــ لیکن بار بار اُس کی امید نا اُمیدی میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

معاً اسے خیال آیا کہ آخر آج وہ اس قدر بے چین کیوں ہے۔

اس خیال نے اسے کچھ اس طرح چونکا دیا جیسے یہ محض ایک خیال نہ ہو بلکہ جیسے کسی نے اس کے عین قریب پہنچ کر بڑے زور سے یہ بات کہہ دی ہو . . . وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

رفتہ رفتہ اسے اس حقیقت کا احساس ہوا کہ وہ سچ مچ بڑی بے چینی سے کرن کا انتظار کر رہا ہے ـــــ شاید کئی دنوں بلکہ کئی ہفتوں سے وہ ایسا کر رہا تھا . . .

دھوپ کے باریک پردے میں سے کرن زرّیں شعلے کے مانند اپنے مکان سے نکلتی ہوئی دکھائی دی اور جب وہ پُرپیچ پگڈنڈی پر چلتی ہوئی اس کی جانب بڑھ رہی تھی تو وہ اسے اپنے تصور سے بھی زیادہ حسین معلوم ہوئی۔

بالآخر وہ اس کے روبرو آن کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح شگفتہ تھا اور دہکتے ہوئے گلابی ہونٹ شگفتہ تر تھے۔ اس نے معمولی ساڑھی پہن رکھی تھی لیکن اس کی چھب قیامت تھی۔ اس کا دم بدستور پھولا ہوا تھا۔ اس کے گھنگھرے چیز کے سے تھے اور چولی اور ساڑھی کے درمیان عریاں گوشت پیٹ پر بیدِ مجنوں کی کیفیت طاری تھی۔

کیلاش اس کے مہکتے ہوئے بدن کے منظر سے محظوظ ہونے میں اتنا محو تھا کہ کرن کو چلا کر کہنا پڑا "ارے چلئے نا۔ آپ کس سوچ میں پڑے ہیں"

کیلاش نے فلسفیانہ مسکراہٹ کی آڑ لیتے ہوئے کہا "چلو"

"معاف کیجئے آپ کو منتظر رہنا پڑا۔ میں سمجھی تھی کہ شاید آپ سیر کے وقت تک نہیں لوٹ سکیں گے۔"

کرن نے آگے آگے چلتے ہوئے یہ الفاظ کہے لیکن کیلاش اس کی کمر کے اس عریاں اور گورے حصے کو دیکھنے میں محو تھا جو سرین اور سرکشش سینے کے درمیان نازک اور لرزاں پل کی حیثیت رکھتا تھا۔ جونہی اسے احساس ہوا کہ اپنی محویت میں اس نے کرن کی بات سن کر بھی جواب نہیں دیا تو اس نے دو چار بڑے ڈگ بھر کر کرن کو جا لیا اور بے اختیار اس کی گورے رنگ کی پھڑپھڑاتی ہوئی کمر کو نرمی سے بازو کے حلقے میں لے کر ٹھہراتے ہوئے نیم گرم پیٹ پر اپنی انگلیاں چھوا دیں اور معمول سے قدرے بھدے انداز میں ہنستے ہوئے بولا "جھوٹی کہیں کی۔۔۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارے ہمراہ سیر کرنے کے لئے میں دنیا کے دوسرے گوشے سے بھی بھاگ کر واپس آجاتا۔"

کرن قدرے کسمسائی۔۔۔ لیکن دور تک وہ اسی طرح سے چلتے گئے۔۔۔۔۔۔ وہ چپ سی ہوگئی۔۔۔ کیلاش نے اس کی جانب دیکھنے کی جرأت نہیں کی لیکن اس نے اس کی کمر کے گرد بازو کا نرم حلقہ ڈالے رکھا اور اسے اپنے ہاتھ اور اس کنواری کمر کے درمیان پسینے کی ہلکی نمی سی محسوس ہوئی۔

ہر دو جانب مکمل خاموشی طاری تھی۔۔۔ اور لمحہ بہ لمحہ یہ خاموشی بھدی ہوتی جا رہی تھی۔

ڈھلان کے موڑ پر دفعتہً کیلاش کے بازو کے حلقے میں کرن کی کمر زور سے پھڑکی

اور پھر وہ بھاگتی ہوئی چند قدم آگے بڑھ گئی اور نقرئی آواز سے بولی "دیکھئے دیکھئے آج کا منظر کس قدر حسین ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ہنس کی طرح گردن موڑ کر اپنی موٹی لیکن قدرے پھیلی پھیلی حیران آنکھوں سے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے کیلاش کی جانب دیکھا۔

سامنے اٹھتی لچکتی پہاڑیوں کے دامن میں سرسبز و شاداب وادی پھیلی ہوئی تھی اور ڈھلانوں پر بسے ہوئے چھوٹے چھوٹے گاؤں یوں دکھائی دیتے تھے جیسے کسی فنکار نے ہاتھ بڑھا کر پانسہ پھینکا ہو اور نیلی نیلی کوڑیاں بساط پر اِدھر اُدھر بکھر گئی ہوں۔ ہلکا گہرا سایہ زمین کی جانب بڑھ رہا تھا اور ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں نے پہاڑیوں کی چوٹیوں کو نارنجی رنگ میں رنگ دیا تھا۔

اس ماحول میں کرن اس خاکی دنیا کی مخلوق معلوم نہیں ہوتی تھی۔

"ہاں واقعی بہت حسین منظر ہے۔" کیلاش نے بھاری آواز میں جواب دیا۔

وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اپنی محبوب چٹان کے قریب پہنچ گئے کرن حسب معمول اس پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

ہوا میں جنگلی پھولوں اور پتوں کی بو اور گھنے جنگلوں کی نمی گھل مل گئی تھی۔۔۔۔ ہلکی دھوپ کی چادر پہاڑیوں کے سروں سے کھسکتی جا رہی تھی اور جوں جوں روشنی کم ہو رہی تھی توں توں کرن کے چہرے کی دمک نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔

پہلے تو کرن نے روز کی طرح چہک چہک کر باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن پھر کیلاش کی نظروں میں نہ جانے اسے کیا دکھائی دیا کہ وہ چپ ہو گئی اور قدرے تامل کے بعد بولی "اب واپس چلیں۔"

لیکن پیشتر اس کے کہ اٹھتی کیلاش نے وحشی جانور کی طرح جھپٹ کر اس کی کمر کو بازوؤں میں لے لیا اور اس پر اس انداز سے جھکا کہ وہ نیم دراز ہو گئی۔ اس کے بوجھ تلے اس نے اسے بے حد قریب سے دیکھا۔ اس کی نیم وا آنکھیں، تمتماتے ہوئے گال، شگفتہ ہونٹ ناگن ایسی زلفیں ـــــ اس قدر قریب سے بھی اس کا حسن بے عیب اور مکمل دکھائی دے رہا تھا۔

ان کی آنکھیں ملیں اور یکبارگی کرن تڑپ کر اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی اور چٹان سے کود کر بھاگ نکلی۔

کیلاش پیچھے کی جانب تقریباً نکڑ پر نمودار ہوا۔ اس نے کرن کو درختوں کے بیچ میں سے سرسراتے ہوئے سانپ کے مانند پگڈنڈی پر جلد جلد چلتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا ـــ اور پھر ایک نامعلوم سی نقاہت اس کے بدن کے جوڑ جوڑ میں سما گئی۔ ذرا سے تامل کے بعد وہ اٹھا اور بڑی مشکل سے کرن کے قریب پہنچ سکا لیکن وہ اس کے پیچھے ہی چلتا گیا۔ اس نے نہایت کمزور آواز میں دو تین بار "کرن۔ کرن" کہہ کر اسے بلایا لیکن کرن اس کی جانب توجہ کئے بغیر بھاگ بھاگ کر بڑھتی چلی گئی۔ اپنے مکان کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا لیکن کرن نہیں رکی . . . . تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر سے میں تحلیل ہو گئی۔

۲۵

اس رات کیلاش بہت بے چین رہا۔

کرن کی حسین لیکن پھٹی پھٹی آنکھوں میں اس کی غیر متوقع حرکت سے جو حیرت و استعجاب

ہویدا ہوا تھا، اسے یاد کر کے اس کے دل میں رہ رہ کر ہوک سی اٹھتی۔
اس قضیے کا سب سے زیادہ پریشان کن پہلو یہ تھا کہ انجانے طور سے یہ کھچڑی مدتوں اس کے ذہن میں پکتی رہی تھی جس کا نتیجہ اس جھپٹ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آخر کب سے اس کی نیت بد ہو گئی تھی، اس چیز کا تعین وہ نہیں کر سکا۔

رات بھر خیالات کے ریلے کارواں در کارواں اس کے ذہن میں آتے رہے۔ وہ آنکھیں بند کیے اوندھے منہ لیٹا رہا۔ یہاں تک کہ قریب کے درخت پر بیٹھی ہوئی بے شمار گھریلو چڑیوں کی چوں چوں کے شور سے اس نے سمجھ لیا کہ سورج نکلنے کو ہے۔

وہ اٹھا۔ دن بڑا صاف شفاف تھا، البتہ اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ بستر سے اٹھ کر وہ ایک بے ڈھنگی کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ نہ اس کا نہانے کو دل چاہتا تھا نہ شیو کرنے کو۔ گرم چائے کا پیالہ پی کر اس نے قریب پڑے ہوئے انگوچھے سے باچھیں صاف کیں۔ پھر بے دلی سے ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

گیارہ بجے کے قریب پتلون اور ٹویڈ کا پرانا کوٹ پہن کر وہ گھر سے نکلا۔ سر بھاری، پیٹ خالی، ذہن پریشان —— عجب کیفیت طاری تھی اس پر۔ اس نے ڈاکٹر کے مکان سے کترا کر گذرنے کا ارادہ کر لیا۔ ڈاکٹر کے مکان کے اوپر کبوتر منڈلا رہے تھے۔ اسے یہ سماں بہت بھلا معلوم ہوا۔ اس گھر سے اسے بے پناہ ہمدردی میسر آئی تھی . . . جو شاید اب اسے کبھی نہ مل سکے گی۔ ممکن ہے کہ انہیں کرن نے سب کچھ بتا دیا ہو۔ نہ جانے وہ کیا سوچتے ہوں گے۔

وہ ابھی مکان سے گزرنے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے نسوانی آواز سنائی دی۔

"ہیلو۔ کدھر کو؟"

اس نے نظر اٹھائی۔ یہ مسز راجن کی آواز تھی۔ اسے اس کی آواز میں دبی کھنک اور اطمینان سے لبریز کیفیت محسوس ہوئی۔

وہ چند جملے کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ ظاہر ہوا کہ کرن نے گھر میں اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس سے اس کا احساسِ جرم اور شدید ہو گیا۔

معاً اسکول کی پھلواڑی کے قریب اسے کرن کھڑی دکھائی دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پہلے اس نے چاہا کہ وہ چپکے سے آگے نکل جائے لیکن پھر وہ رک گیا۔

تن اور من کو سرور دینے والی ہلکی دھوپ میں کھڑی ہوئی کرن جس قدر حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے پیشِ نظر کیلاش کا قصور معاف کیا جا سکتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک کھڑا صبح کی اس دیوی کی جانب دیکھتا رہا جو اس قدر دل پر چھا جانے پر بھی ہوا میں تحلیل نہیں ہوتی تھی۔

اس لڑکی نے اس کی زندگی میں کس قدر رشانتی اور رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر کرن نے اس کی جانب نہیں دیکھا — شاید سچ مچ یا جان بوجھ کر۔ اس نے بھاری آواز میں اسے بلایا "کرن"!

شاید کرن نے آواز سنی نہیں۔ اس نے دوبارہ اپنی بوجھل آواز کو بلند کرنے کی کوشش کی "کرن"!

کرن نے سر اٹھایا۔ اس نے چند قدم کے فاصلے پر ایک ایسے شخص کو کھڑا پایا

جس کے بال اُلجھے ہوئے، داڑھی اُسترے کی پرورش کے بغیر، کپڑے بے ترتیب اور صورت سے بے حد تکان کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔

ہر دو جانب کچھ دیر تک بھدا سا سکوت طاری رہا۔ بالآخر کیلاش نے کہنا شروع کیا۔

"میں نہیں جانتا مجھے کیا کہنا چاہیئے... میں... میں... آئی ڈین! مجھے کل کی بات کا تہِ دل سے افسوس ہے..." تامل کے بعد اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ اگر میں نے آپ سے اظہارِ محبت کیا تو گویا آپ کے حسن و شباب کی داد دی۔ ایسی بات کہنے کی جرأت اس لئے کر رہا ہوں کہ آپ پڑھی لکھی اور سمجھ دار خاتون ہیں... تو... اس لحاظ سے اپنے نزدیک میں نے کوئی گناہ نہیں کیا... لیکن مجھے افسوس اس امر کا ہے کہ میں نے وہ حرکت کی جو درحقیقت میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آپ کی قدر کرتا ہوں اور ایک طرح سے آپ سے پیار کرنے کے باوجود آپ میرے لئے وہ شے نہیں ہیں جو میری اس حرکت سے دراصل ظاہر ہوتی ہے... اس دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش کرنے سے میں معذور ہوں کیونکہ میں خود نہیں جانتا کہ مجھ سے یہ حرکت سرزد کیونکر ہوئی.... شاید آپ میری اس بات پر تو اعتبار کر سکیں گی کہ میں دیدہ دانستہ کوئی بھی ایسا کام کرنا پسند نہیں کروں گا جس سے آپ کے دل کو ٹھیس پہنچے..."

"شاید مجھے آپ کو یہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں آپ سے کس قدر والہانہ محبت کرتی ہوں۔ غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری مرضی سے میری

منگنی ہو چکی ہے اور آج کل وہ تعلیم کے سلسلے میں یورپ گئے ہوئے ہیں۔ میرا ذاتی نقطۂ نظر یہ ہے کہ میں اپنے ایک ہی پسندیدہ شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنا پسند کروں گی۔ چنانچہ کل والے واقعہ سے مجھے نہ صرف بے حد تعجب ہوا بلکہ دُکھ بھی ہوا۔۔۔"

کیلاش نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "میں آپ کی دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں۔ آپ میری حقیقی مونس اور ہمدرد دوست ثابت ہوئی ہیں لیکن جو کچھ ہوا میں اس کا ذمہ دار ہوں۔۔۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مجھے آپ سے عشق ہو گیا ہوتا تو میں نے اسے بھی قبول کر لیا ہوتا لیکن سفی الحقیقت مجھے آپ سے عشق نہیں ہے، لگاؤ اور محبت ضرور ہے۔ اس کا کارن آپ کے حسن میں کشش کی کمی نہیں میرے دل کی موجودہ کیفیت ہے۔ میرا دل بجھ چکا ہے۔ ہم دونوں بالکل مختلف علاقوں میں کھڑے ہیں۔۔۔۔ بہرکیف مجھے سخت ندامت ہے۔۔۔۔ آپ مجھ سے خفا نہ ہوں"۔

"جی نہیں خفگی تو قطعاً ہی نہیں۔ مجھے آپ پر ہمیشہ بھروسہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔۔۔"

"میرے دل پر اس کا بہت بڑا بوجھ تھا سو اتر گیا۔۔۔ دیکھئے اب آپ سے ایک درخواست ہے کہ آپ کے رویے سے آئندہ یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ آپ کے دل کا زخم مندمل نہیں ہوا، ورنہ میں سمجھوں گا کہ میں اپنی کھوئی ہوئی بادشاہت پا نہیں سکا"۔

کرن کا رنگ گلنار ہو گیا۔ اس کا سر ایک جانب کو جھک گیا۔ خوابیدہ زلفیں

انگڑائی لے کر رہ گئیں۔

"ابھی سے کہے دیتی ہوں۔ کل شام کو آپ ہمارے یہاں چائے پی رہے ہیں . . . میری ایک سہیلی بھی کچھ دنوں تک رہنے کے لئے آ رہی ہیں۔"

۳۶

کرن کو ناراض کر کے وہ خود کس قدر پریشان تھا اس بات کا احساس کیلاش کو اس وقت ہوا جب ان کے تعلقات دوبارہ استوار ہو گئے۔

کرن کی آنکھوں کی آسمانی چمک اور لبوں کی بے لوث مسکراہٹ سے محروم رہنا اس کے لئے ناممکن تھا جب یہ چیزیں اسے واپس مل گئیں تو طمانیت کا خوشگوار احساس اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا ہی چلا گیا۔ اس نے کرن سے نسبتاً کم گفتگو بھی کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کس قدر کمزور ہے اس قدر بے سہارا ہے۔ اگر اس شخصیت کی کوئی چیز اس کے لئے نمایاں کشش تھی تو صرف یہ کہ اس کے ضمیر میں احساسِ گناہ نہیں تھا۔

صبح ہو جانے کے بعد اس نے فلسفے اور منطق کو خیرباد کہا اور صرف کچھ مبہم اور دلخوش کن احساسات کے تحت گم ہو گیا۔ دوسرے روز چائے کے وقت تک اس نے شیو نہیں کیا اور نہ ہی گھر سے باہر نکلا . . . وہ سیٹی بجاتا رہا، کسی نامعلوم گیت کے بول گنگناتا رہا اور مسکرا مسکرا کر دل ہی دل میں کہتا رہا بے شک اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ بڑی نامناسب حرکت تھی۔

دوسرے دن چائے کے وقت سے دو گھنٹے پہلے اس نے بڑے قرینے سے

سے جلنے کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے دھیرے دھیرے صابن منہ پر لگایا اور پھر دیر تک شیو کرنے کا لطف لیتا رہا۔ منہ ہاتھ دھو کر بال بنائے ایک ایک کپڑے کو غور سے دیکھا۔ وہ بطورِ خاص تیار نہیں ہو رہا تھا بلکہ اس تیاری کے احساس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

بالآخر اس کے پاؤں ایک ماہر رقاص کے مانند برآمدے کی سیڑھیوں پر تھرکے اور وہ ڈاکٹر صاحب کے مکان کی جانب خراماں خراماں بڑھنے لگا۔

پھاٹک میں داخل ہوا تو کرن شاخِ گل کی طرح لچک کر آگے بڑھی، خاموش ہنسی ہنس کر اس نے پہلے کی طرح بے تکلفانہ کہا "آخر آپ آ گئے۔"

"کیوں آپ کیا سمجھے بیٹھی تھیں؟"

"یہی کہ شاید مجھے خود آپ کو منا کر لانا پڑے گا۔"

"منا کر؟"

"جی۔"

"کیوں؟"

"سوچا شاید آپ خفا ہو گئے ہوں۔"

"ہا ہا۔ . . وہ کیوں؟"

"میرے روٹھ جانے پر۔"

کرن کے قریب پہنچ کر کیلاش رُک گیا۔ قدرے تامل کے بعد کہنے لگا "کرن تم تھوڑا روٹھی تھیں۔"

کرن نے بڑھ کر گرمجوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اپنی پلکیں جلد جلد جھپکائیں۔

جیسے آنسو پی جانے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر منہ پھیر کر آہستہ سے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی: "آیئے اندر چلیں، باہر کب تک کھڑے رہئے گا۔"

کیلاش ہنس کر آگے بڑھا۔ "لیکن آج میں خوب ہول سم چائے پیوں گا۔ میں پرسوں سے بھوکا ہوں۔"

"کیوں؟" کرن نے باریک آواز میں دریافت کیا۔

"کل صبح تک تو غم کے مارے۔"

"لیکن اس کے بعد تو صلح ہو گئی تھی ہماری۔"

"پھر خوشی کے مارے کچھ نہیں کھایا پیا۔"

جب دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو کمرہ اُن کے ملے جلے قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"دیکھئے آج آپ کو ایک ایسی میز پہ چائے پلائی جائے گی جس پر میرے ہاتھ کا کاڑھا ہوا میز پوش بچھا ہے۔"

"اوہ۔ ۔ ۔ ۔" کیلاش نے جان بوجھ کر حیرت سے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا حسین میز پوش ہے۔ بھئی تم تو بہت ہوشیار ہوتی جا رہی ہو۔"

پرے کھڑی کھڑی کرن اس کے مصنوعی اظہارِ تعجب سے محظوظ ہوتی رہی۔

دفعتہً کرن نے گھوم کر کہا۔ "ارے ہاں میں یہ کہنا تو بھول گئی کہ آج میری ایک سہیلی۔ ۔ ۔ ۔"

"جی نہیں آپ نے یہ بات کل ہی کہہ دی تھی۔"

"البتہ آپ یہ بتانا بھول رہی ہیں کہ آج وہ آپ کے یہاں پہنچ کر بھی رہا نہیں۔"

"جی ہاں آ گئی ہیں . . . ."

"کیا وہ چائے میں شامل ہوں گی؟"

"بے شک!"

سرکنڈے کے بنے ہوئے مونڈھے میں دھنستے ہوئے کیلاش مسکرایا۔ "تو گویا آج ایک ٹکٹ میں دو مزے ہیں۔"

کرن ہنسی۔ "بے چاری بہت دنوں تک بیمار رہی ہے بلکہ کہنا چاہئے موت کے منہ سے بال بال بچی ہے۔"

"اوہ . . . . اب کیسی ہیں؟"

"اب اچھی ہیں۔"

کیلاش نے ذرا آگے جھکتے ہوئے پُرمعنی انداز میں پوچھا "بہت اچھی ہیں کیا؟"

کرن نے اپنی کمانوں کے کنارے سے کیلاش کی جانب دیکھا اور شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "میرے خیال میں تو بہت اچھی ہیں۔"

معاً کرن اچھل پڑی۔ "ارے میں تو بھول ہی گئی . . . . ہمارے باغیچے میں ٹماٹر پک گئے ہیں۔ کیوں نہ آج ان کے سینڈوچ تیار کئے جائیں . . . ."

"خیال برا نہیں . . . ." اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے کرن ڈائننگ روم (DINING ROOM) کی جانب لپک کر جا چکی تھی۔

جب تک وہ سامنے کی دیوار کو گھورتا رہا دفعتاً آہستہ پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے یونہی اچٹتی ہوئی نگاہ سے آنے والے پاؤں کی جانب دیکھا۔ چند ثانیہ کے بعد معاً پاؤں رک گئے۔

بے اختیارانہ کیلاش کی آنکھیں اوپر کو اٹھ گئیں۔ چائے لانے والی کی صورت بکھنت ایک جھلک دکھا کر بادلوں میں روپوش سی ہو گئی اور پھر چشم زدن میں بادل پھٹ پھٹ کر الگ ہونے لگے ۔ ۔ ۔ ۔

اور چائے کا ٹرے بڑی آواز کے ساتھ فرش پر گرا اور اس کی آواز میں پرچوں پیالوں کے گرنے اور ٹوٹنے کا شور گھل مل گیا۔

کیلاش نے اٹھنے کی کوشش کی ۔ ۔ ۔ مارے نقاہت کے وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا ۔ ۔ ۔

۲۷

رات کے گیارہ بجنے کو تھے ۔ ۔ ۔ کیلاش بازو پر سر رکھے چت لیٹا تھا۔ دور جنگل سے بھانت بھانت کے جانوروں کی بولیوں سے گھاٹیاں گونج رہی تھیں۔ ایک اجنبی ایسے ماحول میں مارے وحشت کے شاید کچھ سوچ نہ سکے لیکن کیلاش چھت پر نظریں جمائے بڑی یکسوئی سے شام کے واقعہ پر غور کر رہا تھا۔ کمرے میں اوشا کی موجودگی ایسی ہی تھی جیسے سپنے کی دیوی میں جان پڑ گئی ہو اور وہ خیالی دنیا سے نکل کر جھم سے حقیقی دنیا میں آن کھڑی ہوئی ہو۔

نظریں ملتے پر ادھر اگر اس پر سکتے کا عالم طاری تھا تو ادھر اس کے ہاتھوں سے ٹرے گر پڑا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ سب لوگ بھاگے بھاگے اندر آئے لیکن جلدی میں کسی نے اس کی جانب توجہ نہیں کی۔ ورنہ جانے کیا سمجھتے۔ سب اوشا کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ کرن کی آنکھوں میں آنسو امڈے آتے تھے۔ ڈاکٹر

بہن کو تشفی دینے لگا۔ "پگلی روتی کیوں ہے۔ فکر کی بات نہیں۔۔۔ یونہی کمزوری کی وجہ سے بیہوش ہوگئی ہے بیچاری۔"

تھوڑی دیر بعد اوشا کو ہوش آ گیا۔ وہ صوفے پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے پھیکے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔ "معاف کیجئے۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔"

"ارے نہیں۔" ڈاکٹر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کچھ قصور نہیں ہے۔۔۔ چائے کے گر جانے کی فکر مت کرو اور آ جائے گی۔"

ان سب میں سے کسی کو اصل حقیقت کا علم نہیں تھا۔۔۔ چنانچہ کرن نے بڑے اہتمام سے دونوں کا تعارف کرایا۔۔۔

"آپ سے ملئے۔۔۔۔ آپ مسٹر کیلاش۔۔۔ ایک عظیم ہستی۔۔۔ اور آپ ہیں اوشا۔۔۔"

"عظیم تر ہستی۔" کیلاش نے جرأت سے کام لے کر کہا۔ اس پر سب لوگ ہنسنے لگے۔

سب کی باتوں اور ہنسی مذاق کے شور میں وہ دو دل بڑی بے چینی سے دھڑک رہے تھے۔

ایک دراز مدت کے بعد ان کی نظریں ملی تھیں۔ اس وقفے میں وہ کیسی کیسی جذباتی منازل سے گذر چکے تھے۔۔۔ اوشا کے چہرے سے لڑکپن کے آثار معدوم ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ پختہ آثار نے لے لی تھی۔۔۔ آنکھوں کے کھنچاؤ میں عجب رچاؤ اور ہونٹوں کے حساس گوشوں میں عجب تلاطم دکھائی دیتا تھا۔

بیٹھے بیٹھے کیلاش کو اوشا کی طلب نے اس قدر بے چین کر دیا کہ ایک

مرتبہ تو وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے کے لئے بیقرار ہو گیا۔

کیلاش نے بستر پر پڑے پڑے آنکھیں موند لیں۔ اس کے ذہن پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری رہی۔ اسے گہری نیند نہیں آئی کبھی دو گھڑی کو سو جاتا اور پھر جاگ اٹھتا۔ علی الصبح اس نے خواب میں دیکھا جیسے بادلوں کی پہاڑیاں روئی کے گالوں کے مانند فضا میں اڑی جا رہی ہیں . . . اور ایک دلہن بادلوں کی تہوں میں روپوش ہوتی جا رہی ہے . . . وہ مسکرا رہی ہے لیکن اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں . . . کیلاش رونے لگا . . اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔

حالانکہ وہ رات بھر اچھی طرح سو نہیں سکا تھا تاہم وہ بالکل چاق و چوبند تھا۔ وہ سیٹی بجاتا ہوا اٹھا اور اس نے نوکر کو دوڑایا کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں کہہ آئے کہ آج صبح کا ناشتہ وہ انہیں کے ہاں کرے گا۔

نہا دھو کر تند رسے چوڑی چوڑی نیلی دھاری کی قمیص اور فلالین کی پتلون اور ہلکا سلیٹی رنگ کا سویٹر پہن کر وہ چھڑی گھماتا ہوا آڑھی ترچھی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا ڈاکٹر کے مکان کی جانب بڑھا۔

کرن کا ننھا کتا باغ میں گلہریوں کا پیچھا کر رہا تھا . . . پھر معاً نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ اوتشا غسل خانے سے نکل کر برآمدے میں چلتی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہونے کو ہے . . . .

"اوتشا!" اس نے بے اختیارانہ آواز دی

اوتشا نے گھوم کر دیکھا . . . وہ رک گئی۔

کیلاش لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

ادشا نے گھوم کر بے بسی کے انداز میں اس کی جانب دیکھا اور پلکیں جھکا لیں۔ کیلاش زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے . . . .

"ادشا تمہیں زندہ و سلامت دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کی بہترین خوشی حاصل ہوئی ہے۔ مجھے ایسے الفاظ نہیں ملتے کہ جن کے ذریعے سے دلی جذبات کا اظہار کر سکوں۔"

اس نے قدرے توقف کیا۔ ادشا نے جواب میں کہا: "میں تقریباً مر چکی تھی لیکن چار دن کی زندگی باقی تھی اسی لئے بچ نکلی . . ."

"چار دن کی زندگی . . . کیوں ادشا اب ایسی اداس کر دینے والی باتیں تو مت کرو۔"

"اور کیا کہوں . . . آخر ایک دکھی انسان کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔"

"دکھی"! کیلاش نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سینہ پر رکھ دیا۔ "ادشا! میں کس قدر دکھی رہا ہوں یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن ادشا کے بوجھل اور گیلے بالوں کی لٹوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے حسبِ سابق حساس اور متحرک تھے . . . . کیلاش نے اسے گیلے کپڑوں اور تولئے سمیت بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اپنی پُرنم پلکیں اس کی آنکھوں سے چھوا دیں . . . دونوں کی آنکھیں مُند گئیں۔

دفعتہً کھٹکا ہوا اور ادشا اندر کو بھاگی اور کیلاش باہر برآمدے میں کرن کھڑی تھی وہ چلا کر بولی:

"ارے میں آپ کی راہ تک رہی تھی اور آپ اندر ہی نکل آئے۔"

۲۸

کیلاش نے ڈوبتے ہوئے سورج کی دھوپ میں اوشا کو اپنے مکان کے باہر کھڑے پایا۔۔۔ وہ تیزی سے بھاگ کر باہر نکلا — "کرن کہاں ہے۔"

"وہ نہیں آئیں آج کچھ مصروف تھیں۔"

یہ کہتے کہتے اوشا نے اپنے سانولے سلونے چہرے پر گری ہوئی لٹ کو نازک ہاتھ کی جنبش سے پیچھے ہٹایا — ہمیشہ کی طرح اس کی ہنسی کا انداز ناپختہ تھا۔ اس کے دل سے ہنسی اور مسرت کی طوفانی لہریں اٹھتی تھیں لیکن وہ ہونٹوں اور آنکھوں تک پہنچتے پہنچتے نہایت لطیف زیر و بم کی سی کیفیت پیدا کر کے رہ جاتی تھیں۔ اس کے لب پھر ہلے — "میں نے سوچا کہ آج تو میری یہاں آخری شام ہے کیوں آپ کے ساتھ سیر کرنے کی سعادت سے محروم ہوں۔"

"آخری شام" والے الفاظ سن کر کیلاش کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے کسی پر اپنا راز عیاں نہیں ہونے دیا تھا اس لئے ان حالات میں زیادہ کھل کر بات چیت نہیں ہو سکتی تھی تاہم کیلاش نے اپنا مدعا بیان کرنے کی دو ایک بار کوشش ضرور کی لیکن اوشا نے کبھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اوشا ایک ماہ تک واپس چلی جائے گی کیونکہ اب وہ ملازمت کرنے لگی تھی۔

ان دونوں کے مابین ایک بھدا سا سکوت طاری تھا۔ اگرچہ وہ بالکل دوش بدوش چل رہے تھے۔

اوشا نے مہر سکوت کو توڑا: "آپ چپ کیوں ہیں؟" کیلاش نے چپ چاپ

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان کے قدم اور سست پڑ گئے۔ اوشا نے
ان گھاٹیوں کی جانب دیکھا جو مدھم دھوپ میں کھنڈروں کے مانند نظر آ رہی تھیں۔ معاً
کیلاش رک گیا۔ "اوشا! میری جانب دیکھو۔"

اوشا کی نظریں زمین میں گڑ گئیں

"نہیں اوشا! سر اوپر اٹھاؤ۔"

اوشا نے بمشکل سر اوپر اٹھایا۔ کیلاش نے اس کا گول چہرہ دونوں ہاتھوں میں
تھام لیا اور قدرے تامل کے بعد بولا "تم کہتی ہو میں چپ کیوں ہوں۔ کیا سچ مچ
ظالم ہوں، کیا میں تمہیں خاموش دکھائی دیتا ہوں۔ کیا میری آنکھیں تم سے کچھ نہیں کہتیں؟
کیا میری ایک ایک حرکت سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا، کیا میرے بدن کا رواں
رواں محبت میں جل رہا ہے۔" اوشا کا چہرہ کیلاش کے ہاتھوں میں دمک رہا تھا۔
وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔

کیلاش نے بے چینی سے سر کو جنبش دے کر کہا "اب کہو چپ تم ہو یا میں۔
تم آئیں تو میں سمجھا کہ میں نے نیا جنم پایا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں اور نہ تمہارا اس طرح
مجھے زندہ سلامت ملنا بے معنی سی بات ہے۔ تمہیں تو ظالم اپنی دانست میں جان
سے مار کر چھوڑ گئے تھے لیکن جس طرح ہندوستانی دستے کے ہاتھوں تمہاری جان بچی اس
سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کسی کو تمہاری اشد ضرورت تھی۔ . . . وہ شخص
میرے سوا کون ہو سکتا ہے؟ لیکن جب سے تم آئی ہو تم نے عجب چپ سادھ رکھی ہے
. . . تمہاری آنکھیں بھی گہری ہیں۔ اتنی گہری کہ مجھے ان کی گہرائی سے ڈر
محسوس ہوتا ہے۔"

پھر کیلاش نے محسوس کیا کہ اوشا پر نقاہت غالب آرہی ہے۔ اس نے فوراً اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دیا اور دھیرے سے پکڑ کر قریب کی چٹان پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے نیم دراز ہو کر اس نے پیار سے اس کے بالوں کو پیچھے کی جانب ہٹایا اور پرسکون آواز میں پوچھا "کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"جی" اوشا نے زمین کی جانب دیکھتے ہوئے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے منظر کے بارے میں باتیں کر کے اس سے لطف اندوز ہوتے رہے پھر کیلاش سرک کر اوشا کے اور قریب چلا گیا۔ اوشا نے مزاحمت نہیں کی اور اس نے اس کے چہرے اور بالوں پر بڑی ملائمت سے اور پیار کے ساتھ پے بہ پے محبت کی مہریں ثبت کیں اور کہا "تم یقین نہیں کرو گی۔ اس طویل جدائی کے زمانے میں کوئی ایسا دن یا شاید کوئی ایسی گھڑی نہیں گذری، جب میرا ذہن تمہارے تصور سے خالی رہا ہو۔ اوشا میں درحقیقت عشق نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے ایک جیون ساتھی کی تلاش تھی۔ یہ طلب اور جستجو انسان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے لیکن مدت دراز تک میں سمجھ نہیں سکا کہ در اصل مجھے کیا شئے مطلوب ہے۔ اب سمجھ سکا ہوں کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ان بل کھاتے پگڈنڈیوں کی جانب دیکھو۔ مرد کا پسینہ ان میں جذب ہو چکا ہے لیکن اگر اس میں عورت کے پاؤں کے تلوؤں کی ہلکی سرخی بھی ملی ہوتی ہو تو کیا کہنے۔ تمہاری بابت میں نہ اچھی طرح سوچ سکا تھا اور نہ تمہیں سمجھ سکا تھا" کیلاش نے قدرے تامل کیا اور پھر سینہ میں ہوا بھر کر بولنا شروع کیا "اوشا۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ تم بہت پرانے ڈھنگ کی لڑکی ہو۔ تمہارا اتنی قدر بڑھا ہوا انکسار مجھے پسند نہیں تھا اور نہ ہے ۔ ۔ ۔"

"یہ میری مجبوری تھی۔ اور بس۔"

کیلاش نے نظروں ہی نظروں میں اوشا کی جھکی ہوئی پلکوں، بند لبوں بلکہ پوری ہستی کا جائزہ لیا اور پھر ہنس دیا ــــ "تمہاری مجبوری نے مدت دراز تک ہمیں بے چین اور برباد رکھا اور یوں مکمل تو کوئی انسان بھی نہیں ہے۔ ہم سب میں خامیاں اور کمزوریاں موجود ہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ عورت اور مرد دونوں برابر کے ساتھی ہیں۔ پتی پتنی دو بہترین دوست ہیں۔ خیر ان چیزوں کو جانے دو . . . ایک بات بتاؤ۔"

دونوں کی آنکھیں ملیں۔ "اوشا میں تم سے ایک سیدھا سادا سوال کرتا ہوں۔ اس کا جواب دو . . . کہو تمہیں مجھ سے محبت ہے؟" معاً اوشا کی آنکھیں بھر آئیں

اس کی آنکھوں کی کیفیت دیکھ کر کیلاش گھبرا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس نے بڑا احمقانہ سوال کیا ہے لیکن وہ . . . وہ . . . دراصل . . .

پھر یکلخت اوشا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی . . . کیلاش کی ہر کوشش کے باوجود وہ روتی رہی اور بالآخر چپ بھی ہوئی تو اس کی ایک ایک ہچکی اس قدر گہری تھی کہ اس کا تن بدن ہل جاتا تھا . . . صاف شفاف آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں کے گوشوں میں لرزاں تھے۔

"اوشا" کیلاش نے بوجھل آواز میں کہنا شروع کیا۔ "میں اپنے آپ کو بہت بڑا احمق محسوس کرنے لگا ہوں . . . سنو . . . آؤ ہم دونوں شادی کر لیں۔"

اوشا نے اس کے شانے پر جھکتے ہوئے بڑی کمزور اور مدھم آواز میں کہا "مجھے واپس لے چلئے . . . مجھے واپس لے چلئے۔"

۲۹

دوسرے روز خوب دن چڑھے جب کیلاش کی آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے سب سے پہلے اسے ڈاکٹر راجن کے گھر کی جانب پیچ و تاب کھا کر جاتی ہوئی پگڈنڈی دکھائی دی جس کے ساتھ اس کے دل کی مسرت انگیز اور اذیت دہ کیفیتیں وابستہ تھیں۔ گذشتہ شام جب اوشا اس کی شادی کی درخواست کا اثبات میں جواب دینے کے بجائے سر نیوڑھائے چپ چاپ بہکے بہکے قدموں سے راجن کے مکان کی جانب روانہ ہو گئی تھی تو یہ پگڈنڈی کس قدر اداس اور سپاٹ دکھائی دیتی تھی لیکن آج صبح کی تابناک روشنی میں اس پگڈنڈی پر زندگی کی تڑپ صاف نظر آتی تھی۔

کیلاش کو اس حادثے خیال کے تحت خوشی ہو رہا تھا۔ بعض اوقات مبہم سا خوشگوار جذبہ کسی آنے والے مسرت انگیز واقعے کی پیش گوئی کرنے لگتا ہے۔

وہ پھرتی سے اخبار جلدی سے ختم کرنے کے بعد نہا دھو کر کپڑے پہن اور شاداں و فرحاں آسمان یار کی جانب بڑھا۔۔ سیٹی اس کے ہونٹوں سے پھوٹی پڑتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اوشا نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہوگا۔۔۔۔ کوٹھی کے باغیچے میں سبزی کی کیاریوں سے گھاس پھونس صاف کر رہی تھی۔ کیلاش کی غیر متوقع آمد سے اسے تعجب تو ضرور ہوا جسے وہ بڑی ہوشیاری سے چھپا گئی۔

اس نے علیک سلیک کے بعد نظر بچا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی آنکھیں اوشا کو تلاش رہی تھیں۔ شاید وہ ابھی اندر سے نکلی ہی نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے پوچھا:

"آپ اکیلی معلوم ہوتی ہیں۔۔۔؟"

"اور کیا کروں۔ . . اوشا جب تک رہی میرا ساتھ دیتی رہی . . ."

"کیا آپ کی سہیلی چلی گئیں؟"

"جی ہاں . . . کیا آپ کو اس بات کا علم نہیں تھا؟"

کیلاش کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ اوشا کا تعاقب کرے لیکن یہ جذبہ جس قدر تیزی سے ابھرا تھا اسی تیزی سے دب گیا۔ لمحہ بھر کو اسے شک گذرا کہ شاید اوشا کی سازش سے اسے ٹھکرا دیا جا رہا ہے لیکن جس انداز اور انہماک سے کرن اپنے کام میں مشغول تھی اس پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

کرن نے پھر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "آپ نہ جانے کس دنیا میں رہتے ہیں۔ اس بات کا تو کئی بار ذکر ہو چکا تھا . . . حالانکہ میں نے بہت چاہا کہ وہ کچھ دن اور ٹھہر جائے۔"

کیلاش نے بظاہر روکھے پن سے کہا۔ "میں نے خیال ہی نہیں کیا۔"

اس کے سوچنے اور بولنے کی قوت زائل ہوتی جا رہی تھی . . . وہ چپ چاپ ٹہلتا ہوا ایک گاؤں کی جانب نکل گیا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کا راستہ تھا۔ اسے اس دوران میں بولنے کی ضرورت پیش نہیں آئی — گاؤں کے قریب پہنچ کر اس نے تامل کیا کہ اب وہ کہاں جائے۔ اسے پنڈت ہیرا کا خیال آیا جن سے پہلے بھی اس کی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ چنانچہ وہ اسی کے ہاں چلا گیا۔ کھانا بھی وہیں کھایا اور سارا دن لیٹے رہنے اور اس کی بے سر و پا باتیں سننے کے بعد واپس چلا آیا۔

جب وہ اپنے مکان پر پہنچا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور رات کی سیاہی کا غبار پھیلنے لگا تھا۔ ہر چہار جانب سکوت طاری تھا لیکن اس کے مکان کے چھپر سے لٹکے ہوئے چند تنکے زور زور سے ہل رہے تھے جیسے وہ اس بندش سے آزاد

ہو کر کہیں بہت دور اُڑ جانا چاہتے ہوں۔

تپائی پر چراغ جل رہا تھا۔ وہ قریب بچھی ہوئی کرسی پر دھڑام سے گر پڑا۔ بوٹوں کے تسمے کھولتے وقت تپائی پر اسے ایک لفافہ دکھائی دیا جسے دیکھ کر اسے تعجب سا ہوا کیونکہ پہلے تو اسے اس نے نہیں دیکھا تھا۔

اس نے لفافہ کھولا۔ لکھا تھا:

"میں نے بھاگ کر آپ سے دور جانے کی کوشش کی لیکن جا نہیں سکی۔ میں کس طرح چھوٹے سے قاتلانہ کی نظروں سے بچ کر واپس بھاگ نکلی، یہ مت پوچھئے..... البتہ اب کبھی واپس نہ جانے کی قسم کھا کر آئی ہوں۔ میرے پاس وقت کم ہے لیکن مجھے آپ سے دل کی دبی ہوئی کئی باتیں کہنی ہیں... اس لئے بے حیائی کے لئے معاف کیجئے گا.....

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پچھلے تیس دن میری زندگی کے بہترین دن تھے۔ اور کل شام میں نے آپ کے ساتھ زندگی کے بہترین لمحے گذارے۔

آپ کے ساتھ شادی کر کے باقی زندگی آپ کے ہمراہ گذارنے سے گریز اس لئے کیا کہ مجھے آپ کے انداز سے یوں محسوس ہوا کہ آپ کو مجھ پہ رحم آ رہا ہے یعنی آپ مجھے قابلِ محبت نہیں قابلِ رحم سمجھتے ہیں۔

آپ ہی کے قول کے مطابق آپ مجھ سے عشق نہیں کرتے بلکہ... جیون ساتھی کے متلاشی ہیں لیکن اُدھر میں نے جیون ساتھی پا کر کھو دیا ہے۔ آپ کے یہ جیون ساتھی والے الفاظ سن کر ایک لمحہ بھر تو میرے دل میں آپ کے لئے عجب قسم کی حقارت کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ جیون ساتھی کیا بلا ہوتی ہے۔ مجھے اس لفظ سے ہی نفرت ہے۔ مجھے معلوم نہیں

تھا کہ اتنے برس کی طویل تپسیا کے بعد آپ مجھے محض جیون ساتھی بنانے کے قابل سمجھیں گے جیون ساتھی تو مجھے بھی ملا تھا۔ جیون ساتھی تو آپ کو بھی ملی تھی۔ وہ آگ جس نے میرے تن من کو جلا کر فنا کر دیا ہے۔ کاش آپ کے من تک اس کی آنچ ہی پہنچی ہوتی۔ کاش! آپ نے ان طوفانوں کا خیال کیا ہوتا جو اس ننھے دل میں اٹھا کرتے ہیں۔ آپ نے ان جھکڑوں کی جانب دھیان دیا ہوتا جو اس دل کے لامحدود بیابان میں شب و روز چلا کرتے ہیں۔ جیون ساتھی تو بے حس مشینوں میں ڈھلا کرتے ہیں۔ مجھے جیون ساتھی نہیں چاہیئے۔ مجھے وہ دل درکار ہے جو میرے لئے اسی طرح سلگے جس طرح کہ میرا دل آپ کے لئے سلگتا ہے۔ بتایئے ان حالات میں جبکہ میری آبرو بھی کئی بار لٹ چکی ہو میں ایک جیون ساتھی سے کیا امید کر سکتی ہوں۔ ۔ ۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے آپ ایسے معمولی انسان سے عشق ہوا لیکن مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ مجھے آپ ہی سے عشق ہے۔ ہائے آپ نے مجھے کبھی پیار کے قابل نہیں سمجھا۔ سچ سچ میں آپ کے دل میں آگ لگانے کے قابل نہیں تھی؟ ۔ ۔ ۔ اب میں خودکشی کر رہی ہوں اور اس خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں کہ آپ میری اس طرح کی موت کو کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے کبھی نہ بھلا سکیں۔ بعض اوقات مجھے اپنی یہ خواہش بڑی شدید معلوم ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ لیکن پھر بھی ـــــ شاید میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر رہی ہوں۔ لیکن اگر کسی جذبے کا جامع و مانع اظہار نہ ہو سکے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ اس جذبے کی کوئی حقیقت نہیں ہے ۔ ۔ ۔"

کیلاش ہانپتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا کرسی الٹ گئی۔ اس نے پورے زور سے ونیتا کو آوازیں دیں۔

نیاٹی پر پڑا ہوا چراغ دھچکا کھا کر ڈگمگانے لگا۔

۳۰

وہ دوڑ کر گھر کے اندر داخل ہوا اور نوکر سے پوچھا "یہ چٹھی کہاں سے آئی ہے؟"

ملازم کے چھکے چھوٹ گئے۔ لفافے کو بغور دیکھتے ہوئے بولا "یہ تو بی بی جی نے لکھی تھی۔"

"کون بی بی جی؟"

"او تنہا بی بی۔"

"اب کہاں ہیں وہ؟"

"جی اندر رسوئی پڑی ہیں۔"

وہ جھپٹ کر اندر داخل ہوا۔

بڑی کھڑکی کے قریب بچھی ہوئی چارپائی پر اوشا آنکھیں موندے چپ چاپ لیٹی تھی۔

دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ چکنی مٹی کا بنا ہوا جان پڑتا تھا۔ بال بڑی بڑی لٹوں کی صورت میں کالے ناگوں کی طرح گویا کنڈلی مارے بیٹھے تھے۔ ابرو جو کبھی لچکتی کٹار تھے۔ اب بے حس و حرکت تھے۔ ہونٹوں کے گوشے جو کبھی ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپا کرتے تھے، اب ساکن تھے۔ لباس کی تہ تلے اس کے بازوؤں اور رانوں کی گدراہٹ اور پُرشباب سینے کی گولائیاں جس انداز سے اس وقت نمایاں تھیں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھیں۔

لفظ "اوشا" کیلاش کے گلے سے کسی وحشی کی چنگھاڑ کے مانند نکلا۔ وہ بجلی کے کوندے کے مانند بڑھا اور اس کے اوپر جا گرا۔

اوشا نے نقاہت سے سر کو جنبش دی۔ ۔ ۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ اس نے دروازے کی جانب دیکھا جہاں نوکر کھڑا تھا۔ کیلاش نے چلا کر کہا۔ "روشنی! روشنی!!"

نوکر چراغ اٹھا کر لے آیا۔

"جاؤ۔ ۔ ۔" کیلاش نے پاگلوں کی طرح پکار کر کہا "جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔ ۔ ۔ دوڑو!"

نوکر بھاگ کر باہر نکل آیا۔ اسے دور تک "دوڑو دوڑو" کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

اب اوشا نے کیلاش کی جانب دیکھا اور چند ثانیوں تک دیکھتی رہی۔ پھر اس کے لبوں پہ مبہم سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے نفی میں سر ہلا دیا جیسے کہہ رہی ہو، کہ اب علاج بیکار ہے۔

کیلاش نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے چہرے سے بال ایک جانب ہٹا دیئے اور اس کے خد و خال کو بغور دیکھنے لگا۔ پھر درد بھری آواز میں بولا۔

"اوشا! یہ تم نے کیا کیا؟"

جواب میں اوشا نے اس کی جانب خوابناک نظروں سے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے کمزور ہاتھ کو بڑھانے کی کوشش کی۔ کیلاش نے خود ہی بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اوشا کے چہرے کی جانب بس دیکھے جا رہا تھا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے۔ خیالات

اس کے ذہن میں مبہم پرچھائیں کی طرح آتے اور چلے جاتے تھے . . . وہ خود جیسے نرم نرم ریت میں نیچے دھنستا چلا جا رہا تھا . .

ڈاکٹر راجن جب ٹہلتا ہوا کیلاش کے مکان کے قریب پہنچا تو دھندلی روشنی میں اسے وہ کسی حرماں نصیب کے مقبرے کے مانند دکھائی دیا۔

راجن کو دیکھتے ہی کیلاش نے وحشیانہ للکار لگائی "اوہ راجن ! اس بیوقوف لڑکی کو بچاؤ کسی طرح سے"

راجن اوشا پہ چند منٹ تک جھکا رہا اور پھر پلٹ کر کیلاش کی طرف رخ پھیرا اور بولا "ابھی دوا لے کر آتا ہوں۔ کرن بھی آرہی ہوگی۔ تم اسے سونے مت دینا"

"لیکن اسے بچا لو ۔۔۔ راجن !" کیلاش نے بہ منت کہا۔

ڈاکٹر نے قدرے تامل کیا اور پھر جواب دیا "ایمرجنسی کیس ہے۔ وقت زیادہ گذر چکا ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر راجن باہر نکل گیا۔

کیلاش باہر تک اس کے ساتھ گیا۔ واپسی پہ وہ پھر دروازے پہ رک گیا۔

زندگی بھر اس کا ذہن اس طرح کبھی ماؤف نہیں ہوا تھا۔ کمرے کی ہر چیز کس قدر دھندلی، بے جان، ناآس اور مصنوعی دکھائی دے رہی تھی۔

کائنات کی بے پایاں وسعت میں وہ اپنے آپ کو قطعاً بے حقیقت اور بے دست و پا محسوس کر رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر چارپائی کی پٹی سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ اوشا شاید سو گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی۔ اوشا نے بمشکل من من بھر بھاری پپوٹوں کو اوپر اٹھایا۔ آنکھوں کی پتلیاں سمت ... سے گھوم کر کیلاش کے چہرے

پر آ کر رُک گئیں ۔ ۔ ۔ اور پھر اس نے پہاڑوں کی ڈھلانوں پر اوپر تلے بنے ہوئے کھیتوں کے خطوط کو دیکھا۔ رات بھیگ رہی تھی اور چاند اُونچے پہاڑ کے پیچھے سے سر نکال رہا تھا۔ اس کی روشنی میں اسے بل چلائے کھیت بہت بھلے لگ رہے تھے۔

وقت گذر رہا تھا۔ کیلاش نے بڑی مستعدی سے اسے جگائے رکھا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ نہیں مرے گی

اوشا زبانِ خاموشی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ دائمی نیند کو زیادہ عرصے تک نہیں ٹالا جا سکتا۔

اوشا نے یکبارگی بڑے غور سے کیلاش کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹ اور آنکھیں اسے یوں دکھائی دیں جیسے لکڑی کے کندے میں تراشی گئی ہوں۔ پھر اوشا نے بمشکل تمام کیلاش کا کالے بالوں سے ڈھکا ہوا سر اپنے سینہ پر دھر لیا۔ ۔ ۔ کیلاش نے مزاحمت نہیں کی

تھوڑی دیر بعد کیلاش نے محسوس کیا کہ اوشا کے سینہ میں دل کی کمزور دھک دھک مدھم ہوتے ہوتے بالکل ہی بند ہو گئی ہے۔

اس نے زور کے جھٹکے کے ساتھ سر اوپر اٹھایا۔ ۔ ۔

کھڑکی میں سے آسمان گہرے گدلے پانی کے طویل و عریض دریا کے مانند دکھائی دے رہا تھا جو دھیمی اور مستحکم رفتار کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہو۔ اور ستارے بتاشوں کی طرح سطحِ آب پر تیر رہے تھے۔

بڑا سا زرد چاند ایک بے برگ و بار پیڑ کی ٹنڈ منڈ آڑی ترچھی ٹہنیوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ ۔ ۔

اعتراف

بیمار خاوند کے پلنگ کے قریب بچھی ہوئی آرام کرسی پر دراز شاہدہ آنکھیں موندے اپنے خیالات میں گم تھی۔

بظاہر مریض کی آنکھیں بند تھیں، لیکن اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ آیا نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھیں بند تھیں یا وہ واقعی سو گیا تھا یا قطعاً بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے حساس نتھنوں کو جنبش تک نہیں ہو رہی تھی۔ سانس کم کم اور نامنظم طریقے سے آ رہی تھی۔ اس کی ناک بہت پتلی تھی۔ پتلی ناک خوبصورت سمجھی جاتی ہے لیکن وہ ضرورت سے زیادہ پتلی تھی جیسے وہ شکنجے میں دبا دی گئی ہو۔ نتھنے روئی کے پردے کے مانند باریک۔ وہ ہر وقت سرخ، نم دار اور متحرک رہتے تھے۔ نتھنوں کے اندرونی حصے بالوں کی فراوانی کے باعث بالکل سیاہ دکھائی دیتے تھے جو اگر نتھنوں سے باہر نکل آتا اسے چمٹی سے نوچ کر پرے پھینک دیا جاتا تھا۔

وہ کئی روز سے بیمار تھا۔ ڈاکٹر سمجھ چکے تھے کہ مریض کا بچ جانا ناممکن ہے لیکن مریض کی حسین اور جوان بیوی پر یہ راز افشا کرنے کا انہیں حوصلہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

شاہدہ شب و روز خاوند کی تیمارداری کیا کرتی۔ چوبیس گھنٹوں میں اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں موہوم سی چمک صرف اسی وقت پیدا ہوتی تھی جب رات کے دس بجے کے قریب اسے سیٹی کی ہلکی سی آواز سنائی دیتی تھی۔ اسے اس سے محبوب کی آمد کی اطلاع مل جاتی تھی۔ شوہر کے بیمار ہونے سے پہلے بھی — پچھلے چند مہینوں سے اس کا یہی معمول ہو گیا تھا۔ سارا دن ان چند کیف انگیز لمحوں کی یاد میں بیت جاتا تھا۔ اگر کبھی ناغہ ہو جاتا تو اس کا دم گھٹنے لگتا اور جان لبوں تک آ جاتی تھی۔

کل رات بھی اس کا محبوب ایک روز کے ناغے کے بعد آیا تھا۔۔۔ اور وہ دل ہی دل میں "بے پرواہ! ظالم!! بے پرواہ! ظالم!!" کی رٹ لگا رہی تھی کہ باہر سے سیٹی کی آواز آئی۔۔۔۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ جب کبھی ناغہ ہو جاتا تو وہ یہی سمجھتی تھی کہ اس کا محبوب کبھی نہیں آئے گا۔۔۔ سیٹی کی آواز سے گویا سوکھے دھانوں پر پانی پڑ جاتا۔

باہر رات پُرسکون اور ہوا خنک تھی۔

تاروں کی مدھم روشنی میں شاہدہ کی صورت پھیکی پڑتی ہوئی تصویر کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ وہ برآمدے کے سفید چوبی جنگلے پر بیٹھ گئی اور لان کے پرلے سرے پر اُگے ہوئے چیڑھ کے درختوں کے گھنے سائے کی جانب گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ اس کے بکھرے ہوئے گھنے اور سیاہ بال کالی گھٹاؤں کی طرح چاند سے مکھڑے کو گھیرے ہوئے تھے۔ آنکھیں خشک اور کھوئی کھوئی سی، بھرے بھرے ہونٹوں پر بے کیفی

کی تہ سی جم گئی تھی۔ بہ ہزار دقت وہ زبان نکال کر ہونٹوں پر پھیر لیتی تھی۔

اتنے میں بجری کے چٹخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دفعتہً اس کا محبوب آتا دکھائی دیا۔ لان سے ہٹ کر وہ بجری بچھی روش پر چل رہا تھا۔ قدم بہ قدم . . . اس کی عمر مشکل اٹھارہ یا انیس برس کی ہو گی کہ اس نے ٹھوڑی پر استرا پھیرنا شروع کر دیا تھا لیکن مونچھیں جن کی حقیقت نرم و نازک روؤں کے سوا کچھ نہیں تھی، ابھی سلامت تھیں۔ شاہدہ عمر میں اس سے چھ سات برس بڑی تھی لیکن نازک اندام ہونے کی وجہ سے اس کی ہم عمر ہی دکھائی دیتی تھی۔ نوجوان کی صورت سے مردانگی کے بجائے الہڑپن کا الھڑپن زیادہ عیاں تھا۔ چہرہ اس قدر بھولا تھا گویا منہ میں دانت ہی نہیں ہیں۔

اس نے آتے ہی شاہدہ کا ننھا منّا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ تنگ چولی کے دامن میں عورت کا سینہ پھیلنے لگا۔ اس نے شکایت کرنی چاہی کہ آخر اس نے ایک رات کا ناغہ کیوں کیا لیکن ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

"تم اداس ہو؟" نوجوان نے سرگوشی میں پوچھا۔

"نہیں تو" شاہدہ کے لبوں سے آہ سی نکل گئی۔ اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بے کیفی کی تہ معدوم ہوتی جا رہی تھی اور ہونٹوں کی شادابی ختم ہوتی جا رہی تھی۔

وہ آہستہ سے ہنس پڑا۔ اس ہنسی میں مسرت، رنج یا شرارت کا جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ لیکن یہ بے معنی ہنسی بھی نہیں تھی۔ یہ الھڑپن کی ہنسی تھی۔ بہار زندگی کی ہنسی تھی۔ جوانی ہنسا ہی کرتی ہے۔ پھر اس نے بند ہاتھ کھول دیئے اور اس میں چھپا ہوا عورت کا نسبتاً اجلا ہاتھ خرگوش کے ننھے بچے کے مانند کسمسانے لگا۔

شاہدہ کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے جواب سے محبوب مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس نے بھری ہوئی آواز میں کہا "چار روز سے سوئی نہیں، کبھی دو گھڑی کو آنکھ لگ بھی گئی تو کیا۔ شاید جاگنے کی وجہ سے چہرہ اتر گیا ہوگا۔ یوں بھی بے حد تکان محسوس کر رہی ہوں" . . . یہ کہہ کر وہ اپنا ہاتھ پیشانی تک لے گئی۔ پھر اس نے سر پیچھے کی جانب جھکا دیا جیسے گردن کو جھٹکا دے کر اس کی ساری تکان دور کر دینا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر سوجن آگئی تھی۔

"تم سو لیا کرو"

یہ سن کر عورت نے اس کی طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ "یہ سو لیا کرو" میں خود غرضی کی جھلک تھی۔ نوجوان نے محسوس کیا کہ اسے اس طرح نہیں کہنا چاہئے تھا۔ یہ خود غرضی ہی نہیں بلکہ سنگدلی تھی کہ خاوند بیمار ہو اور بیوی مزے سے پڑی سویا کرے۔ شاہدہ اس قسم کے جذبات کا اظہار پسند نہیں کرتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ ایسی والہانہ محبت جیسے وہ نوجوان اس کا عاشق نہیں بلکہ معشوق ہو۔ بعض اوقات اظہارِ محبت کرنے میں وہ خود بڑی گرمجوشی سے پہل کرتی تھی۔ وہ رخصت ہونے لگتا تو اس کے بازو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیتی اور کہتی "نہیں، نہیں، ابھی نہیں۔ ذرا تو رک جاؤ . . . آں، اور" وہ محبت سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی۔ اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کر کے لپٹ جاتی۔ . . . اس کی گرمجوشی کے مقابل اس کی اپنی محبت پھیکی نظر آنے لگتی ۔۔۔ اور جب کبھی وہ ایک روز کے ناغے کے بعد آتا تو اس کی بیقراری وحشت سے کم نہیں ہوتی تھی "کل تم کیوں نہیں آئے، غالباً نہیں یقین ہوگا کہ ناغہ کرنے کے بعد آؤ گے تو مجھے

بدستور زندہ سلامت پاؤ گے۔ آں ؟ کہو، کہو۔ لیکن یاد رہے۔ میں تمہیں خبردار کیے دیتی ہوں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔" پھر وہ اس کے سامنے چہرے کا بھوکی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہتی۔ "میں ڈرتی ہوں . . کسی روز تم ہمیشہ کے لئے میری آنکھوں سے دور چلے جاؤ گے اور پھر لوٹ کر نہیں آؤ گے . . . تمہاری راہ تکتے تکتے میری آنکھیں پتھرا جائیں گی . . . بالآخر میں مر جاؤں گی۔"

یہ الفاظ — بلند بانگ دعوے — یہ بنے بنائے گھڑے گھڑائے الفاظ — جنہیں کہنے پر شاہدہ مجبور سی ہو جاتی تھی . . . . وفورِ جذبات کے مقابل الفاظ کی کم مائیگی پر شاہدہ کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں لیکن بیشتر اس کے کہ آنسو ابھر آئیں آنکھوں کی نمی چوس لی جاتی۔

شاہدہ کی محبت اور وارفتگی کے باوجود نوجوان اپنے دل کے حال سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ خود اس کی شخصیت سے مرعوب ہو چکا تھا۔ وہ اس سے ہر بات کی جواب طلبی نہیں کرتا تھا۔ نہ وہ اس کی ہر حرکت پر نکتہ چینی ہی کرتا۔ کئی باتیں اس کی عقل کے حدود سے باہر تھیں۔ لیکن اس نے شاہدہ کو ان کی وضاحت کرنے کے لئے کبھی نہیں کہا تھا۔ وہ کسی طرح بھی اس کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ شاہدہ کا اپنے خاوند سے انحراف کرنا اس کی سمجھ سے باہر ہی رہا۔ وہ ایک بچے کی ماں بھی تھی اور پھر ایک مغرور پر عاشق بھی تھی۔ ادھر خاوند سے بھی اس کا رشتہ قائم تھا۔ اس کے کھانے پینے، کپڑے لتے اور دیگر ضروریات کی اسے خاص فکر دامن گیر رہتی تھی۔ اسے ان سب باتوں کا علم تھا۔ پھر بھی اس نے کبھی استفسار نہیں کیا۔ مبادا ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اسے شاہدہ سے دور رہنا پڑے۔ چنانچہ اس نے اس قسم کے سارے شکوک کو مدفون

کر دیا تھا . . . لیکن آج اس کی سوجی سوجی آنکھیں اور اس کا اترا اترا چہرہ دیکھ کر اس کے منہ سے اس قسم کے الفاظ نکل ہی گئے لیکن وہ فوراً اپنی محبوبہ کی دلی کیفیت کو بھانپ گیا۔ اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "نہیں شاہدہ! اپنا دل مت میلا کرو۔ دراصل میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ تم جانتی ہی ہو۔ مجھے اس معاملے میں کچھ کہنا ہی نہیں چاہیئے اگر تمہارے دل کو ٹھیس لگی ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں ۔۔۔ کیا فی الحقیقت ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے تم انہیں ملازم کے سپرد کر دو۔ آخر اس بات کا امکان بھی تو ہے تاکہ رتجگے سے تمہاری طبیعت بھی علیل ہو جائے۔ ایسی شاندار صحت تو پہلے بھی کب تھی کہ ان بدپرہیزیوں کی متحمل ہو سکو"

شاہدہ کو اس کی باتوں سے کچھ اطمینان حاصل ہوا۔ آہستہ سے بولی "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہاری دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتی ہوں . . . لیکن ان کی . . . وہ واقعی بہت سخت بیمار ہیں۔ بخار ان کے سر کو چڑھ گیا ہے۔ رات کے وقت دو دو گھنٹے کے بعد دوا پلانی ہوتی ہے۔ اگر میں ہی سو رہوں تو انہیں دوا کون پلائے . . . بھلا نوکر کا کیا بھروسہ ہے"

"درست ہے" کہہ کر نوجوان نے سر جھکا لیا۔

اس وقت وہ بھی اداس نظر آتا تھا۔ یا تو وہ حقیقتاً پریشان تھا یا پھر شاہدہ کا بیمار خاوند کی اس قدر انہماک سے تیمارداری کرنا اس کے لئے رنج دہ ثابت ہو رہا تھا۔ شاہدہ نے کم و بیش یہی اندازہ لگایا۔ وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ چہرہ جسے دیکھتے رہنے کی بھوک کبھی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس وقت اداس

اور کھویا کھویا سا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ وہ جنگلے پر چڑھ کر برآمدے میں چلا آیا۔ شاہدہ نے خاموشی سے اس کی جانب دیکھا اور پھر اس کے ترشے ہوئے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ آج اس کے ہونٹوں میں وہ گرمی وہ تڑپ نہیں تھی۔ پہلے وہ یہی سمجھی تھی کہ کچھ دیر بعد حرارت پیدا ہو جائے گی لیکن جب اس کا وہی حال رہا تو اس نے اپنا چہرہ قدرے پیچھے ہٹا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا:

"تم مجھ سے خفا ہو کیا؟"

وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ خوابناک نظروں سے شاہدہ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کے حیرت سے قدرے کھلے ہوئے ہونٹوں کے قریب اپنے ہونٹ لے گیا ۔۔۔ شاہدہ ٹوٹی ہوئی شاخ کے مانند اس کی آغوش میں گر پڑی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ جدا ہو گئے۔ وہ زیادہ دیر تک رکے رہنے سے معذور تھی۔

کمرے کو واپس آتے وقت اس نے بالوں کو انگلیوں سے ہموار کیا۔ بار بار بغل گیر ہونے کی وجہ سے کپڑوں میں جو بے ترتیبی پیدا ہو گئی تھی، اسے دور کیا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی بیمار خاوند کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

پچھلی رات کے یہ سارے واقعات فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گذر رہے تھے۔ آنکھیں موندے موندے اس نے سوچنا شروع کیا کہ کہیں آج وہ پھر ناخفا نہ کر دے۔ حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا لیکن وہ بیچاری اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ ۔ ۔ دفعتہً اس نے آنکھیں کھول کر ٹائم پیس کی جانب دیکھا ۔۔ ابھی آٹھ بجے

تھے محض آٹھ ــــ وہ دس سے پہلے تو کیا اُٹھے گا۔

آنکھیں کھول لینے کے بعد اب انہیں بند کرنے میں تامل سے کام لے رہی تھی۔ عجب کیفیت ہو گئی تھی اس کی۔ تپائی پہ رکھے ہوئے سبز رنگ کے شیڈ والے ٹیبل لمپ کی روشنی میں کمرے کی ہر شے جگمگا رہی تھی۔ یہاں تک کہ دواؤں کی رنگ برنگ کی شیشیاں بھی بڑی بھلی دکھائی دے رہی تھیں۔ البتہ مریض کے چہرے پر شیڈ میں سے چھن چھن کر سبز رنگ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ شاہدہ کی نظر شوہر کے چہرے تک پہنچ کر رُک گئی۔ اس کا لمبوترا چہرہ۔ بڑا سا سر۔ دبی ہوئی کنپٹیاں۔ بھنویں ناک کے اوپر آن کر مل گئی تھیں۔ اس کے پتلے بے رس ہونٹوں کے اوپر مونچھیں کانٹوں کی طرح سیدھی کھڑی تھیں۔ جسم دبلا پتلا۔ جلد چپچپی اور لجلجی سی۔ اپنے ننگے بدن اور شوہر کے عریاں جسم کے لمس ہی کے احساس ہی سے شاہدہ کے دل میں کراہت سی پیدا ہونے لگی۔

پھر اس کی نگاہ سامنے کی میز پہ رکھی ہوئی اپنی تصویر پہ جا پڑی۔ یہ بہت پہلے کی تصویر تھی۔ شادی سے پہلے بھی وہ اس تصویر کو بڑے انہماک سے دیکھا کرتی تھی۔ اسے اس صورت سے، اپنی صورت سے محبت تھی۔ ان دنوں اس کی جو بھابی بھی اسے دیکھتی تو کہتی "شاہدہ! تجھ پہ تو جوبن پھٹ پڑا ہے ری۔ بھئی اللہ کرے تجھے شوہر بھی تیری ٹکر ہی کا ملے۔"

سہیلیوں کی اس قسم کی باتیں اسے پسند نہیں آتی تھیں۔ جوبن پھٹ پڑنا، کافر جوانی، قاتل نگاہیں وغیرہ محاوروں ہی سے اسے سخت نفرت تھی۔ وہ ان باتوں پر سنجیدگی اور فلسفیانہ انداز میں غور کیا کرتی تھی۔ وہ حُسن کی تعریف سیدھے سادے الفاظ

میں سننا زیادہ پسند کرتی تھی۔ وہ اس بات کی خواہش مند بھی نہیں تھی کہ اس کا شوہر لازمی طور پر بے مثل حسن کا مالک ہو۔ وہ کہتی تھی کہ میں دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتی ہوں۔

پھر گھر میں اس کی شادی کا چرچا ہوا۔ چند مہینے اسی چہل پہل میں گذر گئے اور پھر شادی ہو گئی۔

پہلی رات کو وہ خاوند کے انتظار میں تن تنہا پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا خاوند رنڈوا ہے۔ خوبصورت بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی تھی۔ وہ مایوس نہیں ہوئی۔ وہ کب چاہتی تھی کہ وہ لازمی طور پر بانکا ترچھا جوان ہو۔ آخر ایسا محض اتفاق ہی سے ہوا کرتا ہے۔ لیکن جب اس نے ایک رات شوہر کے ساتھ گذاری تو اسے اپنی زندگی کے بھرپور ہونے کے احساس کے عوض عجیب کھوکھلا پن سا محسوس ہونے لگا۔ پہلی ملاقات بڑی مضحکہ خیز سی رہی۔ خاوند نے خاص التفات نہیں کیا۔ باتیں نہیں ہوئیں۔ اس کا گھونگھٹ الٹ دینے کے بعد جب دونوں کی نظریں ملیں تو مشاہدہ کہ اس کی آنکھوں میں کوئی جذبہ ہی دکھائی نہیں دیا۔ وہ روکھا پن، سرد مہری، اسے دیکھتے ہی شوہر پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا جیسے کوئی انہونی شے دیکھ لی ہو جیسے اس کے قریب آنے میں کوئی خطرہ ہو۔ اور یہ بعد بڑھتا ہی چلا گیا اور تو اور اس نے کبھی اس کے ہونٹوں کو بھی نہیں چوما تھا۔ کبھی اس کے گال کو چومتا تو پھر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے شوہر کے ہونٹ اس کے ہونٹوں کی جانب بڑھنا چاہتے ہیں لیکن پھر سخت مونچھوں کی چبھن سی محسوس کر کے رہ جاتی۔ اس نے کبھی پیار کا ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ جنسی تعلقات کے باوجود جذباتی طور پر وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور رہتے۔ یہاں تک کہ بچی کی پیدائش بھی انہیں ایک دوسرے کے قریب نہیں لا سکی۔ کبھی آپس

میں جھگڑا نہیں، خفگی یا رنجش پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی ازدواجی زندگی چھکڑا بن کر رہ گئی تھی جو ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

شاہدہ کا دل دکھ کے مزے سے آشنا ہو چکا تھا۔ نامعلوم سا درد کلیجے میں بیٹھ کر رہ گیا تھا۔

آغاز شباب سے لے کر اس لمحے تک کا زمانہ ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں تلے سے گزر گیا۔ آرام کرسی پر پیچھے کی جانب جھکے جھکے اس نے آنکھیں نیم وا کر لیں۔ ایک مرتبہ تو اس کی قوت ادراک قطعاً مفلوج ہو گئی تھی اور نہ کوئی احساس ہی باقی رہ گیا تھا۔

سامنے خاوند کی دھندلی دھندلی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ خاوند جو اس کے لئے صبح سے شام تک دفتر میں کام کرتا تھا۔ نہ معلوم کیا کچھ کرتا تھا۔ وہ خاوند جس نے اسے کبھی سخت کلمہ تک نہیں کہا تھا۔ اپنی ساری آمدنی اس کے سپرد کر دیتا۔ اس کے کپڑے لتے دیگر ضروریات کا دھیان رکھتا تھا۔ ۔ ۔ اس کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر شوہر کے چہرے پر جم گئیں۔ اس کے نتھنوں میں سے چند بال باہر کو نکل آئے تھے۔ جنہیں وہ بیماری کی وجہ سے نوچ کر پرے نہیں پھینک سکا تھا۔ ۔ ۔ دفعتاً اس کے لبوں میں سے ہلکی سی آواز نکلی۔ شاہدہ نے آنکھیں پورے طور پر کھول دیں۔

"پانی!"

شاہدہ نے فوراً پانی کا گلاس اس کے منہ کے قریب کر دیا۔ دو تین گھونٹ پی کر اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ پانی کے قطرے اس کی سخت مونچھوں پر لرز رہے تھے۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی زرد آنکھیں کھولیں اور بیوی کی نظروں سے نظر ملائی۔ معلوم ہوتا تھا وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں نہ معلوم کیا جذبہ تھا۔ شاہدہ وہیں زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ شوہر کے ہونٹ لرزے۔ "شاہدہ!!"

"جی"۔۔۔ پھر وہ بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد بولا۔ "شاہدہ!!

اس کی آواز میں لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔ شاہدہ نے ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔۔۔ "جی!"

شوہر نے ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، کہنا چاہتا ہوں۔۔ کئی دفعہ جی چاہا کہ کہہ دوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ نہ معلوم۔۔۔۔ ڈرتا تھا کہ کہیں تم بُرا نہ مان جاؤ۔۔۔!

یہ کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی ہمہ تن گوش ہے۔ پھر دفعۃً آواز آئی۔ "شاہدہ! مجھے تم سے محبت ہے۔ پہلی رات ہی سے۔۔۔"

شاہدہ کا جسم شدّت کی گرمی سے جھلس کر سرد پڑنے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ کھڑکی میں سے جھلملانے روشن تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر سر شوہر کے سینے سے چھوا دیا۔۔۔۔ وہ مر رہا تھا۔

پڑوس کے جھنڈ میں سے سیٹیوں کی آوازیں آتی رہیں۔۔۔ لیکن وہ ہچکیاں لے لے کر آنسو بہاتی رہی +

پہلا پتھر

- تب شاستری اور فریسی ایک عورت کو لائے جو بدکاری میں پکڑی گئی تھی۔ اور اس کو بیچ میں کھڑی کر کے کہا۔
- اے استاد! یہ عورت بدکاری کرتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔
- موسیٰ کے قانون کے مطابق ایسی عورت کو سنگسار کرنا جائز ہے، سو تو اس عورت کے بارے میں کیا کہتا ہے؟
- جب وہ اس سے پوچھتے رہے تو اس نے سیدھے ہو کر ان سے کہا: ”تم میں سے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ وہ پہلے اس کو پتھر مارے۔“

(یوحنا رسول ۔ آئت ۳، ۴، ۵، ۷)

۱

رندھ ہاتھ سے رکھ کر ہاری سنگھ نے جو کتابچہ کی طرف گردن
دروازے سے باہر نکالی اور ایک نظر شاہی اصطبل پر ڈالی۔ بگر
خاموش ہے دکھائی نہیں دی۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی دربان
... کسی کو آواز دے رہا تھا۔ وہ اس خیال سے آئی تھی کہ اندھیرے
ہر چیز کی ایک آدھ جھلک ملے بنا مشکل نہ ہو گی۔

شاہی اصطبل دراصل اصطبل نہیں تھا بلکہ یہ سردار رندھاوا سنگھ کی
شاندار حویلی تھی جسے باج سنگھ عرف باج اور اس کے بیٹے چیا شاہی
اصطبل کے نام سے پکارتے تھے۔ حویلی سب سے بڑی حویلی تھی اس
کی گنجائش کی۔ یہ حویلی ایک بہت بڑے صندوق کے مانند تھی۔ چھت کا
طول و عرض اتنا کہ پوری بارات کے لئے چارپائیاں بچھائی جا سکتی تھیں۔
بڑے بڑے ہال کمرے۔ دروازے آٹھ آٹھ فٹ اونچے۔ ان ہال کمروں
میں عظیم الجثہ سردار وہ تھا ... کے ساتھ ... کی طرح
بندھ ... کر چلا کرتے تھے۔ حویلی کا ایک حصہ نسل ... گھوڑوں کے رہنے
کے لئے وقف تھا۔ اس کے علاوہ حویلی کے اندر کی جانب بڑے دالان

کے گوشے میں ناملک فرنیچر مارٹ کے مالک بھی سردار جی ہی تھے۔ فرنیچر کا کارخانہ یہاں تھا اور شوروم حویلی کی دوسری طرف یعنی عین لب سڑک۔ باج ہمیشہ سنتری تھا۔ باج کی عنائی اور حرامزدگی کی دھشتی کے باعث سب کاریگروں کا، خواہ وہ کارخانے کے ہوں یا پڑوس کے، وہ استاد سمجھا جاتا تھا۔

حویلی کے بغل میں سڑک کی جانب چند دکانیں تھیں مع مکانات کے۔ یہ سب سردار جی کی ملکیت تھیں۔ آخر ان کے آباؤ اجداد جالندھر شہر کے باسی تھے۔ اس لئے اتنی سی جائداد کا بن جانا غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جب ۱۹۴۷ء کے آغاز میں مغربی پنجاب کے مسلمان بھائیوں نے اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں کا ناکہ بند کر دیا تو رفیوجیوں کی ایک بڑی تعداد مشرقی پنجاب میں آگئی۔ ان میں گنگی کا باپ دیوی داس بھی تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بنیا تھا۔ چنانچہ سردار جی نے حویلی کے بالکل بغل والی دکان اور مکان انہیں کم کرایہ پر دے ڈالا اور وہ وہاں پنساری کی دکان کرنے لگا۔ اس کی بیوی کو مسلمان بھائیوں نے حلال کر دیا تھا لیکن اس کا اپنی تین جوان لڑکیوں سمیت صحیح سلامت نکل آنا معجزے سے کم نہیں تھا۔ ان میں سے سب سے بڑی کا نام گنگی، اس سے چھوٹی کا نام بنتی اور سب سے چھوٹی کا سانولی تھا۔ سانولی اندھی تھی۔

گنگی خوبصورت اور بانکی لڑکی تھی۔ موقعہ پاکر سب سے پہلے باج سنگھ نے اس کی چمی لی تھی۔ بوسہ لینے کے سلسلے پر گنگی سہم سہم تو باج سنگھ

لیکن اس کے بعد باقی لوگوں کا راستہ بھی صاف ہو گیا۔ یہاں امیر غریب کی تخصیص نہیں تھی۔ سردار صاحب کے بیٹے، ان بیٹوں کے دوست اور کار ندے وغیرہ سب ایک آدھ چُسّی کی تاک میں رہتے۔ یہ بات نہیں تھی کہ ان میں سے ہر ایک کا داؤ چل ہی جاتا ہو۔ بعض تو دور ہی سے چٹخارے لینے والوں میں سے تھے۔ کیونکہ گلگی بقول لیبل کاٹنے والے حرّن کے بڑی چلتی پُرزی تھی۔ پُٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی تھی کسی کو۔ اور تو اور خود باج سنگھ جو بڑا دیدہ دلیر اور گھسڑم گھساڑ قسم کا آدمی تھا پُٹی سے آگے نہ بڑھ پایا تھا، تو بھلا دوسروں کو وہ قریب کہاں پھٹکنے دیتی تھی۔

مایوس ہو کر باج سنگھ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کارخانے کے دروازے ہی میں کھڑا رہ گیا۔ اس کے بازو کہنیوں تک لکڑی کے برادے سے اٹے ہوئے تھے۔ بینتالیس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی اس کا بدن اکہرا اور مضبوط تھا۔ صورت گھناؤنی ہونے سے بال بال بچی تھی۔ مونچھوں کے بال جھڑبیری کے کانٹوں کی طرح ہو گئے تھے۔ ہونٹ موٹے۔ ایک آنکھ میں پھولا۔ اونٹ کے کوہان کی طرح ناک کے نتھنوں سے بال باہر نکل آیا کرتے تھے جنہیں وہ چمٹی سے کھینچ ڈالتا۔ آج دس برس پہلے اس کی بیوی مر گئی۔ بیوی کے چھ مہینے بعد اس کی دلّی بچی بھی چل بسی۔

وہاں کھڑے کھڑے باج نے دیکھا کہ حسن جھل کا اسے احساس ہوا

تھا، وہ بالکل بے معنی نہیں تھی۔ کیونکہ حویلی کے یکے بعد دیگرے چار دروازوں
سے پرے باہر والے برآمدے میں برقی روشنی ہو رہی تھی۔ لکڑی کے چھوٹے
سے پھاٹک میں سے کچھ سامان اندر لایا جا رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا
تھا کہ ضرور کوئی نیا مہمان آیا ہے۔ جب سے مغربی پنجاب میں گڑبڑ شروع
ہوئی تھی۔ سردار جی کے یہاں کافی مہمان آ رہے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ان
کے ایک ہندو دوست اپنے بال بچوں سمیت آ گئے۔ ان کا ایک نوجوان
لڑکا تھا چمن ۔۔! اس کی گردن مور کی سی تھی اور آنکھیں شربتی۔ وہ بھی
گھکی کو دلچسپی کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ باج کے چیلے چانٹوں کا خیال تھا
کہ گھکی بھی اس پر مرتی تھی۔ باج کے دل میں حسد پیدا نہیں ہوا۔ وہ ان
چیزوں سے بالاتر تھا، کہتا "ارے ہمارا کیا ہے۔ ہم نے آتے ہی گھکی
کی چمیاں لے کر اسے کافی کر ڈالا۔ اب چاہے ٹُنڈا لاٹ بھی اس کی
چُمی لیا کرے ہمارے . . . سے" یہ کہہ کر وہ اپنی ایک ثابت اور
دوسری پھولا ماری آنکھ سے سب کے چہروں کا جائزہ لیتا۔

جب چمن کے گھر والے الگ مکان لے کر رہنے لگے تو پھر بھی
سردار جی کے یہاں چمن کی آمد و رفت جاری رہی۔ ادھر باج نے گھکی
سے زیادہ اس کی چھوٹی بہن نکی کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔

دروازے میں کھڑے کھڑے پہلے تو باج کے دل میں آئی کہ جا کر
نئے مہمانوں کو دیکھے۔ شاید کوئی 'لونڈیا' بھی ان میں شامل ہو۔ لیکن آج کا
کام بہت آیا ہوا تھا جسے جلد از جلد ختم کرنا ضروری تھا۔ "ہماؤ" اس

اس نے دل میں کہا: صبح سب کچھ سامنے آجائے گا۔

۴

دوسرے دن آنکھ کھلی تو تاج نے جلتا چمکتا سورج اپنی پیشانی پر چمکتا ہوا پایا۔

ادھر یہ ہڑبڑا کر اٹھا، ادھر بڑی سردارنی حسبِ معمول بھوری بھینس کی طرح دگڑ دگڑ دھبر چھاتیاں تھلتھلاتی، سینہ زوریاں دکھلاتی آگ بجھانے کے لئے برادہ لینے کے واسطے چھاج ہاتھ میں پکڑے اس کی جانب بڑھی۔

بڑی سردارنی کے جسم کا ہر عضو اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ چکا تھا۔ جتنی چیز جتنی موٹی، جتنی بھدی، جتنی کشادہ ہو سکتی تھی، ہو چکی تھی۔ اب تو یوں معلوم پڑتا جیسے ٹوٹ جانے والے پہاڑ کو پاؤں لگ گئے ہوں ایسے میں تاڑی ڈونہ سردارنی بڑی سرداری کے لئے ناکافی ثابت ہوئی۔ چنانچہ ہمیں ایک چھوٹی سردارنی بھی کہیں سے اڑا کر لانی پڑی۔ لیکن جب سے ان کے کوٹھوں میں پانی بھر آیا تھا، تب سے انہوں نے سرداریوں سے توجہ ہٹا کر ہر روز کئی کئی گھنٹے مسلسل گوربانی کے پاٹھ پر مرکوز کردی تھی۔

موقعہ ملنے پر بڑی سردارنی ضرورت سے زیادہ دیر تک تاج کے پاس کھڑی رہتی۔ گو یہ تاج نہایت مسکین بن کر کئی بار کہہ چکا تھا، "پرے دھی

سردارنی آپ بیالیس برس کی تو نہیں دکھائی دیتیں جی! . . . . جی! آپ تو مشکل سے تیس برس کی دکھائی دیتی ہیں۔"

اس پر تو بی سردارنی دل ہی دل میں پھولے نہ سمائیں اور نیسن (رخ) کی طرح مسکرا کر رہ گئیں، چھوٹے منہ بڑی بات۔ کون کہتا ہے کہ میں بیالیس برس کی ہوں۔

اس کے بعد وہ دروازے سے کندھا ٹکا کے کھڑی ہو گئیں۔ ایک ٹانگ سیدھی رکھتیں اور دوسری ٹانگ کو ذرا جھکا کر سیدھے ہاتھ سے ٹکا دیتی رہتیں۔ ٹخنے پوٹلوں سے ذرا ہی اونچی شلوار ان کے پاؤں پر سمٹی تھیں۔

باقر دل ہی دل میں سوچتا کہ کسی کی کمر تو شاید سردارنی کی پنڈلی سے بھی پتلی ہوگی۔

بالآخر جب سردارنی تیسرے روز سے چارپائی پر دو چیز کر لائیں تو ان کے پھوڑے کا زخم دیکھ کر باقر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا، بیچاری! پھر ایک نوجوان ساتھی کو نکلنے سے مخاطب ہو کر بولا، کیوں اوپر چلا! اگر یہ انگلی پھیلا کے تخمینہ لگائیں تو سردارنی کی چھاتیاں جتنی سینے سے باہر ہیں اس سے چار گنا سینے کے اندر دھنسی ہوئی ہیں۔

یہ کہہ کر اس نے پھیلا لی ہاتھ کی انگلی ڈالی تو اس کی چاروں برست سے اس کا بدصورت چہرہ اور زیادہ بھدا ہو گیا۔

بونگے نے جواب دیا" ابے تو سردار جی کو کیا سمجھتا ہے۔ اگر سردارنی چار گز زمین کے اندر ہے تو سردار جی دس گز جمین میں دبے ہیں۔"

باج نے بیٹھے بیٹھے مریل بونگے کو لات رسید کرتے ہوئے کہا۔

"اوئے چل اوئے مئوں دبا گھتر اڑا" جو بات یاد آئی تو پھر بولا۔" پر بونگیا گھگی کی کمر تو سردارنی کی پنڈلی سے بھی کم موٹی ہوگی۔۔۔"

"تو پھر کیا؟"

"ناتا۔۔۔ سوچو بھلا اتنی پتلی کمر۔۔۔ بہت پتلی کمر ہے جار! اتنا ناجک لک۔"

"اوہی!" بونگے نے مشفقانہ انداز میں کہنا شروع کیا" عورت کی کمر میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ مرد کی ساری طاقت چھاتی میں اور عورت کی کمر میں ہوتی ہے۔"

"اچھا!" گھاگ باج نے گال کے اندر زبان گھمائی۔

اسی اثنا میں چمن بھی ادھر آ نکلا۔ وہ ہر وقت چہکتا رہتا تھا۔ باچھوں میں سے ہنسی یوں پھوٹی پڑتی تھی جیسے وہ ریوڑیاں کھا رہا ہو۔ چلتا تو لہرا کے۔ بات کرتا تو بل کھا کے۔

بونگے نے کہا" ابے جھی! گھنیا جی تو آ گئے۔"

"گھگی بھی آتی ہی ہوگی۔" باج نے چھدرے دانتوں کی نمائش کی اور منہ سے ٹپکتی ہوئی رال کو مشکل روکا۔

بونگے نے پہلے تو چمن کو دل چھینک انداز سے دیکھا اور پھر ایک

آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ باج کی بغیر بھوئے والی آنکھ سے ملائی اور گلی میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا" جار! جیہ لونڈیا بھی گوپی سے کم نمکین نہیں ہے"

باج نے ایک اور لات رسید کی" بڑا ٹھرکی ہے بے تو"

رنگے نے بھاؤ بتا کر گانا شروع کیا" اوئے بھگت لبوب کبیر بھی تو فرما گئے ہیں کہ اوئے کچا منڈا اُڑن ورگا۔۔۔۔"

عین اس وقت چھوٹی سردارنی بھی کولھے مٹکاتی دھم دھم کرتی دروازے سے نکل کر وہیں آن پہنچیں۔

کہنے کو تو وہ چھوٹی سردارنی تھیں لیکن ڈیل ڈول کے لحاظ سے اگر بڑی بہن بھی تھیں تو وہ انہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھنیئے نے منوں روئی دھنک کر ہوا میں اڑا دی ہو۔ البتہ نقوش تیکھے تھے۔ رنگ نکھرا ہوا تھا چہرہ چینا چپڑا۔ اگلے دو دانتوں میں سونے کی میخیں۔

مشہور تھا کہ وہ سردار جی کی بیاہتا نہیں تھیں۔ بقول باج کچھ جبر جبر معاملہ تھا۔ باوجود موٹاپے کے چھوٹی سردارنی کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔ بڑی سردارنی کو حالات نے ذرا فلسفی بنا دیا تھا اور حالات ہی نے چھوٹی سردارنی کو "چل چل چنبیلی باغ میں تجھے میوہ ۔۔۔۔ الخ" بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی سردارنی کے سامنے لونڈے لونڈیاں آپس میں ہنسی ٹھٹھول کرنے سے کتراتی تھیں۔ لیکن چھوٹی سردارنی کے سامنے کھلے بندوں چھیڑ چھاڑ کا بازار گرم رہتا۔ گرما گرمی میں چھوٹی سردارنی کی کمر میں بھی ایک آدھ چٹکی بھر لی جاتی۔ جس پر وہ نوخیز لڑکی کی مانند کھلکھلاتی

بل کھاتی اور کھلکھلاتی تھیں۔ وہ رنگین محفلوں کی جان تھیں۔ ان کی عمر اگرچہ پینتیس سے تجاوز کر چکی تھی، تاہم سردار جی اب بھی ان کی نگرانی کرتے تھے۔ کیونکہ تبدیلی سرداری چلتی تو تمکنت کے ساتھ۔ جیتی تو تمکنت کے ساتھ۔ اس دوست نکلتا۔ محفلوں میں کھیل تماشے، جگتیاں لینے اور راستے ادا کرنے کے مواقع بڑی آسانی سے فراہم ہو جاتے تھے۔ شاذ و نادر ہی ایک آدھ بد تمیزی پر جس پہ جیسی بھی ہو جاتیں تاکہ کسی کو یہ جتا سکیں کہ وہ خود اول پر کڑی نگاہ رکھتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر جب وہ روٹھ جاتیں تو سب لڑکے اور لڑکیاں انھیں منانے لگتے۔ ان سے بدن کو [illegible] ان سے لپٹ لپٹ کر خوشامد کی باتیں آخر کار وہ مان جاتیں۔

چنانچہ اب جو وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو گویا نسیم سحری کی طرح آئیں [illegible] بیل [illegible] اور [illegible] آپ [illegible] آتا اور [illegible] اور [illegible] ان [illegible] مسخرہ [illegible] سے حاضر ہوا کہ تعجب [illegible] ہوئی کہ [illegible] آنکھیں اور [illegible] قہقہوں کی مسلسل جھڑی سے [illegible] دیکھا گیا۔

ان سب سے دور کمرے کے ایک کونے میں کسی جناتی بھوت کی سی طرح پڑے کرتے ہوئے سردار جی کے کان بھی ان آوازوں سے تھرتھرا [illegible] خطرہ محسوس ہو گئے۔ انھوں نے جلدی سے اپنے بڑے

بڑے بڑے دانتوں پر دونوں ہونٹ پھیلا کر بے بسی سے پہلو بدلا اور
غرا کر کہا:

"یا نگورو نام جاج سے جو چڑھے سو اترے پار۔"

۱۵

داتن کی آخری منزل پہنچ کر باج نے بڑا کنستر اٹھایا اور جھیل کے
پچھلے گوشے میں دستی نلکے کے قریب آیا۔

اب فضا نسبتاً پرسکون تھی۔ کچھ لوگ تو تھوڑی سرداری کو گھیرے تھے
باقی اپنے اپنے مشاغل میں کھو گئے۔

کنستر نلکے کے نیچے رکھ کر باج نے ہتھی کو دبایا۔ آخری بوند
بھی لگے کہ سامنے سے گوری جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی اس کی جانب آئی
اور آہستہ سے بولی: "کنستر اٹھاؤ تو۔۔۔"

باج کی خوشی کا ٹھکانا کیا تھا۔ داتن چاہنے چاہنے کے اس کا
جھک گیا۔ آنکھوں سے [illegible]
"لی گوری نے کل اسے۔"

"اسے دیکھ کل دل کچھ خوش ہے۔ لنستر اٹھا جیسے ہی۔"

باج نے دانت پیس کر ہاتھ جھٹکا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گوری چوٹ پی
تیز تھی۔ جب سے پیچھے ہٹ کر بدن چرا گئی اور تیم معشوقانہ انداز سے
چلا کر بولی: "ہم لیا کہہ رہے ہیں کنستر اٹھاؤ!"

"اری کنستر سے کیا بیر ہے . . . . ہماری ہر چیز سے بدکتی ہو۔"
"پانی پئیں گے۔"

باجی نے کنستر ہٹا دیا" لو جانی پیو اور جیو۔ جیو اور پیو۔"
نکی نے نل کے نیچے ہاتھ رکھ دیا اور تھوڑے انتظار کے بعد انجن کی سیٹی کی سی آواز میں چلائی۔" اے ہے . . . . دستی ہلاؤ۔"
باجی نے صوفیانہ رمز کے ساتھ جواب دیا" تم ہی ہلاؤ نا دستی۔"
"دیکھو تنگ مت کرو۔"
"اری نام نکی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تو سچ مچ نکی (چھوٹی) ہے۔"
چھوٹی نہیں تو کیا بڑی ہوں۔" نکی نے نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر شکایت آمیز نگاہ اس پر ڈالی۔
اب باجی نے بڑی فراخ دلانہ ہنسی ہنس کر دستی ہلانا شروع کی۔ پانی پی کر نکی بھاگنے لگی تو باجی نے فوراً اس کی کلائی دبوچ کر ہلکا سا مروڑا دے دیا۔
"اوئی۔"
"کیا ہے؟"
"میری کلائی ٹوٹ جائے گی۔"
"یہاں دل جو ٹوٹا پڑا ہے۔"
"چھوڑنا! کوئی دیکھ لے گا۔"

"اری کبھی ہم سے بھی دو بات کر لیا کر۔"

"کہا نا، کوئی دیکھ لے گا۔"

"تو پھر آئے گی نا ہمارے پاس۔"

"میں نہیں جانتی۔"

ایک اور مروڑا۔ رتّی کو واقعی سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ جان چھڑانے کے لیے بولی "اچھا اچھا آؤں گی۔"

"پکا وعدہ؟"

"ہاں۔"

"مار ہاتھ پہ ہاتھ۔"

ہاتھ پر ہاتھ مارا گیا۔

"اچھا دیکھ! اب کلائی چھوڑے دیتا ہوں، پر ایک شرط ہے۔ تو بھاگے گی نہیں۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا نہیں بھاگوں گی۔ چھوڑ اب کوئی دیکھ لے گا۔"

"بس دو منٹ بات کر لے ہم سے۔ جاد رکھیو جو تمہیں دھوکا دیا تو بالش پر لٹکا دوں گا۔"

ہاتھ چھوٹنے پر رتّی ننھی سی خوش وضع ناک چڑھائے اور ابرو بل ڈالے نیم رضامندی سے رکی رہی اور جگہ باج اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ ٹھمک کر بولی۔

"دیکھ اب۔"

بات کرتی ہو کہ ڈھیٹ مارتی ہو۔"

"اب جو تم کہو۔ جلدی سے بات کہہ ڈالو۔ [illegible] (وقت)

نہیں ہے۔"

"بدبخت۔ (وقت) نہیں ہے۔ کیا کہیں جا رہے ہو؟ جانا ہے۔"

"وقت۔ کوئی سن لے گا۔ مر جاتے . . ."

"سنے کیا؟"

"اداس ہو؟"

"ہائے میرے باپ دادی [illegible] کبھی کبھار بدمعاش سے بھی ایک آدھ بات کر لیا کر۔ . . اچھا بگی یہ بتا کہ تیری عمر کتنی ہے؟"

"سولہ برس۔"

"کہ آپ کی عمر ہے؟"

"[illegible] بس جانیں اب۔"

"[illegible] بھلا کیا عمر ہو گی؟"

"[illegible] ڈیڑھ دو سال بڑی ہو گی۔"

"اور سائرہ کی . . ."

"[illegible] کی ہو گی۔"

"لیکن بگی تو تو چودہ کی بھی نہیں دکھتی۔"

"دکھتی کیسے؟ بس"

"[illegible] ذرا دیکھوں۔"

سٹ"

تم کل مستی کیا اڑ رہی ہو۔ پہلے تو گنگی سی تھی۔ اب تم نے بھی پر

رکھ لئے ہیں۔ ۔ تم کیا اپنے سائے اڑا رہی رنگ دکھا رہی ہے تو

" اسے دیکھو سانولی کو کچھ مت کہو۔ وہ بچاری اندھی ہے۔ اس

سے یوں کیا بات مت کرنا"

" اور بھی تو پوچھو بات کرتی ہے۔ اگر اندھی تھی تو

کیا اترا تی ہو۔ " وہ رہی سانولی۔ سب چپ چاپ بیٹھے

بیٹھے ہیں"

ان کے دوسرے کونے میں دروازے کی دہلیز پر اندھی سانولی

نا ۔ تھالی جیسے سا بیٹھی تھی۔

کی نے ادھر دیکھا تو باتج سے پوچھا۔ سانولی جنم کی اندھی ہے

کیا؟"

"نہیں"

"تو کیسے ہوئی اندھی؟"

دیکھو بیکار بیکار باتیں کرتے ہو۔ ہم جانتے ہیں"

" بتا نا جیا۔ بتا تو دو" باتج نے اصرار کیا۔ وہ قریب یا کوٹول

دیکھنے کے لئے بے معنی باتیں کئے جا رہا تھا۔

"بھی ہم کچھ نہیں جانتے۔ لالہ (باپ) کہتا ہے وہ بچپن میں

اندھی ہوئی تھی۔ اب میں کیا جانوں۔ تو ہم بیٹھے"

"ارے ہیں، درفتے ہیں، سانولی کے پاس کون کھڑا ہے؟"

نکی چلتے چلتے رُک گئی۔ "ہم نہیں جانتے"

ملّن باچھوں کو خوب کھینچ کر ہنسا۔ "تجھے معلوم نہیں . . . سبھی تو تیرے جا رہیں"

"دیکھ ہم سے بکواس مت کر . . . ہم اسے کیا جانیں۔ رات ہی تو آیا ہے"

"ارے رات والا . . . اچھا اچھا یاد آیا۔ میں نے اس وقت اندر سے باہر نکالا۔ سچ نکی میں سمجھا تم ہو . . . لیکن نکی تم . . . !"

نکی نے جھنجلا کر قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو ہم چلے"

اس پر بانج نے زور سے ناک صاف کی اور دستی ہلانے لگا۔

۴

لڈو سرپٹ بھاگتا ہوا آیا اور کارخانے کے دروازے کے دونوں پٹ اس قدر دھماکے کے ساتھ کھولے کہ اندر کام کرتے ہوئے بانج اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ رُک گئے۔ وہ قدرے حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگے کہ لڈو لیبلوں کی گڈیاں باندھنی چھوڑ کر بے وقت یہاں کیسے آن ٹپکا۔

اندر پہنچ کر خود لڈو کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس قدر دھماکے سے اپنی آمد کے جواز کے لیئے جو مواد اس کے پاس ہے وہ کافی

اور مناسب ہے بھی یا نہیں ۔ بہرحال اس نے ہانپتے ہوئے گردن
گھما کر سب کی طرف دیکھا اور بولا " جاردو ! آج بڑی مزے کی بات
دیکھنے میں آئی ۔"

مزے کی بات !! ــ اس وقت گیارہ بجنے کو تھے ۔ کاریگر مسلسل
کام کر رہے تھے ۔ اس لئے وہ مزے کی بات سننے کے موڈ میں تھے ۔
اُدھر بانٹ سنگھ نے صبح باسی تنٹے سے سر دھویا تھا ۔ اس کے بالوں سے
ابھی سڑی لسی کی بساندھ دور نہیں ہوئی تھی ۔ اس نے بھی موقعہ غنیمت جانا
کہ مزے کی بات سننے کے ساتھ ساتھ وہ بالوں میں کنگھا کرے گا ۔ اس
طرح جب اس کے بالوں کے اندر تک ہوا پہنچے گی تو بال سوکھنے کے ساتھ

بساندھ بھی دور ہو جائے گی ۔

چنانچہ اس نے اپنا چھاڈرا سا کنگھا اٹھایا اور لمبے داڑھی میں اڑس کر
بولا :

" ابے لڈو ماؤں کے متراڑ ! جب سے تو پیدا ہوا ہے آج تک
تو نے کوئی مجھے دار بات نہیں سُنائی لیکن آج تو بینڈ کی کو بھی تر کام والی
مثال تجو پر لڈو ہوتی ہے ۔ . . . . اچھا بول بیٹے بجو رہے ۔"

حالات موافق پاکر باقی کاریگر بھی پنڈے کھجاتے ہوئے لڈو کے
قریب آگئے ۔ ان میں مونوں (منڈے ہوئے سروالوں) نے بیڑیاں جلا کر
دانتوں میں داب لیں ۔

اس غیر متوقع خوشش آمدید سے لڈو کی جان میں جان آئی۔ اس نے گھگھیا کر ایک بیڑی طلب کی ـــ جو تھوڑے ناک بھوں چڑھانے کے بعد دے دی گئی۔ اب لڈو نے بڑے اہتمام کے ساتھ بیڑی کو جلایا۔ یہ توقف حاضرین کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ باج نے دھتی رسید کرنے کے انداز سے پاؤں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا: "اوئے کھین منہ مکین جلدی سے اُگل ڈال۔ سلسلے ہم تیری سنے بنے کے نوکر تو نہیں کہ بیٹھے منہ تکتے رہیں تیرا۔۔۔"

"جبار آج بڑے مزے کی بات ہوئی۔" لڈو نے اس طرح بات شروع کی جیسے اُبلتے ہوئے پانی کی کیتلی کا ڈھکنا کھٹ سے اُڑ جائے۔ "آج صبح جب باج نکی ہے۔۔۔ باج نکی ہے۔۔۔"

باج نے خونخوار تیور بنا کر کہا "اوئے تیری بہن کو چور لے جائیں تا ہماری ہی بات ملی سنانے کو۔۔۔"

"نہیں نہیں جی۔" لڈو نے خالص پنجابی لہجے میں حلق سے گھسا کر آواز نکالی "بادشاہو! آپ کی بات نہیں ہے۔ وہ تو گگی کی بات ہے۔"

ایک کاریگر نے اشارہ کر کے ساتھیوں سے کہا "یہ چونگا بھی ٹھرکی ہے اور گگی پر ٹھرک جھاڑنے والوں میں شامل ہے، ہاں تو برخوردار کیا بات ہے گگی کی۔۔۔"

"او جی جب چھوٹی سردارنی اکھاڑ میں لگی ہوتی ماسٹر تارا سنگھ کی

تصویر سب کو دکھا رہی تھیں تو گھگی اور چمپن کی بجریاں ملیں۔۔ [illegible]
دیکھ رہا تھا چپکے سے "

"تو تو دیکھا ہی کرتا ہے گھگی کو۔ پوسالے" چمپن نے تتنا کر [illegible]
ہیں تو نے آنکھ اٹھا کر بھی دکھائی ہوں گی گھگی کی"

[illegible] لڈو نے [illegible] سے [illegible] منہ بسورا [illegible]
جاتی "جھی [illegible] مت کہہ رہا ہے گو گھگی [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] دکھائی ہوں گی اس کی [illegible]

۔۔۔ بول مجھ سے بول"

[illegible] پھر کیا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں [illegible] اٹھا [illegible] اور [illegible]
[illegible] گھگی [illegible] کے ساتھ [illegible] چل دی"

"کہاں چھت کو"

"ارے نہیں۔۔۔۔ اس [illegible] اپنے گھر کو گئی۔ تھوڑی دیر
بعد [illegible] [illegible] دیکھا نے جا [illegible] (سردار جی کا بڑا لڑکا)
نے [illegible] کیا۔ [illegible] جلدی آنا [illegible] دیکھا نے [illegible] کیا کرتے ہو۔
اس پر چمپن بڑی [illegible] ہنستا ہوا پچھلے [illegible] میں چلا گیا، جہاں سے کہ
چھت کو سیڑھیاں جاتی ہیں"

ایک دو نے جماہی لے کر کہا "[illegible] لڈو کے [illegible] یہ سب پرانی
باتیں ہیں، روز کا قصہ ہے۔۔۔"

"ارے سن تو" لڈو نے [illegible] کی "سب کی نظر بچا کر میں بھی

گیا پیچھے۔ اور ہی جب اوپر پہنچا تو دیکھا کہ سیڑھیوں کا دروجہ بند ہے۔
بس جی یہ دیکھ کر میری پھونک نکل گئی۔"

"باج بھنسا" سالے تیری پھونک تو اچھی طرح نکلنی چاہیئے پھول کے
گیارہ ہو رہا ہے۔"

لڈّو نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ پہلے تو
میں سمجھا کہ دروجے کے پاس ہی کھڑے ہوں گے، مگر کوئی آواج سنائی نہیں
دی۔ دراڑ میں سے جھانکا تو چھت پر بھی کوئی صورت نہیں دکھائی دی۔
پھر میں نے سوچا کہ جرور برساتی کے اندر بیٹھے ہوں گے۔"

"بڑی جسوسی دکھائی تو نے۔"

لڈّو نے بیڑی کا کش لیا۔ "میں نے نیچے اوپر سے ہاتھ ڈال کر
چٹکنی سرکادی۔ یہ دیکھو میری بانہہ پر کھون جم گیا ہے . . . !"

"آگے بول۔"

"چھت پر سے ہوتا ہوا میں برساتی کی طرف بڑھا۔ اینٹوں کی جالی
میں سے دیکھا کہ وہ دونوں اندر چارپائی پر کچھ بیٹھے اور کچھ لیٹے ہیں۔"

ایک کاریگر بولا "لیکن کھکی وہاں کیسے پہنچی؟"

لڈّو کو اس کی حماقت پر بڑا رحم آیا۔ "جار! تم بھی بس . . .
چھت سے چھت ملی ہوئی جو ہے۔"

"تو تو بڑا اکلمند (عقلمند) ہے۔ اب آگے چل۔"

"بس آگے کیا پوچھتے ہو، بڑے مجے میں تھے دونوں۔ کھکی کا منہ

تو لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اتی پیاری لگ رہی تھی کہ جی چاہا کہ بس جا کر لپٹ ہی جاؤں۔"

"واہ رے بجو رے"۔ باج بولا "اب تو ایہہ بات پکی ہو گئی کہ معاملہ تمی چھاتی تک ہی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا پھر کیا ہوا؟"

"بڑے پریم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ چمن تے گھکی کے منہ کے آگے سے بال ہٹا کر خوب بھینچ بھینچ کر ۔ ۔ ۔ ۔"

"ارے یہ سب تو ہوا ہی ہوگا۔ جیہہ تو بتا کہ باتیں بھی ہو رہی تھیں کچھ؟ جیہہ تو معلوم ہو کیا ارادے ہیں ان کے۔"

"پھر گھکی نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھا "چمن تم سچ مچ مجھی سے پیار کرتے ہو" ۔ ۔ ۔ ۔ چمن نے مور کی طرح گردن ہلائی اور بولا "سچ مچ"۔

"مجھے یقین نہیں آتا"۔

"ظالم۔ ظالم۔ ارے ہم تو جان چھدا کرتے ہیں"۔

"گھکی نے یہ سن کر سر نیچا کر لیا اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس پہ چمن نے پھر اسے سمیٹ کر اپنی گود میں لے لیا اور کہنے لگا "کہو تو آسمان سے تارے توڑ لاؤں، کہو تو اپنی چھاتی چیر کر ۔ ۔ ۔" گھکی نے اس کے ہونٹوں پہ انگلی رکھ دی اور پھر لیے بولی جیسے سپنے میں بول رہی ہو "تم تارے مت توڑو۔ اپنی چھاتی مت چیرو ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ۔ ۔ ۔ مجھے اپنی داسی بنا لو"

"داسی! داسی؟ ارے تم رانی ہو رانی۔ داس تو ہم ہیں تمہارے۔"

"گھکی کچھ دیر چپ رہی۔ پھر بولی "تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ مجھ سے شادی کر لو نا۔"

جیسے چمن کر چمن بدک گیا۔ جیسے گھکی خوب صورت لڑکی نہیں، ناگن ہو اور وہ اسے بڑی عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس وقت گھکی کا سر جھکا ہوا تھا۔ ساتھ اپنے خیال میں مگن بولی "میں غریب کی لڑکی ہوں۔ ہر کوئی مجھے بھوکی نظروں سے دیکھتا ہے۔ ہر کوئی مجھے کھا جانا چاہتا ہے۔ ... گھر سے باہر پاؤں رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ پھر بھی میں نے اپنی عزت بچا کر رکھی۔ مگر تمہارے آگے میرا کوئی بس نہیں چلا۔ سوچو اگر مجھے کچھ ہو گیا تو؟"

یہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس پر چمن نے اس کا ہاتھ تھام لیا "اری واہ رونی کاہے کو ہے۔ بے فکر رہو، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ پریم میں ایسی باتیں دن رات ہوتی رہتی ہیں۔ تم بڑی وہمن ہو۔"

"مگر میں تمہاری ہو چکی ہوں۔ سدا کے لئے تمہاری۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے میلے رنگ کے کرتے سے آنکھیں پونچھیں لیکن آنسو نہیں تھمتے تھے۔ ہچکیاں بھرتی ہوئی بولی "چمن! میں عمر بھر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ تمہاری نوکر رہوں گی۔ تمہارے اشارے پر ناچوں گی۔ لالہ کو

میری بڑی پھکر لگی ہے۔ ماں ہے نہیں۔ میں ہی سب میں بڑی ہوں۔ مجھے چھوٹی بہنوں کا بھی کھیال کرنا ہے۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ مجھے چھوڑنا نہیں۔"

"ارے ہے ہے، تمہیں کون چھوڑتا ہے۔ پگلی ہوئی ہو گیا ہے؟"

اس پر گنگی نے بھیگی آنکھوں سے چمن کی طرپھ دیکھا اور بولی "نہیں تم وادا کرو کہ مجھ سے سادی کر لو گے۔ ۔ ۔ ۔ میں بڑی منہ پھٹ ہوں۔ بے سرمی ماپھ کرو۔ مجھے اپنی بنا لو۔ میں کھوب پڑھ لکھ لوں گی اور جیسا تم کہو گے ویسا ہی کروں گی۔"

"جیہہ کہتے کہتے گنگی کا سر جھک گیا اور اس نے مدھم آواج میں پوچھا "کہو مجھی سے سادی کرو گے؟" اور جب اس نے پھر چمن کی طرپھ دیکھنے کو سر اٹھایا تو چمن نے جھٹ سے اس کا سر دبا کر چھاتی سے لگایا "ہاں ہاں جی۔ تجھی سے سادی رچاؤں گا۔ اری تم میں کمی کس بات کی ہے۔ تم سندر ہو۔ ہجاروں میں ایک ہو —— لو اب چلو تم بھی گھر کو جاؤ۔ نہیں تو نیچے والے سک کریں گے۔ ۔ ۔"

"جیہہ سنکر میں بگٹٹ بھاگا وہاں سے۔"

۵

دوپہر کے وقت گرمی کی وہ شدت ہوتی تھی کہ کیا کارخانے کیا پریس سبکے کاریگر سبھی کام چھوڑ کر الگ بیٹھ جاتے۔ دن کا یہ حصہ

سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا تھا۔ فرصت کا سماں ہوتا تھا۔ حویلی جی بھر کر کشادہ تھی۔ چھوٹے بڑے متعدد کمرے، ان میں اونچی اونچی الماریاں۔ کرسیاں میزیں، پلنگ، صندوق ـــ غرض آنکھ مچولی کھیلنے کا پورا سامان میسر تھا۔

باج سنگھ تنور سے روٹی کھا کر لوٹا تو سیدھا حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔ بڑے سردار جی کے سوا، حسب معمول سبھی لوگ موجود تھے۔ لیکن بڑی سردارنی سب سے الگ تھلگ پہلے بڑے کمرے میں براجمان تھیں۔ دوسرے کمرے سے ہنسی ٹھٹھول اور خوش گپیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

آج تنور پہ روٹی کھانے کا باج کو کچھ مزا نہیں آیا تھا۔ دال میں پیاز راشن کے آٹے میں ریت۔ تنور والوں کی ایسی تیسی کر کے پیٹ بھرے بغیر ہی وہ لوٹ آیا تھا۔ جب وہ حویلی میں داخل ہوا تو قدرتی طور پہ سب سے پہلے اس کی نگاہ سردارنی پر پڑی۔ تعجب! آج وہ پان چبا رہی تھی۔ چھوٹی سردارنی تو خیر ہر کھانے کے بعد ایک آدھ پان کلے میں دبا لیتیں۔ نہ جانے کہاں سے لت لگی تھی انہیں۔ بڑی سردارنی کو پان چباتے ہوئے اس نے پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ ان کی باچھوں اور ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ نظریں چار ہوتے ہی سردارنی اس قدر بے دریغ انداز میں مسکرائیں کہ ایک بار تو باج ٹھٹک گیا۔ لیکن پھر سنبھل کر وہیں اینٹوں کے فرش پہ بیٹھ گیا اور اپنے ٹخنوں اور پنڈلیوں پر سے لکڑی کا برادہ جھاڑنے لگا۔

بڑی سردارنی نے اس کی جانب چوکی دھکیلتے ہوئے کہا: "باؤلے رے!
جمین پر کاہے بیٹھتے ہو چوکی پر بیٹھو"

"نہیں بڑی سردارنی! اینٹیں ٹھنڈی لگ رہی ہیں، مجا آرہا ہے۔
اچھا کرتی ہیں آپ جو دوپہر کو فرش پر پانی چھڑکوا دیتی ہیں۔ سچ بڑی سردارنی
بڑی دور کی سوجھتی ہے آپ کو ۔ ۔ ۔ سچ!"

یہ سن کر سردارنی نے چاہا کہ مارے خوشی کے پھولی نہ سمائے لیکن اب
اور پھولنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ چنانچہ اس نے پہلے تو کمال انکسار سے
سر جھکا دیا۔ پھر قدرے بھونڈے مستانہ پن سے نظریں اٹھائیں ۔ ۔ ۔

باج کو کوئی بات سوجھ نہیں رہی تھی۔ اس لئے اس نے پگڑی کے
اندر دو انگلیاں داخل کر کے سر کھجانا شروع کر دیا۔ سردارنی مشفقانہ
انداز میں بولی:

"روٹی کھا کر آرہے ہو؟"

"بھر مار کر کے آرہے ہیں۔"

باج کو برہم پا کر سردارنی بڑے مبالغے کے ساتھ پریشان ہوئیں
"آخر ماجرا کیا ہے؟"

باج نے ماجرا سنایا اور نتیجہ یہ برآمد کیا کہ "روٹی! ہائے روٹی!
تو بڑی سردارنی آپ کی ہوتی ہے۔ بلکتن شسرا روٹی کی نس نس میں سچ
جاتا ہے۔ نوالہ منہ میں رکتا ہی نہیں۔ بتاشے کی طرح گھلا اور چل اندر"

بڑی سردارنی کو تعریف و توصیف کے یہ فقرے ہضم کرنے کے لئے

خاصا پرانا یام (DEEP BREATHING ETC. —) کرنا پڑا۔
جب دم میں دم آیا تو ایک خاص سُر تال میں بولیں،
"کبھی ہمارے یہاں کھاتے بھی ہو؟"

"کبھی کھلاتی بھی ہیں آپ؟" چالاک باجی نے اسی سُر تال میں برجستہ جواب دیا۔

اس پر جلال میں آ کر جو بڑی سردارنی اٹھیں تو باجی کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین سے آسمان تک اودی گھٹا چھا گئی ہو۔

روٹی کھاتے کھاتے باجی نے پوچھا "کیوں جی! آج بڑے سردار جی بیٹھک میں کس سے بات چیت کر رہے ہیں؟"

سردارنی نے جھالردار پنکھا جھلتے ہوئے جواب دیا "معلوم نہیں۔"

گھر میں ایک ہی ٹیبل فین تھا بجلی کا، اور وہ جدھر بڑے سردار جی جاتے ان کا پیچھا کرتا۔

باجی نے نمک حلال کر ڈالنے کے خیال سے کہا "کیوں مذاق کرتی ہیں سردارنی! بھلا یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ ادھر بات چیت ہو رہی ہو اور آپ کو خبر نہ ہو۔"

سردارنی نے بڑے بڑھے کی طرح منہ کھولا لیکن دفعتاً اس کا دہانہ تنگ کر کے بولیں "جاسوس چھوڑ رکھے ہیں ابھی معلوم ہو جائے گا سب کچھ۔"

اسی اثنا میں چھوٹی سردارنی بغل والے کمرے سے نکل کر ان کے

کمرے میں داخل ہوئیں۔ بتیسی نکلی پڑتی تھی۔ سنہری کیلیں چمک رہی تھیں۔ حسبِ معمول لڑکیاں ان کے ساتھ تھیں۔ جب لڑکیاں ساتھ تھیں تو قدرتی طور پر لڑکے بھی ساتھ تھے .....

بڑی سردارنی کو چھوٹی سردارنی کے یہ چھچھن پسند نہیں تھے اور پھر اس موقعہ پر؛ چنانچہ اس نے تکیے سے ناک بھوں چڑھا کر ہاتھ کو ذرا SLOW MOTION سے گھما کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسے یقین تھا کہ پنچ بھی اس معاملے میں اس سے متفق ہیں۔ لیکن پنچ نے بڑی دیدہ دلیری سے اپنے جبڑے ڈبل دانتوں کی نمائش کی اور رومال اپنے سامنے پاکر اس نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا " جو بولے سو نہال . . . "

چھوٹی سردارنی معہ کمسن پریوں کے اور جنات کے دھوم دھڑاک سے آگے بڑھیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو ان کا ہاتھ تھامے گنگی چہکتی، پھدکتی چلی آرہی تھی۔

گنگی محض بانکی نہیں تھی بلکہ اسے اپنے بانکپن کا احساس بھی تھا۔ ہر نگاہ جو اس کے چہرے یا جسم پر پڑتی تھی۔ اس کا ردِ عمل اس کی ابروؤں کی لرزش، ہونٹوں کی پھڑکن یا جسم کی کسی نہ کسی حرکت سے ظاہر ہو جاتا۔

اس کے بعد نکی . . . . گنگی نوک پلک یا چہرے کے خدوخال کے لحاظ سے غضب تھی تو نکی بدن کے اعضا کی متناسب بناوٹ، خدو اور ترتیب کے اعتبار سے قیامت تھی۔ اس کی نظریں بڑی بہن کی طرح

دور تک نہیں پہنچی تھیں۔ وہ اس انسان کے مانند دکھائی دیتی تھی جو ویرانے میں بھٹکتا بھٹکتا دفعتاً میلے میں آ نکلے۔۔۔۔

رنگی کی چُندری کا دامن اندھی سانولی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا چہرہ اُوپر کو اٹھا رہتا۔ وہ بڑی دونوں بہنوں سے کم گوری تھی۔ خدوخال گوارا لیکن چہرہ بحیثیت مجموعی پُرکشش تھا۔ اسے اس بات کا مطلقاً احساس نہیں تھا کہ مُرلی والا اس کے بدن میں عمر کے ساتھ ساتھ کیا کیا تبدیلیاں کر رہا ہے۔ کیونکہ اس معمے کا احساس تو لڑکی کو آنکھیں چار ہونے پر ہی ہو سکتا ہے۔ وہاں ایک بھی دیکھنے والی آنکھ نہیں تھی۔ اس لئے آنکھیں چار ہونے کا وچار ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔۔۔

میلے چلتے باج کو اپنے کان میں آواز سنائی دی۔ "دیکھ!" کہ بونگا بھی اسے کارخانے میں نہ پا کر وہاں آن پہنچا تھا اور بھیرالی ٹپکاتے ہوئے بولا "جار! گھگی کی کمر تو دیکھیو۔ کیسی پتلی۔ کیسی لچکدار ہے۔ آنکھ نہیں ٹکتی اس پر۔۔

اوئے میں جٹی پنجاب دی
میرا رشتہ رنگا لک۔۔۔

معاً باج نے بونگے کو کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے کہا "دیکھ"

اوئے جیل گکڑ!!

جیل گکڑ پولیس میں لیبل پرنٹ کیا کرتا تھا۔ اس کی عمر چونتیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ پنچ بھی تھے۔ تعجب! وہ بھی سینگ کٹا کر

بچھڑوں میں شامل ہو گیا تھا۔ یہ راز باج کی سمجھ میں اب تک نہ آیا تھا لیکن آج اس نے دیکھا کہ کیسے جل ککڑ نے دیدہ دانستہ نکی کو دھکا دیا اور کیسے نکی نے معشوقانہ ادا کے ساتھ اس کی اس حرکت کو برداشت کیا لیکن آخر جل ککڑ میں رکھا ہی کیا تھا۔ اس کی مضحکہ خیز صورت کی وجہ سے ہی نو وارد نے اس کا نام جل ککڑ تجویز کیا تھا . . . . مگر عورت کے دل کو کون پا سکتا ہے . . . .

بڑنگے نے کہا "جاریہ تو دو ماہ ترپ نکلا۔ کیسا مسکین بنا تھا"۔

آج کل جل ککڑ زیادہ تر رنگین بشرٹ پہنے رہتا تھا جس کے کپڑے پر چینی طرز کے اژدہا ناچتے دکھائی دیتے تھے۔

سردار جی کے لڑکے بھی "جل ککڑی مار دا۔ سلطان بیگ مارا" کہتے ہوئے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے وہ نوجوان تھا۔ جو وہاں کوئی امتحان دینے کے لئے نیا نیا آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی باج نے پوچھا "اوئے ماں دیا پترا! ایہہ کون ہے"۔

"اوئے ایہہ بھی اپنا منڈا ہے۔ نواں داخل ہویا اے عینک دے مدرسے وچ"۔

"اچھا اچھا . . . . ایہہ تاں پرسوں ہی آیا ہے"۔

"آہو جی لونڈوں کی باتیں چھوڑو۔ اب ناریوں کی باتیں کرو"۔

پریوں کے اس قافلے نے زمین پر ڈیرے ڈال دیئے اور اُن کی خوش نوائیوں میں بڑی سردارنی اپنے آپ کو تنہا محسوس

کرنے لگی۔

"اوئے پرچی! چمن کہاں ہے؟"

ایک چھوٹا لڑکا (غالباً بڑی سرداری کا جاسوس) جو بیٹھک سے اُسی وقت وہاں آیا تھا بولا "چمن اُدھر بیٹھک میں بیٹھا ہے۔"

باج کو حیرت ہو رہی تھی: یہ کیا؟ گل اِدھر اور بلبل اُدھر؟ پھر اس کی سمجھ میں آیا۔ اس نے کن انکھیوں سے اس جانب دیکھا۔ وہ نظروں ہی نظروں میں سب کچھ سمجھ گئی۔ اس کے ہونٹ ہلے، پلکیں جھکیں، کمر لچکی اور پھر وہ معاشقہ ہو گئی۔ باج نے دل ہی دل خود بنا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھایا کہ ہم تفتیش کر رہے ہیں اور حسن کے چور کو حسن کے حضور میں حاضر کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے بلند آواز میں پوچھا "لیکن بھئی وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"اُدھر ایک جرنیل صاحب بیٹھے ہیں۔"

باج نے سوچا کوئی فوجی افسر ہو گا۔ یہ لونڈے ہر ایسے افسر کو ایک دم جرنیل بنا دیتے ہیں۔ پھر بولا "پر بائی! چمن کا وہاں کیا کام؟"

"چمن کے باوجی بھی بیٹھے ہیں۔"

اس سے مراد یہ کہ چمن کو باپ کی وجہ سے مجبوراً وہاں بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ "اچھا تو بچو چمن کو انہوں نے وہاں کس لئے بٹھا رکھا ہے؟"

باج نے جرح کی۔

"وہ فوج میں بھرتی ہو رہا ہے۔" لڑکے نے ہنس کے جواب دیا۔

اب باج نے ایک نظر بڑی سردارنی پر ڈالنا ضروری سمجھا اور پھر منہ ٹیڑھا کر کے اس کے ایک کونے میں سے سانپ کی پھنکار کی سی آواز نکالتے ہوئے بولا "ارے جی آپ کا چھوس تو بڑا ہوشیار لڑکا ہے" داد پاکر سردارنی ہاتھی کی طرح جھومنے لگیں اور بہت دیر تک جھومتی رہیں

جب چھوس لونڈے کو محسوس ہوا کہ وہ ایسی باتیں کہہ رہا ہے جن سے سب کو بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے تو اس نے مزید معلومات بہم پہنچانے کے لئے کہا "چمن ماما کے جا رہا ہے"

"ارے ماما کے کون جگہ کا نام ہے۔ وہاں تیری ماتیں رہتی ہیں؟ تو تم سے کیا؟" لونگے نے دبی زبان میں کہا تاکہ صرف باج سن سکے۔

سردارنی نے کہا "ارے ماما کے نہیں ننھیال کہو۔"

"کیا چمن ننھیال جا رہا ہے؟" سردارجی کے چھوٹے لڑکے نے سوال کیا اور ساتھ ہی پہلے تو مصنوعی تعجب کے مارے دونوں ٹانگیں خوب پھیلا کر اور پاؤں فرش پر جما کر بالکل بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اور پھر سمٹ کر جو کودا تو کمرے سے باہر اور بیٹھک کے اندر۔

"ارے چمن ہم کو چھوڑ کر ننھیال جا رہا ہے اور ہم کو خبر تک نہیں دی؟" لفظ "ہم" سے اس کا اشارہ گگی کی طرف تھا۔ یہ الفاظ سن کے کھڑے ہو کر سمجھے۔ اس وقت اس کی گڑیا گم تھی اور بچی زیادہ کھیلا ہوا نہ تھا اس کے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں جھول رہا تھا اور اس نے پرمعنی انداز میں کنکھیوں سے گگی کی جانب دیکھا۔ بیٹا گگی کو اس کی بات کا

مطلب پا لینے میں کیا مشکل پیش آسکتی تھی۔ اس کے دل میں ایسی گدگدی پیدا ہوئی کہ وہ اٹھ کر رقصاں وشاداں چھوٹی سردارنی کے ایک بازو سے اٹھ کر اس کے دوسرے پہلو میں جا بیٹھی اور بے حد سُریلی آواز میں بولی۔

"ہمیں پہلے ہی سے معلوم تھا۔"

گنگی نے یہ بات زیادہ زور سے نہیں کہی لیکن یہ اتنی بلند ضرور تھی کہ باتج اسے آسانی سے سُن سکے۔

اس پر باتج ٹھنڈا ہو کر ٹھنڈے فرش پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے غبارے میں سے دفعتاً ساری ہوا نکل جاتی ہے اور پھر اس نے ابرو ہلا کر اور مونچھیں پھڑکا کر بنگے کے کان میں کہا۔

"جارا سچ مچ یہ لونڈیا بڑی چلتی پرُزی ہے۔"

۶

ابت دارا!

آج سردار جی کے دونوں لڑکے دس بجے کا انگریزی شو دیکھنے جا رہے تھے۔ بڑے زور شور کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں نہ جانے کب کی پرانی نکٹائیاں برآمد کی گئیں۔ ایک مسہری لگانے کے بانس کے سرے پر بندھی تھی اور دوسری بڑے ٹرنک کے پیچھے سے گیند کی طرح گول مول کی ہوئی نکلی۔

چونکہ اس وقت چھوٹی سردارنی غسل کر رہی تھیں۔ اس لئے ان کی

پتیلیاں بے پانی ہی ہو کر ادھر ادھر لڑھک رہی تھیں۔ نکی بڑی سردارنی کے ساتھ باورچی خانے کے اندر بیٹھی تھی۔ ماں بانو پرسٹول کے پاس بیٹھی ایڑیاں کو رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ دوسری طرف وہ نیا نوجوان تھا۔ نکی حویلی کے پرانے دروازے کے آگے بنی ہوئی چھت کے نیچے چوکی کے بیچ والے حصے پر بیٹھی تھی اس کی دونوں کہنیاں اس کے گھٹنوں پر ٹکی تھیں اور دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اداس تھیں۔ چمن کو گئے بیس دن گزر گئے تھے۔ لیکن نکی کو اس کا ایک خط بھی نہ آیا تھا۔ حالانکہ دوسروں کو اس کی چٹھیاں آ چکی تھیں۔ ۔ ۔ ۔

اتوار کی وجہ سے چھٹی تھی۔ اس لئے کارنگیروں کی گہما گہمی نہیں تھی۔ البتہ باجے اور بولنگا موجود تھے۔ کیونکہ وہ مستقل طور سے وہیں پر مقیم تھے۔

دیواروں کی سفیدی کرنے کے [illegible] آنے والے پانچ فٹ اونچے سٹول پر پاؤں کے بل بیٹھا باجا داتن چبا رہا تھا۔ اسٹول کے ساتھ سٹ کر زمین پر بیٹھا ہوا بولنگا اپنے [illegible] چھوٹی قینچی سے ناک کے بال نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا۔

دور ٹھیک کی طرف سے ایک بڑے کنگھی کی آواز میں سردار جی پاٹھ کر رہے تھے۔ سردار جی کا پاٹھ اور باجے کی داتن دونوں مشہور چیزیں تھیں۔ ادھر سردار جی مسلسل کئی کئی گھنٹے پاٹھ کرتے میں بیٹھے رہتے۔ ادھر باجا نہ کر ضرورت پاکر [illegible] علی الصبح ہی منہ میں داتن اڑس کر بیٹھ جاتا۔ پہلے اسے چباتا پھر دانتوں پر گھساتا۔ [illegible] دانتوں پر گھساتا۔ یہاں تک کہ داتن ختم

ہو جاتی۔
بونگے نے اپنے کام سے فرصت پاکر اطمینان سے ٹانگیں زمین پر پھیلا دیں۔
بلند نشین باج نے اپنے تیزی سے چلتے ہوئے منہ کو لمحہ بھر کے لئے روکا اور بونگے سے مخاطب ہو کر دبی زبان میں پھنکار کر بولا "بونگیا! آج گگلی کچھ اداس ہے۔ شاید چھوٹی سردارنی کا انتجار ہو رہا ہے۔"
اس طرح بولنے سے باج کی مونچھوں میں پھنسے ہوئے تھوک کے قطرے اڑ کر بونگے کے چیچک مارے چہرے پر پڑے اور اس نے بھڑک کر اسٹول کو ذرا سا ہلا دیا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں لال چنگاری بنا کر کہا "اوئے ابھی ہلا دوں تو راج سنگھاسن سے سر کے بل نیچے گر پڑے۔ ہم پہ تھوکتا ہے؟"
اسٹول کے قدرے ہل جانے پر باج نے گدھ کے مانند بازو پھڑپھڑائے اور اس کی بات کی طرف دھیان دیئے بغیر بولا "کیول یہی بات ہے نا! ملکاں (چھوٹی سردارنی) کا انتجار ہو رہا ہے۔"
"اوئے نئیں"۔ بونگے نے نتھنے پھلا کر عالمانہ انداز میں جواب میں دیا۔
"پھیر کو را بخچے کا سسّی کو پنّوں کا۔ گوپی کو کنہیا کا انتجار ہے۔ سمجھے؟"
"سمجھا"۔ باج سے بھلا کیا بات چھپی تھی۔ اس نے بونگے کو غصّہ گرمانے اور پھر اس کی کسی حرکت بازی کا لطف اٹھانے کے لئے انجان پن کا ثبوت پیش کیا تھا۔
اب بونگے نے احتیاطاً اِدھر اُدھر دیکھا اور کسی کو قریب نہ پاکر ہلکا سا

نعرہ بلند کیا۔

"ہلٹے" رُوئے سخن گھگی کی جانب۔

"کیلہ ہے؟" باج نے پوچھا اور سمجھ گیا کہ بونگے کو مسخری سوجھ رہی ہے

"درد" بونگے نے جواب دیا۔

"کہاں؟"

"جیہہ تو میں مرجاواں تاں بھی نہ دستاں" بونگے نے خاص زنانہ آواز میں جواب دیا اور پھر قدرے سکوت کے بعد گانے لگا۔

"چھوڑ گئے بالم!

اکیلی مجھ نوں چھوڑ گئے"

فضا بونگے کی ٹرٹراتی آواز سے گونج اٹھی۔

اب دونوں چھوٹے سردار تیار ہو کر اندر سے نکلے تو اس شان سے کہ پہلے تو بڑے بھائی نے اندر سے چھلانگ لگائی تو گھگی کے اوپر سے کود کر صحن میں۔ وہ کچھ سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ دوسرا بھائی صاف کود گیا اوپر سے۔ گھگی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ جھجک کر بولی۔ ہمیں نہیں اچھا لگتا ایسا مذاق، اگر ہماری گردن ٹوٹ جاتی تو؟"

اس پر چھوٹے بھائی نے پنجاب کے مشہور لوک ناچ بھنگڑا کے انداز میں چند چکر پھیریاں لیں اور گلے کی گہرائیوں میں سے نہایت گھگیاتی ہوئی آواز نکال کر گیت کا بول دہرایا:

"چھوڑ گئے بالم!

اُدھر بڑنگا بھی بس تیار ہی بیٹھا تھا۔ فی الفور مچانی پر دو ہنٹر مار کر بین سُر میں گا اُٹھا:۔

"اکیلی مجھ کو چھوڑ گئے"

اس پر باج نے جو قہقہے لگائے تو وہ سیدھے آسمان کے اُس پار پہنچے۔ بڑی سردارنی معہ نکی کے باورچی خانے کے دروازے میں آن کھڑی ہوئیں۔ چھوٹی سردارنی بھی غسل سے فارغ ہو کر نکل آئیں۔ سانولی سمجھی ضرور کوئی مزے دار بات ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ نل کے پاس بیٹھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

چلتے چلتے چھوٹا سردار بھی بول دہراتا گیا اور بڑنگا بھی گرمی کھا کر سینے پر دو ہنٹر مار مار کر جواب دیتا گیا۔ صحن میں قیامت کا شور سن کر بڑے سردار جی اندر سے ہی کڑکے، ——— تو چھوٹے سردار بگٹٹ بھاگے۔ باج اسٹول سے کودا اور لڑھکتے سیمنٹ کارخانے میں جا گھسا۔ بڑی سردارنی اور نکی نے اندر سے باورچی خانہ کا دروازہ بھیڑ دیا۔ گھگی اُچھلی اور چھوٹی سردارنی نے اسے بغل میں دابا اور ایک بار پھر غسل خانے کے اندر۔۔۔۔

۷

[illegible] کے [illegible]تان اور [illegible]ان کے آگے [illegible] کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ باجے بج رہے تھے۔ گھر کے اندر کسی

تاریک گوشے میں چند عورتیں لالٹین کی ٹن ٹن کی سی آوازیں ٹوٹے پھوٹے
گیت گا رہی تھیں۔

گھنی کی شادی ہو رہی تھی!

چمن کے ساتھ نہیں۔

بارات آنے والی تھی۔ محلے کے لونڈے دوڑ دوڑ کر دولہا کی پیشوائی
کو جاتے لیکن بڑے بوڑھوں کی زبانی یہ سن کر کہ ابھی بارات نہیں آئی۔ تو
مایوس ہو جاتے اور چپ چاپ چوڑے ریوڑیاں چبانے لگتے۔

بیٹھک میں بڑے سردار جی اور اُن کے چند معزز اور بزرگ ساتھی
کالھ کے اُلوؤں کی طرح ساکت بیٹھے تھے۔ کبھی ایک آدھ بات ہو جاتی تو
سب اثبات میں سر ہلا ہلا کر اظہارِ اطمینان کرتے۔

پریس کے کاریگر سڑک کی جانب برآمدے میں کھڑے تماشہ دیکھ رہے
تھے۔ ادھر کارخانے کے کاریگر بغلیں بجاتے چھت پر چڑھ گئے۔ وہاں سے
دیوی داس کی نیچی چھت صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس نیچی چھت پر دس پندرہ
چارپائیاں بچھی تھیں۔ کیونکہ زیادہ براتیوں کے آنے کی امید نہیں تھی۔ چند بچے
اور عورتیں بے جان رنگوں کے کپڑے پہنے سست قدموں سے ادھر ادھر
کے کام کرتی پھرتی تھیں۔ قریب والے پیپل کے پیڑ کا تاریک سایہ چھت پر
پھیل رہا تھا ــــ اور باجے اٹک کراہ رہے تھے۔

چھت والے کاریگروں میں سے ایک سر ہلا کر بولا "تت تت عورت
کی بے وفائی کے بارے میں سنا تھا۔ لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔"

بو نگے نے نتھنے پھُلا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہنے کے لیے منہ پھیلایا
—— اور پھر نتھنے اور منہ دونوں سکوڑ کر رُخ دوسری جانب پھیر لیا۔
کاریگر کو تعجب ہُوا۔ اس نے باج کو کندھا مار کر کہا۔" کہو استاد! آج بونگے کو کیا ہو گیا ہے۔"
باج نے پہلے بھوسے ماری آنکھ دکھا کر بے رخی برتی۔ لیکن پھر چشم بینا سے شرارے برسا کر کہا" عورت کی بیوفائی نہیں، مرد کی بیوفائی کہو"
"یعنی؟"
"یعنی جیسے کہ چمن کو یہاں سے گئے تین مہینے گزر چکے ہیں اس نے ایک سطر تک نہیں لکھی گھکی کو"......
"اور گھکی نے؟"
"اس نے اپنے ہاتھ سے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اُسے کئی چٹھیاں لکھیں لیکن ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔"
اب بونگے نے بھی بولنا شروع کر دیا۔" چمن نے اپنے چار دوستوں کو لکھا کہ کسی نہ کسی طرح گھکی کو چٹھی لکھنے سے روکا جائے۔ ہر چٹھی اس کی یہ بات دہے کہ اگر میرے پَر ہوتے تو میں اُڑ کر آپ کے پاس آ جاتی۔ تنگ آگیا ہوں۔"
"اُدھر کہیں چمن کے پتا جی وہاں جا نکلے۔" باج نے بات آگے بڑھائی" ان کی موجودگی میں کہیں کوئی خط آیا تو انھوں نے پڑھ لیا۔ پہلے بیٹے کے کان مروڑے اور پھر یہاں آکر بڑے سردار جی کو بتایا۔ سردار جی نے

دیوی داس کو بلایا اور کہا "۔اوئے لونڈیا کی شادی کر دے جھٹ پٹ پندرہ دن کے اندر۔ نہیں تو دکان کھالی کر دے اور اٹھا بوریا بستر مکان سے بھی"۔ ایسے مشکل سمیں میں بھلا دیوی داس کہاں جاتا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "پرجی گریب کی لڑکی کی شادی بھلا اتی جلدی کہاں ہو سکتی ہے؟" چمن کے باپ نے کہا "آکھر تمہاری لونڈیا کو ایسے کمت لکھنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ جمین کی کھاک سر کو چڑھے۔ بڑے سردار جی نے ڈانٹ پلائی۔ اب میں نے کہہ دیا۔ جیادہ ریاتت نہیں نا ہوسکتی۔ پندرہ دن کے اندر اندر شادی کر ڈال کہیں، نہیں تو مکان اور دوکان دونوں سے کھا رج"۔

گفتگو اسی منزل پر پہنچی تھی کہ بڑی سردارنی جی بلبلی اوپر آنکلیں۔ اور حسبِ عادت باج کے قریب کھڑی ہو گئیں۔ اپنی آمد پر سب کو چپ دیکھ کر بولیں "بارات نہ جانے کب آئے گی؟"

ان کی بات ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ لوگ باگ چلا اُٹھے "بارات آگئی۔ بارات آگئی!"

شہنائیاں اور زور سے کائیں کائیں کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد سردار جی کا چھوٹا لڑکا دوڑا دوڑا آیا "اوئے گھبراؤ گھٹنی، دھت تیرے کی"۔

"کیوں خیریت؟ دولہا دیکھا؟ کیسا ہے؟" سب نے یک زبان ہو پوچھا۔

لڑکے نے بڑے واہیات انداز سے بازو ادھر اُدھر پھینک کر

جواب دیا "دھت تیری کی . . . چڑ می خود . . . بالکل چڑچڑا دکھائی دیتا ہے"

٨

جب ۴۷ء کے فسادات زور شور سے شروع ہوئے تو دہلی کے منشیوں اور کاریگروں کے وقت کا کچھ حصہ قتل و غارت، ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے گئے مظالم اور ان کی خواتین کی آبروریزی جیسے موضوعات پر صرف ہونے لگا۔ لیکن وہاں کی روزمرہ کی زندگی اور چہل پہل میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ سوائے اس کے کہ گھگی کی شادی کو تین ساڑھے تین ماہ گذر چکے تھے۔ ان تین مہینوں کے دوران میں چمپ دو چار دن کے لئے جالندھر آیا۔ انہوں نے الگ مکان کا انتظام کر لیا تھا۔ پھر بھی چمن سردار جی کے گھر کبھی کبھی آتا رہا۔ وہ گھگی سے بچ کر رہتا تھا۔ خود گھگی نے بھی بطور خاص ایک ... کی احتیاط برتی کہ اس کی چمن سے مڈبھیڑ نہ ہو۔

چمن نے سردار جی کے لڑکوں کو بتایا کہ بمبئی میں اس کی زندگی بڑے مزے میں کٹ رہی تھی۔ ارد گرد معشوقوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی۔ اس نے نیا آرٹ سیکھا تھا جس کا مظاہرہ اس نے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا کر کیا۔ اگر گھگی کی کوئی بات چلتی تو کہتا "ہندوستانی لڑکیاں بھی بس عجیب ہیں۔ ذرا ہنس کر بات کر لو تو گلے کا ہار ہو جاتی ہیں۔ فولش —— (FOOLISH) چائلڈش —— (CHILDISH)!!"

بالآخر وہ گھگی سے ایک بات کئے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

بظاہر گنگی پر اس کا کوئی خاص ردِ عمل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اب بھی چھوٹی سرداری کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی، ہنستی بولتی۔ لیکن اس کے دل کو گھن لگ چکا تھا۔ اس کا جسم نرم اور کمزور تو پہلے ہی تھا۔ لیکن اب تو بالکل ہی ہڈیوں کا ڈھانچہ سا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نہایت نازک اور شگفتہ چنبیلی کے مانند تھی۔ اور اگر مناسب حالات میں آ جاتی تو یقیناً اس کی مہک دور دور تک پھیلتی۔ لیکن اب وہ مرجھا کر خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے سے ایسا سنجیدہ وقار ٹپکتا تھا کہ اب کسی کو اس سے چہل بازی کرنے کی جرأت تک نہیں ہوتی تھی۔ اسے کھانسی آنے لگی تھی۔ جب کھانسی اٹھتی تو وہ اپنے کمزور سینہ کو چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تھام کر کھانستے کھانستے بے حال ہو جاتی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ بعض دیکھنے والوں کو اس کی حالت پر ترس آنے لگتا۔ لیکن وہ مسکراتی ہوئی اپنے خوش وضع سر کو پیچھے کی جانب پھینک کر اسے دائیں بائیں دو چار جھٹکے دیتی اور پھر بات چیت میں مصروف ہو جاتی تھی۔ البتہ اب آگے نکل گئی تھی۔ اسے بات بے بات پر اس قدر ہنسی چھوٹتی تھی کہ لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ پہلے گنگی ان محفلوں کی جان تھی تو اب لگی! گنگی کا رویہ پہلے بھی پُر وقار تھا۔ اب سینہ پر زخم کھا کر وہ اور سنجیدہ ہو گئی تھی۔ مگر لگی شروع ہی سے شوخ تھی اور اب میدان صاف پا کر وہ تڑپتی ہوئی بجلی بن گئی تھی۔ چھیڑ چھاڑ کی اس میں بہت برداشت تھی۔ اس لئے وہ گنگی سے زیادہ مقبول تھی۔ خفا ہونا تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔ کھٹنا، بننا، بگڑنا، چھوٹوں ہی اور بے بل ڈالنا، پیٹھ پہ ہاتھ نہ رکھنے دینا، یہ سب درست، پھر بھی وہ خفا نہیں ہوتی تھی۔ خواہ کچھ بھی ہو جاتے اس کی چہک اور چمک میں فرق نہیں آتا تھا۔

اب نکتہ سنجوں کے لئے یہ بھی کوئی راز کی بات نہ رہی تھی کہ نکّی کا خاص منظورِ نظر پریس کا وہی آدمی تھا جسے سب تحمل گنگا کہتے تھے لیکن سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ تھی کہ آخر اس کے پاس کون سی ایسی گیدڑ سنگی تھی جس کی وجہ سے نکّی سب کو چھوڑ چھاڑ کر اسی کی بغل گرم کرتی تھی۔

ایک روز شام کے وقت ایک بہت بڑے زمین دوز چولہے پر لوہے کی کڑاہی چڑھائی گئی جسے دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کیونکہ چند مہینوں کے وقفے کے بعد یہ وہ شام ہوتی تھی جب بڑی سردارنی کڑاہی میں ریت گرم کر کے اس میں مکّی، چنا اور چاول بھونتیں۔ گڑ ملا کر ان کے مرونڈے تیار کرتیں اور سب کو مٹھی بھر کر کھلاتیں۔ چنانچہ جب کارخانے کے اندر تیشہ چلاتے ہوئے بلج سنگھ کو بوگے نے خبر سنائی کہ آج صحن میں کڑاہی چڑھائی گئی ہے اور بڑی سردارنی کے کیا تیور ہیں تو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ تیشہ ویشہ پھینک فوراً باہر نکلا اور دیکھا کہ بوگے نے جو زیادہ تر جھوٹ بولا کرتا تھا۔ اب کے جھوٹ نہیں کہا تھا۔

بڑی سردارنی نے جب بلج کو دیکھا تو اس انداز سے مسکرائی کہ جیسے اسے پہلے ہی یقین تھا کہ بلج آج سب کام چھوڑ چھاڑ کر فوراً باہر آئے گا۔ آج سردارنی نے جامنی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا یوں تو اسے کوئی بھی رنگ نہیں پھبتا تھا لیکن جامنی رنگ تو بہت ہی بھونڈا لگ رہا تھا۔ اس رنگ کے تلے اس کے پیلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی جا رہی تھی۔ آج جیسے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ بانکی انداز سے ٹھمک کر باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ رفتہ رفتہ سب قسم کے دانے بھونے جا چکے تو پھر نکّی کی مدد سے بڑی سردارنی نے سوندھے سوندھے بھنے ہوئے دانوں کو گڑ میں ملا کر الگ الگ قسم کے مرونڈے تیار کیے۔

چرن منٹ منٹ کی خبر پریس میں پہنچا رہا تھا۔ کارخانے کے کاریگر چونکہ بادچی خانے کے زیادہ نزدیک تھے، اس لئے وہ کام میں من لگا ہی نہیں سکے۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کہ کب سردارنی اپنی لوچدار آواز میں انہیں کھانے کی دعوت دے اور کب وہ بل پڑیں میٹھے مرونڈوں پر۔

سب سے پہلے سردارنی نے گنگی کو آواز دی۔ اب اسے گنگی پہ پیار سا آنے لگا تھا۔ گنگی دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے اور منہ بازوؤں میں چھپائے کھانس رہی تھی۔ کھانس چکی تو حسب عادت اس نے سر کو پیچھے کی جانب پھینک کر سر کو دائیں بائیں دو چار جھٹکے دیئے اور پھر ہنسنے لگی۔ . . . اس کی ہنسی خوب فراخ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر عجیب کیفیت طاری رہتی تھی۔ اب اس پر پہلے والے تعلیف ردعمل نہیں ہوتے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خود اپنے لئے ہنس رہی ہے . . . . . .

اسی طرح کھلکھلا کر ہنستی ہوئی وہ آگے بڑھی اور اس نے دونوں ہاتھ ایسے پھیلائے جیسے اسے شریا گوردوارے سے پرشاد مل رہا ہو۔

بڑی سردارنی نے سب کو نام لے لے کر بلایا۔ دسے پنگیا، دسے چرن، ٹی سانو لیئے نی پڑھو . . . . . ”آج اپنے مجوب اسٹول پر ٹنگا ہو تھا۔

اسے نہیں بلایا گیا۔

نہیں اسے نام لے کر نہیں بلایا گیا۔ بلکہ سب کی نظریں بچا کر سردارنی جی نے بھی ابروؤں آنکھوں اور سر کے اشاروں سے بلا تو لیا۔ مگر یا اس کے لئے مخصوص بیٹا! بھیجے جا رہے تھے۔ آج بھی ایک کا ٹیاں تھا۔ آج بھی حیران کی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کسی روز سردارنی لبنگیر ہو جائے۔ کچھ دن تک سردارنی کی حرکات سے محظوظ ہونے

کے بعد وہ تلاتج ٹھ یا اسٹول سے اترا اور دوسری طرف جہاں وہ سردارنی کے قریب
پہنچا۔ مرونڈے پیتے وقت اس نے سردارنی کی پسلیوں میں کہنی کا ایک ٹھوکا بھی دیا کیونکہ
... اب اتنا حق تو ضرور تھا سردارنی کا اس پر۔

بونگا آج بہت لاڈ میں آیا ہوا تھا۔ باج کے پاس بیٹھنے کے بجائے وہ چھوٹی سردارنی
کے قریب جا بیٹھا اور بندر کی طرح بڑے بیلے لقمے کے ساتھ منہ آگے کو بڑھا کر اور چپ
چپا چپ کی آوازیں نکالتا ہوا مرونڈے چبانے لگا۔ اسی وقت نکی کو قریب سے
خاص انداز میں اٹھتے اور ذرا غیر قدرتی انداز میں چلتے دیکھ کر بونگے نے چھوٹی سردارنی
سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑی بیباکی سے کہا۔

"اوجی! نکی کا پاؤں تو بھاری دکھائی دیتا ہے۔"

باج نے بھی یہ بات سن لی۔ اس نے غور سے دیکھا تو اسے بھی یقین سا ہونے لگا
اس نے سوچا۔ آخر بات کیا ہے۔ آج بونگا سچ ہی بولے جا رہا ہے۔

۶

رفتہ رفتہ نکی کا پاؤں دن بدن زیادہ بھاری ہو گیا تو حویلی میں کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں
اور پھر دفعتہً نکی غائب ہو گئی۔ پہلے تو یہ افواہ اڑی کہ وہ جھلی گگڑ کے ساتھ غائب ہوئی
لیکن جھلی گگڑ حسب معمول کام پر آتا رہا۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ جس روز نکی غائب ہوئی تو اس کے گھر والوں نے پریشانی
کا اظہار بالکل نہیں کیا۔ تیسرے دن ملکی نے دبی زبان سے اعتراف کیا کہ موسی گاؤں سے
آئی تھی۔ وہ اسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ موسی کب آئی تھی؟ بس وہ آئی اور چلی گئی لیکن نکی
نے کبھی کہیں جانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔۔۔ ان سب سوالوں کا ٹال مٹول کے سوا

کوئی جواب نہیں تھا۔۔۔ اگر کوئی اور زیادہ کرید کرید کر پوچھتا تو پگلی کو کھانسی چھڑ جاتی۔ وہ کھانستے کھانستے بے حال ہوتی۔ یہاں تک کہ بات آئی گئی ہو جاتی۔

ماہ اکتوبر ختم ہونے کو تھا لیکن اگست سے جو فسادات شروع ہوئے تھے ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔

حویلی کے طویل و عریض صحن کے اردگرد متعدد کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بہت سے کاریگر شہر کے خطرناک حصوں سے نکل کر عبدالحئی کے عارضی طور پر وہاں مقیم تھے۔ چنانچہ رات کو کھانے میں کافی وقت ہو جاتی۔ کھانے سے فارغ ہو کر کاریگر دیر تک آپس میں گپ شپ ہانکتے اور مغربی پنجاب میں جو مظالم ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے جا رہے تھے۔ ان کی دل کھول کر مذمت کرتے۔

ایسی ہی ایک رات تھی۔

کھانا کھانے کے بعد کاریگروں کا ایک گروہ کمرے میں گپ شپ میں مصروف تھا۔ ٹھنڈی ہوا اندر آنے لگی تھی۔ اسی لئے اندر سے کنڈی چڑھا دی گئی تھی جبکہ بوجھا سلگتے ہوئے اُپلوں کی دو تین انگیٹھیاں رانوں میں دبائے بیٹھا تھا۔ کسی نے آوازہ کسا!

"ابے بُڈھے ابھی جوانی ہے سالے، انگیٹھی رانوں میں دابے ہے"۔

بیچارا جن انگیٹھیوں کی گرمی تھی ان میں سے ایک کی ساری بجھ گئی اور دوسری کا شب ......

۔۔ل بھائی ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ۔۔۔ کو گئے ہوئے

ابے مولا۔ چار ابھی بات ۔۔۔ [illegible]

۔۔۔ قریب والے گاؤں میں رہتا ہے

"کیا اُن کی کوئی کھبر ملی؟" ایک ود سنے دلچسپی لی۔

"ہاں۔"

"کیا؟"

"اس نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی تھی۔"

"ہرے رام!!"

"اس نے جیہ بھی بتایا کہ اس کے بچہ ہونے والا تھا۔"

"ہوں۔۔۔ او۔۔۔ پھر؟"

"اس نے بتایا جیاوہ کھبر نہیں۔ سُنا تھا کہ لڑکی بچ جائے گی۔"

باج نے رائے دی "میرے کھیال میں تو دیوی داس نے اس کی حالت دیکھ کر گاؤں بھیج دیا ہوگا تاکہ وہیں کہیں بچے سے جان چھڑا کر لوٹ آئے گی تو جلدی سے شادی کر دی جائے گی اس کی۔"

اس افسوسناک واقعہ کا سب کے دلوں پر اثر ہوا اور ہنستی بولتی محفل پر خاموشی طاری ہو گئی۔۔۔ اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز آئی۔

"کون؟" باج نے دریافت کیا۔ لیکن جواب میں پھر مسلسل دستک کی ہلکی ہلکی آوازیں آتی رہیں۔

سب کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ باج اپنی جگہ سے اٹھا جبکہ اس کے دل میں کھُد بُد کھُد بُد ہو رہی تھی کہ کہیں پھر سردارنی نے موقعہ پا کر اس سے جرمانہ کر دی ہو شاید۔

باج نے کنڈی کھول دی۔

باہر سے دروازے کو بہت آہستہ آہستہ دھکیلا گیا۔

چراغ کی تھرتھراتی ہوئی لو کی مدھم روشنی میں ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔

سانولی!!

باج دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

حاضرین میں سے سب کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ سانولی کو دیکھ کر قریب تھا کہ ان کے منہ سے بے اختیار مختلف آوازیں نکل جائیں۔ لیکن باج کے اشارے پر وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

سانولی اور آگے بڑھی۔ اس کا گول گول چہرہ، نوخیز جوانی کی حدت سے تمتائے ہوئے چہرے کی جلد، قدرے موٹے اور بھرپور ہونٹ۔ چکنے گال .... ان سب چیزوں کے حُسن کو پہلے کبھی کسی نے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔ ان سب دلربا خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر شیرخوار بچے کا سا بھولپن ہویدا تھا۔

لیکن اتنی گئی رات کو وہ وہاں کیا کرنے آئی تھی؟

سانولی نے ہاتھ پھیلا کر اس اونچی اور بھاری بھرکم میز کا سہارا لیا۔ جس پر باج فرنیچر بناتے وقت مختلف حصوں پر رندہ کیا کرتا تھا۔ لڑکی نے منہ کھولا اور سرگوشی میں بولی: "باج چاچا!"

"ہاں" باج نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

سانولی نے گردن ادھر اُدھر گھما کر کوئی اور آواز سننے کی ناکام کوشش کی

اس وقت اس کے نیم وا منہ کے اندر دانتوں کی قطار کے پیچھے اس کی جیبھ چھوٹی سی مچھلی کی طرح متحرک تھی۔ پھر اس نے رازدارانہ لہجے میں دریافت کیا

"تم اکیلے ہو؟"

یہ سن کر سب نے گردنیں آگے کو بڑھائیں۔ اُن کی آنکھیں پھیل گئیں۔

باج نے آواز کا لہجہ بدلے بغیر جواب دیا۔

"ہاں سانولی! میں اکیلا ہوں۔"

"کہاں ہو؟" یہ کہہ کر وہ بازو پھیلا کر ہاتھ ہلاتی ہوئی آگے بڑھی۔ پھر اس نے اسے چھو لیا۔

"یہ رہے تم!" وہ اسے چھو کر بہت خوش ہوئی۔

"سانولی! تم اس بخت یہاں کیوں آئی ہو؟"

"کیوں اس وخت کیا ہے؟"

"اس بخت رات ہے تم . . . تم جوان ہو . . . [illegible]"

"میرے لئے رات اور دن ایک برابر ہیں۔"

"لیکن اس بخت رات کے گیارہ بج چکے ہیں . . . اور پھر تم اکیلی ہو۔"

یہ سن کر سانولی کے صاف ستھرے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے وہ حیران ہو کر بولی۔

"پر باج چاچا! بھلا تمہارے پاس آنے میں کیا برائی ہو سکتی ہے۔ تم تو دیوتا ہو......"

باج ٹھٹک کر پیچھے ہٹا۔

"تم نہیں جانتے چاچا!" سانولی نے کہنا شروع کیا۔ "تمہاری دنیا اور ہے، دوسرے دھندوں کی دنیا اور۔ چاچا تم کتنے اچھے کتنے مہربان ہو۔ جب میں تمہاری آواز سنتی ہوں تو گھنٹوں اس کی مٹھاس اور پیار کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ جب کبھی لالہ (باپ) مجھے کوستے ہوتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ کوئی بات نہیں میرا باج چاچا جو ہے۔ وہ مجھے لالہ سے کم پیار تو نہیں کرتا .... ٹھیک ہے نا؟"

اس دوران میں باج مونچھ کا ایک سرا انگلیوں میں جھٹکتے جاتا رہا۔ اس کی بات ختم ہو جانے پر اس نے "ہوں" کیا اور پھر اس کے بدنما چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اپنا کھردرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر بولا "ہاں سانولی! یہ سچ ہے .... لیکن .... اس بخت تم جاؤ۔"

"نہیں، نہیں چاچا میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں۔"

"اچھی لڑکی بنو سانولی! اس ٹیم جاؤ۔ کل کریں گے باتیں ...."

"او نہیں چاچا، کل تک صبر ہو سکتا تو میں بستر سے اٹھ کر کیوں آتی؟"

سب دم بخود۔

کارخانے کے کمرے میں ایک بار پھر سانولی کی آواز گھنٹی کی طرح گونج اٹھی۔ "باج چاچا! تم سمجھتے نہیں۔ میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں۔ اس بخت یہاں کوئی نہیں۔ جبھی تو میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا باتیں کرنا چاہتی ہو؟"

"باج چاچا!" اب سانولی کی آواز بدل گئی۔ اس نے توقف کیا اور پھر بولی۔ "باج چاچا! . . . کلدیپ بابو بہت اچھے ہیں۔ . . . وہ کہتے تھے کہ تیری آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ میں جنم کی اندھی نہیں ہوں نا! اس لیے . . . اور . . . وہ . . . کہتے تھے کہ تم سے بیاہ . . . بیاہ کروں گا۔"

اس پر باج نے اپنی داڑھی کو مضبوطی سے مٹھی میں پکڑ لیا۔

"کون کلدیپ؟"

"وہ جو نئے آئے تھے . . . وہی نا!"

"کیا کہتا تھا وہ . . ."

"وہ کہتے تھے۔ سانولی! تم مجھے بڑی پیاری لگتی ہو۔ میں کہتی ہیں اندھی ہوں، بھلا اندھی لڑکیاں بھی کسی کو پیاری لگتی ہیں۔ وہ کہتے باؤلی! پیار کیا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے۔ میں تب ہی پیار کرتا ہوں اور پھر تم جنم کی اندھی نہیں ہو۔ تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔ تم دیکھنے لگو گی . . . پھر چاچا! ان کو گئے چند ہی دن ہو چکے ہیں۔ لوٹ کے نہیں آئے . . . اور . . . اور . . ."

یہ کہتے کہتے سانولی نے اپنی بے نور آنکھوں کو اور پھیلایا جیسے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر جھینپ کر بولی۔" . . . اور میرا پاؤں بھی بھاری ہو چکا . . ."

باج نے [illegible] اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

سانولی کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی اور بغیر جوش و خروش کے ذرا غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری کر دیا: آج بستر پر لیٹے لیٹے میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ نہ آئے تو .....؟ ـــ لالہ بہت دُکھی ہے۔ وہ کہتا ہے گھٹی اور ٹکی دونوں کھراب ہیں۔ ایک کو ایسا روگ لگ گیا ہے جس سے بچنا محال ہے۔ دوسری کا پاؤں ...... سچ باتج چاچا۔ لالہ بے حد دُکھی ہے۔ وہ رات رات بھر روتا رہتا ہے ..... وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ مجھے گلے سے لگا کر کہتا ہے۔ یہ میری رانی بٹیا ہے۔ اسے باپ چھوڑ کر بھی نہیں گیا ..... لیکن اسے نہیں ملوم کہ میرا پاؤں بھی .... میں سوچتی ہوں کہ اگر کلدیپ بابو نہ آئے تو .... لالہ کو ملوم ہو جائے گا وہ مر جائے گا۔ ایک دم مر جائے گا ..... یہ سوچتے سوچتے مجھے رونا آ گیا۔ مجھے کچھ نہیں سوجھا تو جی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے تمہارے پاس چلی آئی ..... لیکن وہ ضرور آئیں گے ..... ہیں نا! چاچا! وہ آئیں گے نا؟

سب لوگ دم سادھے بیٹھے رہے۔

باتج نے ایک بار پھر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "ہاں، سانولی! کلدیپ آئے گا ..... وہ ضرور آئے گا ....."

تب تھرائی ہوئی مدھم روشنی میں باتج نے دیکھا کہ سانولی کی

آنکھوں کے گوشوں میں آنسو ڈبک رہے ہیں . . . .

"اور اب سانولی تمھیں واپس جانا چاہیئے۔"

یہ کہہ کر باج نے دروازہ آہستہ سے کھولا اور سانولی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اسے آگے بڑھایا۔ وہ قدم بقدم چلنے لگی۔

باج دروازے پر ہی رُک گیا۔ وہ سانولی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہر چہار جانب خاموشی کی حکومت تھی ستاروں کی مدھم روشنی میں سانولی ایک سائے کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے لیئے اندھیرا اُجالا ایک برابر تھا۔ وہ بلا کسی ہچکچاہٹ کے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

باورچی خانے کے کونے سے گزر کر حویلی کی پُر شکوہ لیکن سیاہ دیوار کے سیاہ تر سائے تلے سے ہوتی ہوئی جب وہ بڑے پھاٹک پر بنی ہوئی اس اونچی محراب کے تلے پہنچی، جس کے نیچے سے تین ہاتھی اوپر تلے آسانی سے گزر سکتے تھے تو باج کو میلے کچیلے کپڑے پہنے وہ اکہرے بدن کی ہلکی پھلکی اندھی لڑکی بہت کمزور، بے حقیقت اور بے دست و پا دکھائی دی۔ جیسے وہ کوئی رینگتا ہوا حقیر کیڑا ہو۔

باج وہیں پر کھڑا رہا۔ اس نے آسمان کی وسعتوں، حویلی کی بلند و بالا دیواروں، بے جان عمارتوں کے سلسلوں اور پھر اس طویل و عریض دالان پہ نگاہ دوڑائی جس کی فضا میں کئی کچے کنوارے قہقہے گونجتے گونجتے دفعتہ دردناک چیخوں میں تبدیل ہو گئے تھے . . . . .

رات، کوئی رات اس قدر کالی اس کے دیکھنے میں پہلے کبھی نہیں

آئی تھی . . . . اور تارے خُون کے چھینٹوں کے مانند دکھائی دے رہے تھے۔

۱۰

جُوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے۔ تُوں توں سانولی کے راندال کاریگروں، خصوصاً باج کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سانولی اپنی بہنوں کی طرح برباد ہو۔ نل کے پاس یا دروازے کی سیڑھیوں پر، یا اونچی محراب تلے بیٹھی ہوئی اندھی سانولی کی حالت انہیں بڑی قابل رحم دکھائی دیتی تھی۔ آتے جاتے جب بھی ان کی اُس سے مڈبھیڑ ہوتی تو سانولی نے کبھی ان سے — یا باج سے دوبارہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

بیس دن اور بیت گئے۔

پنجاب برباد ہو رہا تھا۔ وارث شاہ کا پنجاب۔ گندم کے سنہرے خوشوں والا پنجاب، شہد بھرے گیتوں والا پنجاب، ہیر کا پنجاب، کونجوں اور رہٹوں والا پنجاب!! اور اس کی ایک بے نُور آنکھوں والی الھڑ بیٹی بھی برباد ہو رہی تھی۔

ایک رات جبکہ سب کاریگر کھانے والے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول کارخانے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو قدرتی طور پر سانولی کا ذکر چھڑ گیا۔ ان سب کی دلی تمنا یہی تھی، کہ کاش! سانولی کا اپنی بہنوں کا

حال نہ ہو۔ لیکن وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ ناممکن ہے اور یہ سوچنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

باج کھلے دروازے میں کھڑا کالے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بونگے کو سردی محسوس ہوئی تو اس نے چلا کر کہا: "او تئے مٹوں دیا منزاڑا دروا جا بند کر دے، سالے تو تو سانڈ ہو رہا ہے بھول کر ہم گریبوں کا تو کھیال کر۔"

اور کوئی موقعہ ہوتا تو باج بونگے کی گالی کے جواب میں کوئی نئی اور بھاری بھرکم گالی کی اختراع کرتا۔ لیکن اس وقت اس نے چپکے سے دروازہ بھیڑ دیا اور خود بڑی میز پر ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔

سب اسے ہنسنے بولنے کے لئے اکساتے رہے لیکن جب اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تو انہوں نے بڑے اصرار سے پوچھا: "ہئی باج! آج کیا بات ہے؟"

"میں سوچ رہیا ہوں۔"

بونگے نے سردی لگنے کے باوجود اٹھ کر جھٹ سے کبڈی کھیلنے والے کھلاڑی کا سا پوز بنایا اور قریب آ کر بولا "سچے پادشا ہو! کیا سوچ رہے ہو؟"

باج نے اس کی جانب فلسفیانہ انداز سے دیکھا تو اسے ہنسی آ گئی۔ لیکن باج کے تیور ویسے کے ویسے رہے۔

بونگے کو تمسخرانہ انداز سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے باج نے کلّے

کے اندر زبان گھمائی اور پھر سر کو حرکت دے کر اس نے بونگے اور دیگر ساتھیوں پر چھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کہا:

"میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟" سب کو اس کا فلسفیانہ موڈ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی جسے وہ بمشکل روکے ہوئے تھے۔

باج نے سر کو یوں جھٹکا دیا جیسے وہ بہت بھاری جہاندیدہ بزرگ ہو اور پھر میز کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر بولا:

"پنجاب میں کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ ایسا خون خرابا نہ دیکھا نہ سنا ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک۔"

"... اور پھر ہندو اور سکھ عورتوں کی جو بے عزتی (بے حرمتی) پنجاب میں مسلمان کر رہے ہیں۔ وہ سب تم کو معلوم ہے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک۔" نمبر نے ذرا جوش میں آ کر جواب دیا۔

اب کچھ دیر تامل کرنے کے بعد باج دھیرے دھیرے سپاہیانہ انداز میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا:

"پر ۔۔۔ میں سوچتا ہوں کہ مسلمان ستے ہیں آ کر جو بیاکوبھی (بیوقوفی) کر رہے ہیں، وہی بیاکوبھی ہم چنگے بھلے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ بتاؤ مسلمانوں کو دوش دینے سے پہلے ہمیں تھوڑی تو شرم محسوس نہیں ہونی چاہئے۔"

محفل پر سناٹا چھا گیا۔

ننھے سے چراغ کی پتلی سی تھرتھراتی لَو کی روشنی میں باج نے اپنی موٹی اور لمبی انگلی اٹھاتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا:

"۔۔۔ ایسے ہی پاکستان میں گھگی، بگی اور سانولی کی ہزاروں لاکھوں بہنیں ہوں گی۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یا وہ کس عجّت (عزّت) کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کیوں ایک دوسرے کو جانگلی کہتے ہیں؟"

اتنے میں دروازہ بڑے دھماکے کے ساتھ کھلا۔ سب نے ادھر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ سانولی دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی ہے۔ اس کے روکھے سوکھے بال روئی کی طرح دُھنے ہوئے ہیں۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے ہیں اس کے اعضا میں لرزش ہے۔ پیشتر اس کے کہ کوئی بولتا، وہ زور سے چلّائی:

"باج چاچا! باج چاچا!"

زندگی میں پہلی بار باج کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔

باج چاچا! باج چاچا!"

سانولی کی آواز فضا میں دوبارہ گونجی۔

"ہاں، ہاں سانولی بول۔ گھبرائی ہوئی کیوں ہے تو، بول۔۔۔"

"وہ آ گئے"

"کون"

"کلدیپ بابو آ گئے"

"آ گیا وہ؟" سب خوشی کے مارے چلّا اُٹھے۔

"اور آتے ہی وہ مجھے ڈاکدار کے پاس لے گئے۔ ڈاکدار نے کہا آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ لیکن علاج بہت دن کرنا پڑے گا۔ ۔ ۔"

باج نے بڑھ کر سانولی کے دونوں کمزور کندھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اسے ہلا کر بولا:

"سچ، کب؟"

"ہاں سچ۔ اُن کی ماتا جی بھی ساتھ آئی ہیں۔"

"اری تو وہ اتنے دِن کہاں گیب رہا؟"

"انہوں نے مجھے بتایا کہ پہلے اُن کی بات کوئی نہیں مانتا تھا۔ انہوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ بڑی مشکلوں سے انہوں نے ان کی بات مان لی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا وکٹ جھگڑا ہوا کہ میں کھت بھی نہ لکھ سکا۔ لکھتا بھی تو کیا لکھتا۔ ۔ ۔"

"اوہو ہو ہو" سب بے اختیار ہنسے۔

سانولی نے جھوم کر کہا

"وہ میری منّتیں کرنے لگے، کہنے لگے، سانولی مجھے ماپھ کر دو۔ ۔ ۔ اگر تمہیں کوئی دکھ پہنچا ہو۔ ہم کوئی امیر نہیں ہیں، لیکن سب کام ٹھیک ہو جائیں گے۔ ۔ ۔ ہم تمہیں دلّی لے جائیں گے۔ ۔ ۔"

اب سب لوگ سانولی کی طرف بڑھے اور اپنے اپنے انداز اور لہجے میں خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

آخر باآج نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا:

"بھائیو! ٹھہرو، میرے خیال میں اب سانولی کو آرام کرنا چاہیئے اسے رات کے سمے گھر سے باہر نہیں رہنا چاہیئے۔ . . . . سانولی ہم بوہت کشٹ ہیں۔ اب کل باتیں ہوں گی۔ چلو . . . . اب تم جلدی سے گھر جاؤ۔"

سانولی کے ساتھ کسی کا جانا مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ وہ گھر والوں سے چوری آئی تھی۔

سب اسے انتہائی پیار سے کارخانے کے دروازے تک چھوڑنے گئے۔

آٹھ دس منٹ کے بعد جب سارا ٹولہ بازار جانے کا پروگرام بنا کر باہر نکلا تو اونچی محراب تلے سے گزرتے وقت انہیں دیوار کے ساتھ ایک مٹیالا سا بت سا نظر آیا۔

وہ سب رُک گئے۔

باآج نے آگے بڑھ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ سانولی ہے۔

"سانولی! تم ابھی گھر نہیں گئیں؟"

سانولی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

باآج چاچا! نہ جانے میرے دل کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں کہ کیا کروں۔ ذرا دم لینے کے لئے رُک گئی۔ . . . باآج چاچا!

سوچتی ہوں۔ ایسی کھشی کی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن چاچا تمہیں میری بات پر اکین ہے نا؟"

باج نے گھوم کر اپنے ساتھیوں کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھا سب چپ تھے۔ وہ بھی چپ رہ گیا۔

سب کو خاموش پاکر ساتولی نے اپنا سوال دہرایا۔ "آپ سب کو اکین نہیں آتا؟"

باج کی آنکھوں کے گوشے پُرآب ہو گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ساتولی کے سر پر رکھ دیا اور پھر دھیمی آواز میں بولا۔

"ہمیں اکین ہے —— اور دیکھو تمہیں بے بخت گھر سے باہر نہیں رکنا چاہیئے اور پھر سردی پڑنے لگی ہے۔ کہیں تم بیمار نہ ہو جاؤ۔"

ساتولی نے اس کی مضبوط کلائی کو اپنی کمزور انگلیوں سے چھو کر پوچھا "پر باج چاچا آپ سب لوگ بے دخت کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم؟" باج نے پدرانہ پیار سے لرزتے ہوئے اس کے گال کو چھوتے ہوئے جواب دیا۔..... "ساتولی بیٹی! ہم اس کھوشی میں رٹی کھانے جا رہے ہیں۔"

ایک عام خیال ہے کہ بلونت سنگھ کا نام ذہن میں آتے ہی پنجاب کے دیہات، گاؤں کا ماحول اور اس ماحول کی جزئیات نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں اور پڑھنے والا اپنے آپ کو اس ماحول کا ایک جزو سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بلونت سنگھ کسی مخصوص فضا کا انسان نہیں بلکہ کہانی کا بندہ ہے۔ اس کی کہانیاں ایسے کوزے ہیں جو وہ بڑی چابکدستی کے ساتھ تیار کر کے بڑے پریم سے سجاتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ کسی جگہ کی مٹی زیادہ چکنی اور رنگدار ہوتی ہے اور اس کا کوزہ خوبصورت دکھائی دیتا ہے اور کسی علاقے کی بھری بھری اور میرا ہونے کی وجہ سے آبخورہ کھردرا اور بے رنگ رہ جاتا ہے۔ لیکن بلونت کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ مال اچھا نہ ہونے کے باوصف وہ خوبصورت اور توجہ طلب چیزیں بناتا ہے اور اپنے سامنے طلبگاروں کے ڈیرے رکھتا ہے۔ آپ بلونت سنگھ کے شہری فضا کے افسانے پڑھ کر خود اندازہ لگا لیجیے۔ ان میں آپ کو اس داستان گو کا تخلیقی کمال اپنے نقطہ عروج پر نظر آئے گا چاہے شہر کے بند راستے اور اندھی گلیاں آپ کو گھیرتی اور گھبراتی ہی کیوں نہ جائیں۔

بلونت سنگھ اردو ادب کا وہ جن ہے جو رنگا رنگ قلعے، محل ماڑیاں، فصلیں اور باغ بہاریں پیدا کرنے کے بعد واپس اپنی بوتل میں چلا گیا ہے ـــــــ افسوس!

اشفاق احمد